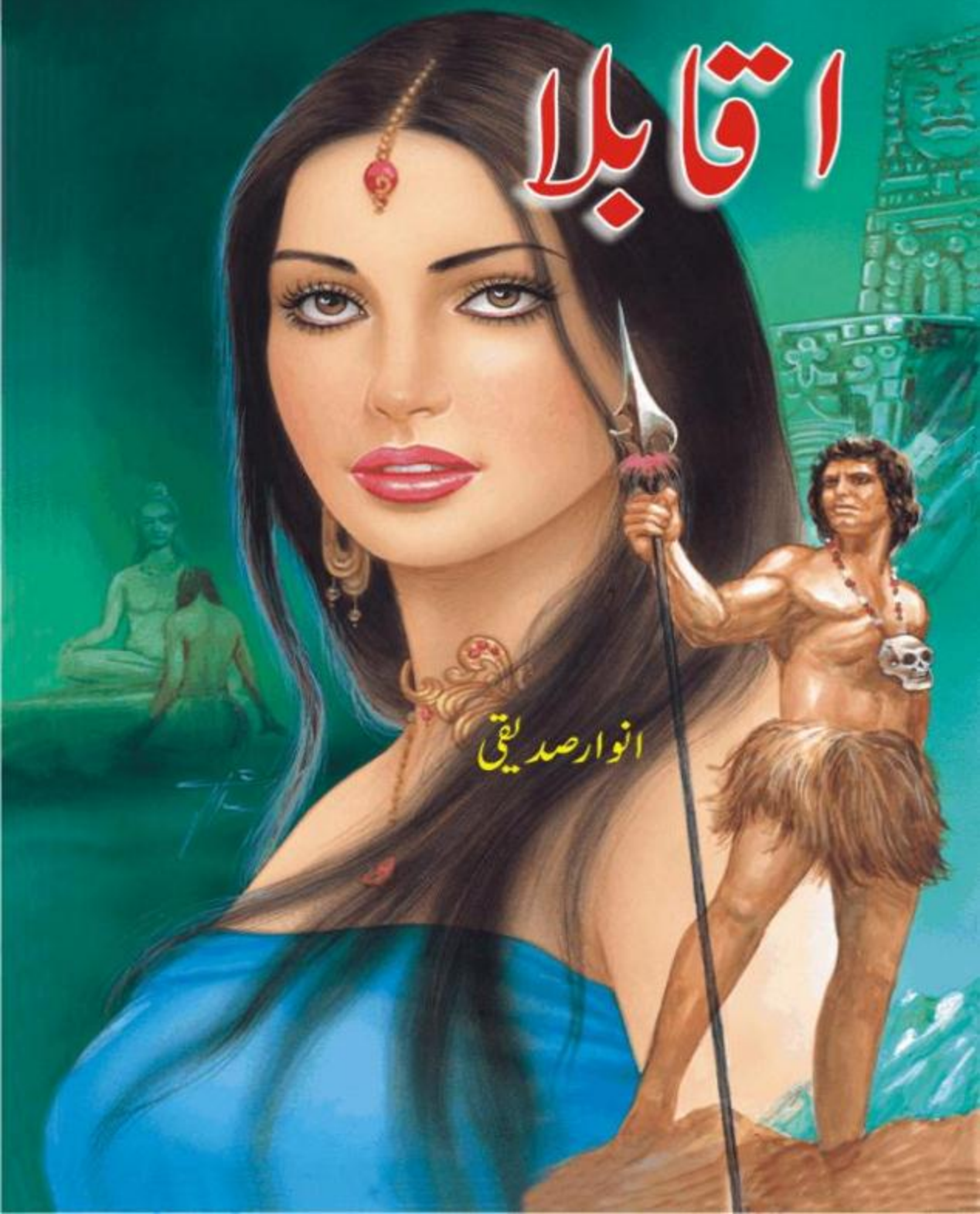


اقابلا

انوار صدیقی



اقابلا..... تاریک اور پراسرار بر اعظم افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں آباد، اقبلا دیوی کا پجاری ایک غیر مہذب قبیلہ.....
مہذب دنیا کے چند افراد اس قبیلہ کے جنگل میں جا پھنسے تھے..... انور صدیقی کے جادوں بیاں قلم کا شاہکار ایک طویل اور دلچسپ داستان

اقابلا

مصنف : انور صدیقی

آفتاب پبلی کیشنز

ٹبہ بابا فرید، عقب ضلع کچہری، لاہور

نوٹ:

اس ناول کے جملہ حقوق بحق مصنف (انور صدیقی) اور پبلشرز
(آفتاب پبلی کیشنز) محفوظ ہیں۔ ادارہ نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس
کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے،
جس کیلئے ہم ان کے بے حد ممنون ہیں۔

خامشی!

”انکا“ کے بعد ”اقبالا“ حاضر خدمت ہے۔

”اقبالا“ کا سلسلہ بھی طویل مدت تک ”سب رنگ ڈائجسٹ“ میں جاری رہا۔ ان دنوں قارئین بڑی شدت سے ”اقبالا“ کا انتظار کرتے تھے..... میں ایسے ہی بے شمار کرم فرماؤں سے واقف ہوں جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے اور شب و روز اپنے فرائض منصبی میں مصروف ہونے کے باوجود ”اقبالا“ میں دلچسپی کا وقت نکال لیتے تھے..... کچھ ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو ”اقبالا“ اور ”انکا“ ٹائپ کہانیوں کو سرعام اور برملا ”فضولیات“ اور ”لغو ادب“ کی فہرست میں شمار کرانے میں پیش پیش نظر آتے ہیں لیکن اپنی خلوتوں میں وہ بھی اسی ٹائپ کی کہانیوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ شاید یہ ادب نواز بزرگ ”فکشن“ کو ادب جان کو پڑھتے ہیں لیکن ادب تسلیم کرنے سے یوں کتراتے ہیں کہ کہیں خود ان پر ”بے ادبی“ کا الزام نہ عائد ہو جائے، بہر حال..... خیال اپنا اپنا..... نظر اپنی اپنی.....

”انکا“ کی طرح ”اقبالا“ کو بھی میرے رفیق و محسن جناب غلام کبریا المعروف بیک صاحب کتابی شکل میں پیش کر رہے ہیں.....

”اقبالا“ کی کہانی آپ کے لئے نئی نہیں ہے۔ آپ اسے ”سب رنگ“ کے خوبصورت صفحات پر طویل عرصے تک دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا میرے نزدیک بے سود ہے۔ آپ ایک ذرا اپنی یادداشت کو کریدیں۔ کہانی کا پس منظر اور اس کے کردار از خود واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

کسی کتاب کے شروع میں کچھ نہ کچھ لکھنا چونکہ ایک رسم کی صورت اختیار کر گیا ہے لہذا بیک صاحب کا اصرار ہے کہ میں بھی اس رسم کی ادائیگی سے خود کو بری الذمہ نہ تصور کروں چنانچہ اس رسم کی ادائیگی کو فرض سمجھ کر سبکدوش ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ”انکا“ کے سلسلے میں، میں نے ”شکست“ کے عنوان سے کچھ تعارفی باتیں کی تھیں اور چند تلخ حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش بھی..... لیکن شومی قسمت کہ میری ”شکست“ بھی ہم عصروں کے بار خاطر پر سخت گراں گزری اور انجام کار..... وہ جو تھوڑی سی راہ و رسم تھی وہ بھی جاتی رہی..... لیکن اس بار ڈرتے ڈرتے میں نے ”خامشی“ کو عنوان کیا ہے۔

یوں بھی بولنے سے بات طول پکڑ لیتی ہے..... بات سے بات نکلتی ہے تو پھر وہ چہرے بھی سامنے آ جاتے ہیں جو کبھی بڑے سادہ پُر خلوص اور رنگ رنگ نظر آتے تھے..... ذہن کی بساط پر یادوں کی لہریں ابھر کر ایک دائرہ وسیع کرتی ہیں تو اکثر وہ ماحول بھی یاد آ جاتا ہے جو

آلودگیوں سے پاک ہوا کرتا تھا..... جس میں ہر سمت، ہر رخ پیار ہی پیار تھا..... اپنائیت تھی..... پُر خلوص جذبوں کی فراوانی تھی..... باتوں میں مٹھاس ہوا کرتی تھی..... زباں و دل کے ذائقے یکساں ہوتے تھے..... تضاد برائے نام بھی نہ تھا۔

جو گفتگو ہوتی بر ملا اور کھل کر ہوتی..... دلوں میں کدورتوں کی گنجائش ہی نہ تھی جو رنجش جنم لیتیں..... رشتے بڑے مربوط ہوا کرتے تھے..... ایک دوسرے کے احساسات اور جذبات کو سمجھا جاتا، محسوس کیا جاتا تھا..... انسانی قدروں اور حسب مراتب کو مقدم تصور کیا جاتا تھا..... اور ایسا صرف اس لئے تھا کہ حاشیہ برداروں کو مجال نہ تھی جو مخالفوں کا بیج بوسکیں..... اسے لوگوں کو پذیرائی کبھی نہیں کی جاتی تھی جو آستینوں میں خنجر چھپا کر محفل میں اپنی چرب زبانی سے جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور..... ایسا تو پہلے کبھی نہ ہوا تھا کہ محبتوں اور رفاقتوں کے درمیان دراڑیں پیدا ہو جائیں اور یارانِ طریقت ان شگافوں کو بھرنے کے بجائے اس کے حجم کو اور بڑھانے کی کوشش کریں..... لیکن..... ذرا ٹھہریے.....

کون صحیح ہے اور کون غلط؟..... اس کا فیصلہ کون کرے گا؟..... اس لئے خامشی ہی بہتر ہے.....!!

انوار صدیقی

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود **ADS** کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپ کی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔

کتاب گھر کی پیشکش عرض مکرر۔۔۔ کتاب! گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میری سلسلے وار کہانیاں ”انکا“ ”اقابلا“ ”سونگھاٹ کا پجاری“ اور ”غلام روحمیں“ گزشتہ چوتھائی صدی سے میرے وہ دوست اور احباب ڈائجسٹ کی صورت میں شائع کرتے رہے ہیں جن سے نہ تو کبھی میرا کوئی تحریری یا قانونی معاہدہ ہوا نہ ہی مجھے اس کا کوئی معاوضہ ادا کیا گیا۔ سچ یہ بھی ہے کہ میں نے بھی دیرینہ دوستی اور نصف صدی پر محیط تعلقات کی بنا پر نہ کبھی کسی معاہدے کی ضرورت پر غور کیا، نہ ہی کسی معاوضہ کا تقاضہ کیا۔ البتہ متعدد بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر ان ناولوں کو مجلد کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو میرے پرستار اسے اپنی ذاتی لائبریری کی زینت بنانے میں بھی خوشی محسوس کریں گے۔ لیکن 1980ء سے آج تک میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

بہر حال اب برادر ام آفتاب ہاشمی صاحب میرے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے پر آمادہ ہیں چنانچہ میں پہلی بار باقاعدہ تحریری طور پر موصوف کو ”انکا“ ”اقابلا“ ”سونگھاٹ کا پجاری“ اور ”غلام روحمیں“ کو شائع کرنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ یہ چاروں ناول چونکہ میری خواہش کی تکمیل میں شائع کئے جا رہے ہیں اس لئے میں اس کا کوئی معاوضہ نہیں لے رہا۔ البتہ اب چاروں کتابوں کے جملہ حقوق بحق مصنف رہیں گے۔

اس مختصری تحریر کے بعد میں ان اداروں سے درخواست کروں گا کہ وہ میرے مذکورہ ناول شائع کرنا فی الفور بند کر دیں۔ ان کا یہ عمل بھی میرے لئے قابل تحسین ہوگا۔ اب عمر کی نقدی بھی تیزی سے خرچ ہو رہی ہے اور عارضہ قلب کی بیماری بھی مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کے چکر میں الجھوں ورنہ اشاعت کے سلسلے میں جو کچھ ہوتا رہا اس کا ایک ایک ثبوت میرے پاس محفوظ ہے۔ مجھے اپنے پرستاروں سے بھی یہی امید ہے کہ وہ میرے دوسرے ناولوں کی طرح ”انکا“ ”اقابلا“ ”غلام روحمیں“ اور ”سونگھاٹ کا پجاری“ کو بھی مجلد کتابی شکل میں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اس لئے کہ آج میں جو بھی ہوں اپنے پرستاروں کی پسندیدگی کی وجہ سے ہوں۔

اپنے پرستاروں کی دعاؤں کا طلب

انوار صدیقی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

قریبا کانخبر میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کمرے میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا، جیسے یہ ایک قبر ہو جس کے ہر طرف پتھر کی دیواریں ہوں۔ ابھی ابھی میں نے قریبا کا ہولناک واقعہ دیکھا تھا اور میں نے اس کے اور سانپ کے خون سے تیار کیا ہوا دیوتاؤں کا عظیم جام نوش کیا تھا۔ کاہوا اپنے دونوں ہاتھ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں فرش پر مار رہا تھا۔ اس کی خرخراہٹ بھرے ہوئے شیر کی دھاڑ سے مشابہ تھی۔ میرے کانوں میں اس کی اشتعال انگیز چیخوں سے اس قدر دباؤ پڑ رہا تھا کہ مجھے اپنا ذہن ماؤف معلوم ہونے لگا۔ ایسی صورت میں کوئی مناسب اور نتیجہ خیز فیصلہ کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا لیکن اسے سامنے دیکھ کر میرا خون تیزی سے جسم میں گردش کرنے لگا۔ ترام کی پراسرار موت کے بعد یہ میرا مفتی بندر جو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا، جزیرہ توری سے اچانک غائب ہو گیا تھا اور سمورال بھی اپنی تمام بزرگی و برتری کے باوجود اسے سزا دینے میں ناکام ہو گیا تھا۔ ترام کی موت کا معما ابھی تک میرے لیے پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ ترام کی اذیت ناک موت کے ساتھ مجھے اپنے بوڑھے ہندی دوست سرنگا کی بات یاد آئی۔ جس نے کاہو کے سلسلے میں مجھے ہوشیار رہنے کی نصیحت کی تھی، مگر اس سے پہلے کہ میں ابالیش کی طرح اسے بھی ٹھکانے لگاتا۔ وہ میری جھونپڑی اور میری رفاقت چھوڑ چکا تھا۔ اب وہ پھر انتہائی خون خوار نظروں کے ساتھ میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے بے اختیار خنجر تانا اور نشانہ باندھ کر پوری قوت سے کاہو کی طرف پھینکا لیکن اس کی حیرت انگیز پھرتی اور مستعدی سے میرا نشانہ خطا ہو گیا۔ خنجر اندھیرے میں کہیں دور جا گرا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا لیکن وہ ادھر سے ادھر کھسک گیا۔ دیوتاؤں کا جام خاص حلق میں اٹھیلنے کے بعد مجھ پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ کاہو بار بار اُس طرف آجاتا تھا، جہاں میرے ہاتھ سے مشروب کا طشت گرا تھا میں خنجر دوبارہ اپنے قابو میں کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کاہو کی چیخیں بلند ہو گئی تھیں اور وہ وحشت ناک انداز میں قلابازیاں کھا رہا تھا۔ پھر اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ بلند ہوئی اور وہ زمین پر لوٹنے لگا۔ وہ کرب کی کیفیتوں سے دوچار تھا۔ میری زبان لڑکھڑی رہی تھی۔ میں نے اسے لرزتی آواز میں مخاطب کیا۔ ”کاہو! میں تیرے انتظار میں تھا ہندو نصیب چوپائے..... میں اب تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ تو ترام کا قاتل ہے۔ تو نے میری اجازت کے بغیر میری رفاقت چھوڑی۔ تو نے میرے ساتھ دعا کی۔ مقدس اقبال کی قسم! تو میرے عتاب میں آچکا ہے۔“

کاہو نے لوٹنے لوٹنے اچانک پھرتی سے جست لگائی اور ایک ہی جھٹکے میں وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ خنجر میرے ہاتھ سے جھپٹ لے گیا۔ اس کی پھرتی اور دفاعی انداز سے میری عقل کوئی فیصلہ کرنے سے جھجک رہی تھی۔ اس کی خون خوار نظروں میں اب خوف نمایاں تھا اور اس وقت تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ میرے پیروں میں لوٹنے لگا۔ وہ بار بار نظریں اٹھا کر مجھے دیکھتا، پھر میرے پاؤں چاٹنے لگتا۔ میں چند لمحے اس کے رویے کی تبدیلی اور یہ عجیب و غریب حرکت دیکھتا رہا۔ میں نے شر بار لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”آہ کاہو! میں جانتا ہوں منحوس روح۔ تو میرے قدموں میں کیوں پڑا ہے۔ تو نے سمورال کو مجھ سے دور کر دیا۔ اب تو رحم کا طالب ہے۔ یاد رکھ میں تجھے کسی صورت معاف نہیں کروں گا۔ ترام کی موت کی آگ ابھی تک میرے سینے میں سلگ رہی ہے۔“

”رحم! اے معزز سردار رحم!“ اچانک کاہو کے حلق سے انسانوں جیسی آواز بلند ہوئی۔ ”تم جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ درست ہے لیکن مجھے مجبور

کر دیا گیا تھا..... میں آج بھی مجبور ہوں۔ اگر تم نے رحم کے دروازے بند کر دیئے تو میری روح ہمیشہ تڑپتی رہے گی۔ مجھے اجازت دو اے معزز سردار، کہ میں دیوتاؤں کے اُس جام خاص کے چند قطرے اپنے حلق میں انڈیل لوں جو قریباً نے تمہارے لیے تیار کیا تھا۔ ایک مدت سے میں اس موقع کا منتظر تھا۔ مجھے ترام سے کوئی بغض نہیں تھا لیکن میں مجبور ہو گیا تھا۔“

پہلی بار مجھ پر یہ راز منکشف ہوا تھا کہ کاہونا سنانوں کی طرح بول سکتا ہے۔ ویسے اس کی حیرت انگیز صفات کے متعلق مجھے بہت کچھ علم ہو چکا تھا۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے استعجاب میں ڈوبا دیکھ کر میرے پیر چانتے ہوئے کاہو بڑی لجاجت سے بولا۔ ”فیصلہ کرنے میں دیر نہ کرو۔ یہ لحاظ گزر گئے تو پھر کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں اسی طرح بھٹکتا رہوں گا۔ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے اس مشروب کے چند قطرے چانتے کی اجازت دے دو۔ کاہو جب آزاد ہو جائے گا تو اس احساس کے عوض تمہاری معاونت پر ہمیشہ تیار رہے گا۔ تم کیوں نہیں سمجھتے کہ یہاں ہر چیز برتر احکام کی تابع ہے۔ میں مقدس جارا کا کا کی کھوپڑی کی قسم کھاتا ہوں کہ میں تمہارا وفادار ہوں گا لیکن اپنے حصے میں سے چند قطرے اس آب آزادی کے مجھے عطا کر دو۔“

کاہو کے لہجے میں رقت تھی، وہ بار بار اپنا سر میرے قدموں پر رکھ رہا تھا۔ اب وہ پوری طرح میرے قابو میں تھا۔ میں چاہتا تھا اسے ایک لمحے میں اٹھا کر اس کی گردن مروڑ دیتا۔ میں چاہتا تو خنجر سے اس کا جسم کئی حصوں میں منقسم کر دیتا لیکن اس کے رقت انگیز بیان سے میرا غصہ پگھل گیا اور اس کی جگہ تجسس نے لے لی، آخر کاہو اس مشروب کے چند قطرے چانتے کے لئے کیوں مصر ہے؟ میں نے اُسے مارنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ آخر وہ کیا راز ہے جس نے کاہو کو میرے قدموں پر لوٹنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ مجھے اس سے بہت سی باتیں معلوم کرنی تھیں۔ پھر اس نے جارا کا کا کی مقدس کھوپڑی کی قسم کھا کر میری معاونت کا عہد بھی کیا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر لحوں میں ایک فیصلہ کیا اور کاہو سے سوال کیا۔ ”آخر تمہیں کس نے مجبور کیا تھا؟“

”جابر بن یوسف! جزیرہ توری کے معزز سردار! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں ان طاقتوں کی شناخت کرا سکتا ہوں جو خود پردہ پوشی کی متمنی ہیں۔ تمہیں اس بات سے آگاہ کرنا ہوتا تو اب تک تمہیں معلوم ہو گیا ہوتا۔ مجھ سے ایسی باتیں پوچھنے سے گریز کرو۔ میں تمہیں کچھ بتا نہیں سکوں گا۔“

کاہو نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

”پھر تم مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو کہ میں ترام کا قاتل ہونے کے باوجود تمہیں اس مشروب خاص کے چند قطرے پینے کی اجازت دے دوں گا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”تم نقصان میں نہیں رہو گے۔ وہ مشروب تم نے زمین پر گرا دیا ہے جس میں جزیرہ باگمان کی ایک دوشیزہ کا خون شامل ہے، تمہیں جو کچھ پینا تھا، وہ تمہیں چکے ہو۔ اتنے سنگ دل نہ بنو۔ تم مہذب دنیا کے ایک فرد اور رحم دل شخص ہو۔ میں بڑی امید سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم نے انکار کر دیا تو پھر نہ جانے کب مجھے موقع ملے۔“ کاہو نے لجاجت سے کہا۔

”میرے ہاتھ تمہیں ختم کرنے کے لئے مضطرب ہیں اور تم رحم کی امید رکھتے ہو؟“ میں نے درشتی سے کہا۔

”میں تم سے آخری وقت تک رحم کی درخواست کرتا رہوں گا۔“ کاہو نے میرے قدموں میں اپنا سر رگڑنا شروع کر دیا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھے ترام کی موت کے سلسلے میں کسی سراغ سے آگاہ نہیں کرے گا اس لیے میں نے آئندہ لحوں میں کسی نئے

واقعے کے ظہور کی دلچسپی کے لئے اسے بہ اکراہ مشروب چائے کی اجازت دے دی۔ کاہونے احسان مندانہ نظروں سے میری جانب دیکھا اور اس نے پھرتی سے ایک قلابازی کھائی۔ وہ کچھ دیر تک رقص کے انداز میں دیوانہ وار کمرے میں گھومتا رہا جیسے عمل کسی عبادت کا حصہ ہو، پھر وہ تیزی سے کودتے ہوئے طشت کی جانب بڑھا اور زبان نکال کر بے تابانہ مشروب چائے لگا۔ اس خون خوار بندر کے منہ سے عجیب قسم کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ زمین پر کوئی قطرہ باقی نہیں رہا تو اس نے زمین پر لوٹ لگانا شروع کر دیا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال نے سر اُبھارا کہ کہیں مجھ سے غلطی تو سرزد نہیں ہوگئی؟ وہ جام، جو بطور خاص میرے لیے تیار کیا گیا تھا، اسے میں نے کاہو کو پیش کر کے دیوتاؤں کی حرمت کو کوئی زک تو نہیں پہنچائی، بندرا چھل رہا تھا اور میں اپنی پیش کش پر نادم ہو رہا تھا کہ اچانک میرے سامنے ایک شخص اندھیرے کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ وہ جس طرف سے آیا تھا۔ وہاں کی مشعل دم توڑ چکی تھی اور دوسری مشعلیں روشن تھیں۔

”جز یہ توری کے معزز سردار! کاہو تمہارا احسان مند ہے، اسے اپنے عہد کی زبان یاد ہے۔“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ میری نظروں کے سامنے ایک معمر، دراز ریش جھٹی برہنہ بدن کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریوں سے تجربے نمایاں تھے۔ اس کے انداز میں وقار اور لہجے میں دبذبہ تھا۔ وہ مقامی زبان میں کسی قدر لرزش کے ساتھ مجھ سے مخاطب تھا۔ اس کی نگاہوں میں مقناطیسی کشش اور سنجیدگی موجود تھی۔ وہ کوئی مذہبی پیشوا لگ رہا تھا۔ کہن سالی دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے زمانے دیکھے ہیں۔ وہ کوئی مدبر اور ذہین شخص ہے۔ سوراہ کی طرح اس کے جسم پر بھی درندوں اور پرندوں کی عجیب اشکال مختلف رنگوں سے بنی ہوئی تھیں۔ میں حیرتوں میں غرق تھا کہ اس جھٹی نووارد نے بھاری بھر کم آواز میں کہا۔ ”جابر بن یوسف! تم نے کاہو پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔ ہر چند کاہو تمہارے احسان کا سزاوار نہیں تھا۔ اگر تم مجھے اپنا بچا ہوا مشروب استعمال کرنے کی اجازت نہ دیتے تو میری روح اسی بندر کے جسم میں مقید رہتی ہے جو اس وقت تمہارے سامنے اچھل کود کر رہا ہے۔ میں تمہارے انتظار میں تھا۔ معزز سردار! مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے اجازت دے دو گے؟“

”تمہاری روح!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا تم کوئی روح ہو؟“

”ہاں اب میرا کوئی جسم نہیں یہ جسم جو تمہیں نظر آ رہا ہے، اس کا بوجھ اس زمین پر نہیں ہے۔ اب میں صرف ایک ہیولا ہوں۔ جسم ایک فانی چیز ہے۔ یہ ہیولا تمہاری نظر کا فریب ہے۔“ اس نے پُر اسرار انداز میں کہا۔

”تم ایک روح ہو۔ میں ایک روح سے ہم کلام ہوں۔ میں تمہارا جسم چھو کر اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔“ میں اپنا تجسس چھپانے لگا۔ میں نے جھپٹ کر اسے دبو چنا چاہا۔ میرے ہاتھ خلا میں معلق ہو گئے اور پھر اپنی جگہ واپس آ گئے ہیں۔ اس کا جسم نہیں چھو سکا تھا۔ حیرت سے میں اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

”تم مجھے چھو نہیں سکتے، یہ میری آمادگی پر منحصر ہے۔“ اس نے اداسی سے کہا۔

”مگر تمہیں کس نے مقید کیا؟“ میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”آہ سیدی جابر! یہ ایک طویل داستان ہے۔ مجھے اپنی زبان بند رکھنی ہوگی۔ ہر چند کہ میں ایک روح ہوں اور میرا رشتہ اس جہان سے

منقطع ہو چکا ہے لیکن مقدس اقبال نے آسمانوں میں جانے سے پہلے میری روح مقید کر لی تھی کیوں کہ میں اس کا مستحق تھا۔ میں کسی زمانے میں اس عظیم الشان سلطنت کا ایک برگزیدہ شخص تھا۔ کون تھا جو میرے احکام کے سامنے سرتابی کی جرات کرے۔ میں روحانی علوم کا ماہر، اس پراسرار سرزمین میں مقدس اقبال کے بعد سیاہ و سپید کا مالک تھا۔ میری یہ برتری مجھے میرے منصب سے محروم کر گئی۔ میرا علم مجھے کھا گیا۔ میرا تدبر مجھے چاٹ گیا۔ میں نے جو سوچا تھا وہ غلط سوچا تھا اور میں نے جو کہا تھا وہ غلط کہا تھا۔ آخر مجھے اپنا جسم چھوڑنا پڑا اور یوں میں اپنی روح بھی اس کے جاہ و جلال، اس کے عتاب کی زد سے نہ بچا سکا۔ اس نے مجھے ایک بندر کے جسم میں مقید کر دیا۔“

کاہوا ایک لمحے کو رکا۔ پھر اس نے دوبارہ کہنا شروع کر دیا۔ ”سیدی جاہرا! تم ان ہولناک مصائب کا تصور نہیں کر سکتے جن سے میری روح دوچار رہی ہے۔ میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایک زمانے سے اس کے اور اس سے قریب ہر شخص کے اشاروں پر اپنا سر جھکا رہا ہوں۔ آج میری جدوجہد کی تکمیل ہوئی اور مجھے آزادی نصیب ہوئی۔ جو سزائیں میرے مقوم میں لکھ دی گئی تھیں، میں ان سے گزر چکا ہوں، مجھے معلوم تھا کہ تم میری نجات کا سبب بن سکتے ہو۔ میں جزیرہ باگمان کے اندھیروں میں تمہاری آمد کا منتظر تھا اور وہ میرے پیچھے تھا۔ آخر تم آ گئے اور میری توقع کے مطابق تمہیں دیوتاؤں کا جام پیش کیا گیا۔ میری ذلت اور خواری کے دن گئے۔ میں نے کالا ری جیسے کم تر درجے کے سردار کے ہاں اذیت کے دن گزارے۔ میں ایک حقیر بندر کے ناتواں جسم میں محبوس تھا۔ اقبال کی سلطنت کے ایک بڑے شخص کو مرنے کے بعد بھی سکون نہیں ملا۔ میری کوشش ہوگی اے معزز سردار کہ میں تمہیں بلاؤں سے دور رکھوں۔ تمہیں جس وقت میری ضرورت ہو، مجھے یاد کر لیا کرو۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں اس کے مقدس قوانین آڑے آجائیں گے اور جہاں میں یہ محسوس کروں گا کہ تمہاری اعانت میرے لیے مناسب نہیں ہے اور جہاں مجھ پر پابندی عائد کر دی جائے گی، وہاں میں تمہاری اعانت نہیں کر سکوں گا اور سنو، اگر تم نے میری روح کی آزادی کا ذکر کسی اور سے کیا تو میں کبھی تمہاری مدد کو نہیں آؤں گا۔ پھر تم مجھے کبھی نہ پاسکو گے اور میں ہمیشہ کے لئے زمین کو خیر باد کہہ دوں گا۔“

میں اس کی باتیں تجسس، حیرت اور اشتیاق سے سن رہا تھا اور اس سے بہت کچھ پوچھنے، بہت کچھ جاننے کا خواہش مند تھا لیکن وہ میرے سوالات نظر انداز کر کے اپنی بات کہنے پر ہی اکتفا کرتا تھا میں نے پھر اس سے ترام کی موت کا سبب جاننا چاہا۔ وہ پھر گڑ بڑ کر گیا۔ میں نے اقبال کی شخصیت اس کی سلطنت کے اسرار، کاہن اعظم سمورال اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوال کیے تو اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ مجھے احساس ہوا کہ ایسے سوالات مجھے سرے سے کرنے ہی نہیں چاہئیں۔ اس کی باتوں سے اتنا اندازہ ہوا کہ وہ کسی زمانے میں اقبال کی حکومت کا ایک صاحب اثر شخص تھا جو اپنی طاقت اور اثر کے سحر میں کوئی نادانی کر بیٹھا اور نتیجتاً عتاب کا شکار ہو گیا۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد اس کی روح بھی قید کر لی گئی۔ میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ جزیرہ باگمان میں ایک پراسرار قوت کی اعانت مجھے حاصل ہو گئی۔ حالانکہ مجھے اس سے کوئی زیادہ توقع نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس نے میری مدد کرنے کے لئے اپنی حدود و شرائط کا ذکر تفصیل سے کر دیا تھا۔

”میں صرف ایک چیز پوچھنا چاہتا ہوں معزز کاہن! تم نے اپنے طور پر یہ پیش کش کی ہے کہ تم مصائب میں میرا ساتھ دو گے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ جزیرہ باگمان میں مجھے کسی قسم کے حالات سے سابقہ پڑے گا اور میں کب تک یہاں رہوں گا؟“ میں نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

”تاریک براعظم کے اسرار میری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں یہاں کیوں بھیجا گیا ہے۔ تمہیں اس تربیت گاہ میں جن حالات سے دوچار ہونا ہے، وہ بھی میرے علم میں ہیں لیکن جسے بتانا اسے مقصود نہیں، اُسے میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ اس علاقے کی روچیں اس کی برتری کی قائل ہیں۔ مجھے افسوس ہے میرے محسن کہ میں تمہیں پیش آنے والے واقعات سے باخبر نہیں کر سکتا لیکن ایک مشورہ ضرور دے سکتا ہوں کہ جن اعلیٰ اوصاف سے تم نے اس علاقے میں اپنے لیے کوئی جگہ بنائی ہے، انہیں مت چھوڑنا۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

”میرے ذہن پر دُھند چھائی ہوئی ہے، میں ہر چیز جاننے کا خواہش مند ہوں۔“ میں نے بے چینی سے کہا۔

”دُھند صاف ہو جائے گی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”میں اپنے ہندی دوست سرنگا کے بارے میں اگر کچھ جاننا چاہوں تو.....“ میں نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔

”سرنگا!“ کاہو کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”سرنگا..... وہ ہندی بوڑھا، پر جابر بن یوسف الباقرا اس سرزمین پر صرف مقدس اقبال کی حکمرانی ہے۔ یہاں کسی اور کی برتری کا تصور کرنا جرم ہے، اگر امان چاہتے ہو تو صرف اس کی طرف رخ کرو، اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو سوچنا بند کر دو یہ کیوں ہوتا ہے، تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اسے سمجھنے کے لئے اس کا قرب اور اس کے انصاف و اکرام کا سایہ ہونا ضروری ہے۔“

”کاہو! مجھے اس کا احساس ہے، میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔ اب صرف ایک ہی خواہش ہے کہ.....“ میں نے چھت کی طرف گھورتے ہوئے نشیلے لہجے میں کہا۔ ”اس کا حصول..... بس پھر موت ہی میں پناہ ہے۔“

”جابر بن یوسف! میرے محسن میں جا رہا ہوں، اس سے زیادہ گفتگو میرے لیے مہلک ہوگی۔ میری دعا ہے کہ دیوتا تم سے خوش رہیں۔“ کاہو نے مجھے دعا دی اور مزید کچھ پوچھنے سے پہلے وہ اندھیرے کی اوٹ میں کہیں گم ہو گیا۔ وہ بندر ابھی تک ادھر ادھر دوڑ کر راستہ تلاش کر رہا تھا۔ راستہ بند تھا۔ ہر طرف پتھر کی دیواریں مجھے سخت آزمائش و ابتلا کا خوف دلانے لگی تھیں۔ روز ایک انکشاف ہوتا تھا اور روز اقبال کی طلب کے مقابلے میں مجھے اپنا قدم ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ ہر روز اس کی وسیع و عریض سلطنت کی عظمت و شوکت کا رعب مجھ پر پہلے زیادہ مسلط ہو جاتا تھا۔ جتنا منزل کے قریب جا رہا تھا منزل اتنی ہی دور معلوم ہوتی تھی۔ منزل شوق کا فاصلہ بڑھتا جاتا تھا۔ وہ اور دور ہو جاتی تھی نئے شخص سے ملاقات کے بعد وہ اور مشکل معلوم ہوتی تھی۔ ایک بار میں نے سوچا کہ مجھے اس کی طلب سے دستبردار ہو جانا چاہئے۔ وہاں تک پہنچنے میں میرے بال سفید ہو جائیں گے اور میرے جسم پر کھال لٹکنے لگے گی لیکن اس کی طلب سے دستبردار ہونا میرے امکان میں نہیں تھا۔ اس کا احساس مجھے جوان رکھتا تھا۔ وہ میرا حوصلہ تھی۔ چاروں طرف سے بند اس کمرے میں، مجھے تلخیوں اور اذیتوں کا احساس سوا ہوا لیکن میں نے سوچا، یہ دیواریں گر جائیں گی۔ کوئی آئے نہ آئے ممکن ہے یہیں میری قبر بن جائے۔ اب مجھے صرف اس کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ بندر بار بار میرے خیالوں کی یکسوئی میں حارج ہوتا تھا اور میں اسے ڈانٹ کر خود سے دور کر دیتا تھا۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مشعلوں کی روشنی سے رات ہی رات نظر آتی تھی۔ ایک نہ ختم ہونے والی رات۔ گھڑیاں بیت رہی تھیں۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔ جب میں بیدار ہوا تو کمرے کے ماحول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہی خاموشی ہر سوطاری تھی لیکن وہاں سے قریب کی لاش، سانپ کے ٹکڑے، چوہی میز اور طشت بھی غائب تھا۔ اب صرف میں اور وہ بد قسمت بندر ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ وہ ایک طرف

کونے میں سہا ہوا بیٹھا تھا اور میں ایک طرف بیٹھا، آنے والے لمحات کے انتظار میں آنکھیں کبھی کھولتا، کبھی بند کرتا تھا۔

اس تنہائی کی طوالت دنوں اور گھڑیوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ روشنیوں کے نشیب و فراز وقت کا تعین کرتے ہیں یا پھر انسانوں نے اسے ناپنے کے لئے گھڑیاں ایجاد کر رکھی ہیں۔ اس کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہاں یکساں روشنی تھی مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ کس قدر وقت بیت گیا۔ یہاں کئی دن، میرا خیال ہے، تین چار دن، میری کمر دکھنے لگی اور میرے معدے میں کھولن سی ہونے لگی تھی بندر بھی نیم مردہ ہو چکا تھا۔ بھوک کی شدت سے ہم دونوں شاید ایک دوسرے کی موت کے منتظر تھے۔ نہ پانی تھا اور نہ غذا۔ جتنا وقت گزرتا جا رہا تھا جس میں اٹنٹھن شدید ہوتی جاتی تھی۔ مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ میں نے کاہو کی مدد کر کے دیوتاؤں کی منشا میں مداخلت کی ہے اور مجھے اس زنداں میں اس کی سزا مل رہی ہے۔ میں نے خود پر لعن طعن کی، پتھروں کی دراڑوں میں بار بار اٹھ کر راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں تو ہر طرف پتھر تھے۔ سنگین دیواریں۔ ایک دردناک موت میرے تصور میں گھوم گئی۔ یہیں پڑے پڑے ایک دن میرے اعصاب جواب دے جائیں گے اور میں ہڈیوں کے پنجر کی شکل میں تبدیل ہو جاؤں گا۔ میری بے احتیاطیوں نے آخر مجھے اپنے انجام تک پہنچا دیا۔

مجھے اپنے آپ پر ہنسی آگئی۔ میں کتنا بڑا احمق تھا کہ پے در پے مصائب جھیلنے کے بعد بھی میں نے کچھ حاصل نہیں کیا تھا۔ میں نے کیوں آسان پر پہنچنے کی کوشش کی تھی جب کہ مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ فسوں کار لوگوں کی ہستی ہے۔ یہاں کے انسان مختلف، ان کے رسم و رواج جُدا اور ان کے اطوار سر بستہ اسرار ہیں۔ میں مر رہا ہوں۔ اس انجمنی کا خاتمہ قریب ہے، جس نے اس سرزمین میں صرف اپنی ذہانت اور شجاعت کے بل پر کوئی حیثیت حاصل کی تھی۔ مجھے وہ سب یاد آگئے۔ سرنگا، ترام، سمورال اور جمرال۔ میں کہاں کہاں سے گزر کر اور کن کن لوگوں کو مسخر کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔ اسی لمحے مجھے سرنگا کی دیوی یاد آئی جس نے سریتا کو محفوظ رکھا تھا۔ اپنا دوست سرنگا۔ نہ جانے وہ کس عالم میں ہوگا۔ جمرال آخر شب میرے پاس کیوں آیا تھا؟ اور زارے مجھ سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ اشار۔ وہ لڑکیاں جو میرے اشارے پر جینین جھکا دیتی تھیں۔ مگر اب ان سب کے بارے میں سوچنا بے کار تھا۔ تنہائی میں کوئی کیا کیا سوچ سکتا ہے جو شخص ایسے حالات سے دوچار ہو، اس کی ذہنی پراگندگی کے متعلق کوئی کم مایہ شخص ہی تصور کر سکتا ہے۔ ان پریشان کن خیالوں سے نجات پانے کے لئے صرف ایک ترکیب سمجھ میں آئی، جس سے مجھے ایک عجیب فرحت اور توانائی کا احساس ہوا۔ میں نے سوچا۔ یہاں بہتر یہی ہے کہ اس کا فری یاد میں محور ہا جائے۔ وہ بت طناز، وہ شعلہ بدن، وہ لالہ رخ، وہ آسمانوں کی کوئی حور جب بھی میں نے اسے یاد کیا، میرا ذہن آسودہ ہوا۔ میں اس کے کیا کیا اوصاف بیان کروں۔ میں اسے کن لفظوں سے پکاروں۔ اقبال! حسین اقبال! ماہ جبین اقبال! !!! مجھے ندامت ہوئی کہ میں گستاخی کر رہا ہوں اس کے لئے یہ الفاظ مناسب نہیں۔ اس کے لئے تصور کی بے کراں وسعت شرط ہے۔

اس تصور کے ساتھ میں نے حواس کو بیٹھا۔ وہ بندر میرے قریب آیا اور اس نے میرے قریب خود کو گرادیا۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ میں اب اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی جانب کھینچ لیا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ ہم دونوں پھر غافل ہو گئے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ کتنا وقت گزرا۔ جب پتھروں میں گرج سی پیدا ہوئی تو میں نے فقاہت سے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے کا بالو کھڑا تھا۔

اسے دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ ایک بے بس انسان کے ساتھ یہ کیسا دلچسپ مذاق ہو رہا تھا۔ کابلو کے انداز سے بے نیازی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ میری ابتر حالت سے قطعی متاثر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ”کیا موت کا حکم سنانے آئے ہو؟“ میں نے طنزاً کہا۔

”مجھے نہیں معلوم، ممکن ہے وہ تمہارے لیے موت کا فیصلہ کر دے یہ اس کے اختیار میں ہے۔ یہاں کی ہر چیز اس کے اختیار میں ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کے پاس چلے چلوں۔“ کابلو نے بیزاری سے کہا۔

میں نے اپنا منتشر جسم اکٹھا کیا اور اپنے رفیق بندر کو گود میں اٹھائے خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا۔ اس مرتبہ بھی کابلو نے ایک عمل سے میری بینائی معطل کر دی تھی۔ کابلو مجھے ساتھ لیے ہوئے چلا۔ میں آگے ہی بڑھتا گیا جیسے اس کمرے میں کوئی دیوار نہ ہو، نہ کوئی دروازہ کھلنے کی آواز آئی، نہ کوئی دیوار ہٹنے کی آہٹ ہوئی۔ آگے چل کر میں نے محسوس کیا کہ میں کمرے سے باہر آ چکا ہوں۔ درختوں اور پتوں کی خوشبو نے میرے نغصوں میں داخل ہو کر مجھے دوبارہ زندگی کا احساس دلایا۔ میں نے بندر کو چھوڑ دیا۔ وہ بھی میرے طرح بھوکا تھا اس لیے نہ جانے کس طرف ہولیا میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ ٹھوکریں کھاتا اور جھنجھلاتا ہوا۔ ”تمہاری منزل آگئی ہے معزز سردار!“ کابلو کے مخاطب ہوتے ہی میری بینائی واپس آگئی۔ میں ایک غار کے دہانے پر کھڑا ہوا تھا۔ اسی طرح اندھیرا تھا جیسے برسات کی رات میں کالے بادل، اس اندھیرے میں یوں بھی میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا، نہ جانے کابلو نے کس مصلحت کے تحت میری بینائی معدوم کر دی تھی۔ ”عظیم لوکا سا کے حضور پہنچنے سے پہلے یہ بات یاد رکھو کہ وہ سخت گیر طبیعت کا مالک ہے۔ وہ اصولوں کا پابند ہے۔ لغزشیں برداشت کرنا اس نے نہیں سیکھا۔ اسے تربیت حاصل کرنے والے افراد کی خود سری سخت ناپسند ہے۔“

میں نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ قرب و جوار میں گھنے جنگلات محسوس ہوتے تھے، کابلو غائب ہو چکا تھا، میں نے ایک ٹاپے کے لئے کابلو کی ہدایتوں پر غور کیا، پھر بے جھجک غار میں داخل ہو گیا۔ غار کا دہانا تنگ اور راستہ پر پیچ تھا۔ مجھے کوئی دس منٹ تک اپنا سفر جاری رکھنا پڑا۔ اس کے بعد میں ایسے کشادہ اور روشن کمرے میں پہنچ گیا جہاں اعلیٰ قسم کا ساز و سامان بڑے سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ وہ کمرہ مجھے کسی قدیم بادشاہ کا ملاقاتی کمرہ لگ رہا تھا۔ تمام چیزیں پتھری کی بنی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر عجیب و غریب شکلوں کے انسان بنے ہوئے تھے۔ فرنیچر پرانے طرز کا مگر مصر کی قدیم تہذیب کا معلوم ہوتا تھا۔ میں کمرے کی دیواروں پر منقش تصویریں دیکھ رہا تھا کہ ایک تیز آواز میری محویت کے فسون کا شیرازہ منتشر کرتی ہوئی ابھری۔ ”تو وہ تم ہو۔“

میں نے گھوم کر اس سمت دیکھا، جدھر سے آواز آئی تھی۔ ایک پستہ قد گھٹے ہوئے جسم کا جیشی تکیجی نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ صورت شکل کے اعتبار سے کسی بے رحم جلا دے کم نہیں تھا، اس کی آنکھوں سے سفاکی اور درندگی جھلکتی تھی۔ اس کے جسم پر جانوروں کی شکلیں اور نیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ گلے میں مالائیں، مردہ جانوروں کی کھوپڑیاں اور کڑے لٹک رہے تھے، اسے دیکھ کر ایک لمحے میں یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کوئی آسان آدمی نہیں ہے، اس سے محتاط گفتگو کرنی چاہئے۔ پہلی نظر میں اس نے مجھے خاصا دہشت زدہ کر دیا تھا لیکن اپنی ناتوانی، نقاہت اور حیثیت نظر انداز کر کے میں نے اطمینان سے کہا۔ ”میرا نام جابر بن یوسف الباقر ہے۔ مقدس اقبال نے مجھے خاص تربیت کے لئے بھیجا ہے۔ میں جزیرہ توری کے ایک قبیلے کا سردار ہوں اور جزیرہ باگمان کے ناظم اعلیٰ سے کچھ حاصل کرنے آیا ہوں..... اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو میں اس وقت جزیرہ

باگمان کے ذی مرتبت ناظم اعلیٰ لوکا سا کے روبرو کھڑا ہوں۔“

”تم مہذب دنیا سے تعلق رکھتے ہو..... اوہ تم وہاں کے ایک فرد ہو، تم میرے لیے ایک دل چسپ آدمی ثابت ہو گے۔“ پستہ قدحی نے میرے مہذب طرز گفتگو پر اپنی تلخ اور درشت آواز سے پانی پھیر دیا۔

”میں اپنے ماضی سے رشتہ منقطع کر چکا ہوں۔ اب میں یہیں کا ایک فرد ہو۔ صرف میرا نام پرانا ہے لیکن نام سے کیا ہوتا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ تمہارے ایک اچھے شاگرد کی حیثیت میں یہاں سے جاؤں۔“ اس کا لہجہ مجھے گراں گزرتھا لیکن میں نے محتاط آواز میں کہا۔ ”کیا میں دوبارہ یہ دریافت کروں کہ میں مقدس لوکا سا سے ہم کلاں ہوں؟“

”تمہارا اندازہ ٹھیک ہے لیکن تمہیں اپنا منصب اس وقت تک کے لئے بھول جانا ہوگا جب تک تم جزیرہ باگمان پر ہو۔ یہاں لوکاں سارا رہتا ہے۔ یہاں لوکاں کا حکم چلتا ہے، لوکاں یہاں کا حکمران ہے۔“ اس نے رعونت سے کہا۔

”میں تربیت گاہ کے آداب سے واقف نہیں ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تاہم مقدس لوکاں کی خوشنودی میرے لیے باعث افتخار ہوگی۔ میری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔“

”ممکن ہے تم یہاں سے واپس ہو جاؤ ممکن ہے تم یہاں سے کبھی واپس نہ جاؤ۔“ اس کے جملے سے میں تھرا گیا۔ ”یہ سب تم پر منحصر ہے۔ اس عظیم و برتر ہستی نے تمہیں یہاں بھیجا ہے جو سب سے محترم ہے، لیکن یہاں بھیجنے سے اس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ اس تربیت گاہ میں آدمی کی سخت آزمائش کی جائے۔ یہاں تمہارا بدن تپ کر جھلس بھی سکتا ہے اور تم اپنے لیے ایک نئی زندگی تخلیق کر سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے میرے پاس لانے سے قبل میرے آدمیوں نے تمہیں میرے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہوگا۔ مجھے جھوٹ، غلطی اور حماقت سے نفرت ہے، ان کی سزائیں میرے ہاں بہت شدید ہیں۔ میں اپنے علاقے میں دوسرے علاقے کے افراد کی آمد پسند نہیں کرتا لیکن تم اس سے مستثنا ہو کیونکہ تم خود نہیں آئے ہو۔“

اس کے سخت لہجے سے مجھے بے حد الجھن ہوئی۔ یہ بڑبولا شخص مجھے کسی طور اچھا نہیں لگا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس سے نمٹنے کی کوشش کرتا، اس کے لئے میرے دل میں ایک کینہ پیدا ہو گیا، یہ حقارت اور نفرت کا لہجہ اس کے لئے تکبر اور بے رحمی کا غماز تھا۔ ”میں نے تمہاری اطاعت کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں مجھ سے کسی قسم کی شکایت نہ ہو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”یہاں آنے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ مجھے کن سخت مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔ پہلے ہی دن جزیہ تواری کے ایک معزز سردار کی جو پذیرائی ہوئی اور اسے دیوتاؤں کے جام کے سوا ہر چیز سے محروم رکھا گیا، اسے بھوکا رکھا گیا۔ اس امر نے مجھے احساس دلادیا ہے کہ میرے آنے والے دن کتنے اذیت ناک ہوں گے۔“ میں نے شکایتا کہا۔

”یہ آغاز ہے۔ جزیرہ توری کے اجنبی سردار۔“ میرا جواب سن کر اس کے چہرے کی رعونت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ خونیں نظروں سے میری طرف گھورتا رہا۔ جیسے ابھی مجھے زندہ ہضم کر لے گا۔ پھر اچانک اس نے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا ایک خاص انداز سے بلند کیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک جوان کلفتہ گداز بدن لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک تھال اٹھا رکھا تھا۔ تھال میں جو شے موجود تھی اسے بڑے بڑے پتوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ لڑکی لوکا سا کے قریب پہنچ کر کورنش کے انداز میں ذرا سی خم ہوئی، پھر خاموشی سے دو قدم

ہٹ کر لوکا سا کے بائیں ہاتھ کی جانب کھڑی ہو گئی۔ ”تم بھوکے ہو جابر بن یوسف!“ اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”مگر تم کسی رعایت کی توقع مت کرنا۔ تمہاری حیثیت یہاں مہمان کی نہیں ہے۔“

”میں اپنی بھوک پر قابو رکھنا جانتا ہوں۔“ میرے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔

اس نے میری چرب زبانی پر گھور کر مجھے دیکھا اور زہر خند سے بولا۔ ”جابر بن یوسف! تمہیں بھوکا نہیں رہنے دیا جائے گا۔ میں نے بطور خاص تمہارے لیے ”لیغو“ کا تحفہ محفوظ رکھا ہے۔ لیغو کیا ہے؟ یہ ان نافرمانوں اور کج رویوں کا نام ہے جو کسی حکم کی تعمیل میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا لذیذ گوشت ہے جو جزیرہ باگمان سے فرار حاصل کر کے قریبی علاقے میں گھس جاتے ہیں، جب انہیں پکڑ لیا جاتا ہے تو ان کا لذیذ گوشت تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس گوشت کا ذائقہ سب سے مختلف ہوتا ہے۔ نہایت لذیذ.....“ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو وہ گرج کر بولا۔ ”نہیں جب تک میں بولتا رہوں، تمہیں زبان ہلانے کی اجازت نہیں ہے۔ تم نے اپنی مہذب دنیا اور جزیرہ توری میں اعلیٰ درجے کی غذائیں کھائی ہوں گی لیکن لیغو کا ذائقہ..... اوہ..... اس کا ذائقہ..... تم اسے نہیں بھولو گے۔ تمہاری اشتہا بھی شدید ہے۔ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔“

لوکا س نے اپنا بیان ختم کر کے اشارہ کیا۔ لڑکی ایک بار پھر احتراماً خم ہوئی، پھر اس نے تھال پر سے پتے ہٹا دیے۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔ تھال میں انسانی جسم کا گوشت ٹکڑوں کی شکل میں موجود تھا۔ میرا جی اُلٹنے لگا اور ابائی آنے لگی۔ میں ابھی آنے والے لمحات کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ لڑکی نے گوشت کا ایک ٹوٹھرا تھال سے نکال کر میری جانب اس طرح پھینکا جیسے کسی بھوکے کتے کے آگے بوٹی کا ٹکڑا پھینکا ہو۔ میں احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن لوکا س نے اس کی مہلت نہیں دی۔ وہ بے رحمی سے بولا۔ ”لیغو کی طرف سے منہ پھیرنے والا لیغو جیسا مجرم ہوتا ہے، آگے بڑھو اور اس نایاب تحفے کی سعادت سمیٹو۔“

میرے لیے مفر کی کوئی گنجائش نہیں تھی، میں نے جبراً قہراً گوشت کا وہ ٹوٹھرا اٹھایا جس کے اندر سے بڑی کراہت آمیز بو پھوٹ رہی تھی، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے میرا دم گھٹ جائے گا۔ ایک تو انسانی گوشت اور پھر یہ نقصان۔ اس وقت مجھ پر کیا گزر رہی تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ جہاز کی تباہی کے بعد لائف بوٹ کے طویل سفر کے دوران بھوک سے مجبور ہو کر تو مغنا نے ایک شریک سفر یہودی کو قتل کر کے اس کا کچا گوشت کھایا تھا، تو مغا کی دیکھا دیکھی دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی یہودی کے جسم کی بوئیاں نوج کر کھانے پر مجبور ہو گیا تھا، صرف سرتیا اور سرنگا اس جرم سے محفوظ رہے تھے۔ اس وقت زندگی بچانے کا مسئلہ درپیش تھا لیکن اس وقت خالی معدہ ہونے کے باوجود انسانی گوشت چپانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ لوکا س سے میری پہلی ملاقات ہی نفرت و اکراہ سے شروع ہوئی تھی۔ میرا انکار اسے میرے خلاف کوئی بھی فیصلہ کرنے پر اُکسا سکتا تھا اور کیا عجب تھا کہ لوکا س کے حکم کی نافرمانی مجھے باغی قرار دینے کا سبب بن جاتی اور ایک دن مجھے بھی لیغو کی شکل میں تبدیل کر دیا جاتا۔

میرے دل کی حالت ناقابل بیان تھی، لوکا س بہت انہماک سے میری ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ گوشت کے نقصان سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ دل چاہا کہ لیغو لوکا س کے منہ پر مار کر وہاں سے بھاگ نکلوں، یہ زندگی کی کیسی آرزو تھی جو انسانوں کے متعفن گوشت کے استعمال پر منحصر تھی۔ پھر میں نے اپنے دل کو سمجھایا، جابر بن یوسف! تم انسان کہاں رہے ہو؟ یہ تمہارا حلیہ یہ برہنگی، جسم پر یہ نقش و نگار، یہ بڑھے ہوئے بال، تم

نے اسی علاقے میں انسانی خون پیا، تم نے اپنے دوست کا کچا گوشت کھایا، تم وحشی ہو، تم ایک جانور ہو۔ پھر یہ اکراہ کیوں، اٹھاؤ یہ پارچہ اور اپنے معدے کو درندوں کی غذا کا عادی بنا لو، میرا ہاتھ آہستہ آہستہ منہ کی جانب بڑھنے لگا۔ مجھے یہ بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں جمال و رعنائی کا جو با، لطافت و نزاکت کا علم بردار، حسین عورتوں کے لس سے خیال آرائیاں کرنے والا شخص میں۔ میں نے وہ غذا استعمال کی، میرا ذہن مجھ سے بچھڑ گیا۔ میں نے ناک بند کی اور بڑی سرعت کے ساتھ لیبغو اپنے منہ میں رکھ لیا۔ وہ برداشت کا امتحان تھا۔ گوشت منہ میں رکھنے کے بعد اتنا کثیف نہیں تھا جتنا باہر سے معلوم ہوتا تھا مگر میرا خیال ہے مجھے یہ ذکر چھوڑ دینا چاہئے، لوکا سا کے چہرے پر تحیر تھا۔ وہ مجھے تعجب خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے وہ پورا ٹکڑا ہضم کر لیا اور مسکرا کر کہا۔ ”مقدس لوکا سا نے سچ کہا تھا۔ لیبغو کے ذائقے نے مجھے ایک نئی لذت سے روشناس کرایا ہے۔ میں اس مقدس تحفے کے لئے لوکا سا کا شکر گزار ہوں۔“

لوکا سا نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ اٹھا کر دوبارہ اشارہ کیا۔ لوکا سا کا اشارہ ملتے ہی لڑکی نے تھال سے گوشت کے دو اور ٹکڑے میری جانب اُچھال دیئے۔ جب ایک ٹکڑا کھالیا تھا تو دوسرے میں کیا تھا۔ میں نے انہیں اپنے پیٹ کے جہنم کی نذر کر دیا۔ لوکا سا کی آنکھیں فرط حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے لڑکی کو باہر جانے کا حکم دیا۔ کمرے میں جب ہم دونوں تنہا رہ گئے تو لوکا سا نے اپنی حیرتوں پر قابو پاتے ہوئے اسی تندو تلخ لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”تمہاری خود اعتمادی اور برداشت کوئی نئی بات نہیں، مگر یہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے جزیہ توری کے قیام کے دوران تم نے وہ علاقہ پورے طور پر قبول کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ تمہیں کچھ دنوں اور زندہ رکھے گی۔ لیکن جزیہ باگمان..... جزیہ باگمان، جزیہ توری سے مختلف ہے۔ یہاں وہی شخص قدم جما سکتا ہے جس کے جسم پر بے شمار آنکھیں ہوں۔“

”اس کی رحمتیں سایہ گستر ہیں، اس کی چاہت دل میں جاگزیں رہے۔“ میں نے اعتماد سے کہا۔ ”میں یہ سب کچھ اس کی نظر میں اپنے لیے کوئی رعایت پیدا کرنے کے لئے کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری ریاضت رائیگاں نہیں جائے گی۔“ پھر میں نے دل میں کہا۔ ”اگر یہی اس کے قرب کا مقصود ہے تو یہی سہی۔ اگر یہی مقصود زندگی ہے تو پھر اپنی گردن خم کر دینی چاہئے۔“

”بعض اوقات طالب کو اس کا مقصود زندگی میں نہیں ملتا۔ جزیہ باگمان پر تربیت کی مدت بڑی طویل بھی ہو سکتی ہے۔“ اس نے نفرت سے کہا۔ ”مقدس لوکا سا، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مجھے آنے والی آزمائشوں اور وقت کا خوف دلا کر میرے حق میں کوئی مفید کام کر رہے ہو تو میں گزارش کروں گا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مجھے تربیت کے جملہ کوائف سے مطلع کرو مجھے کیا کرنا ہوگا؟ میرے لیے کیا حکم ہے؟“ میں نے دلیری سے کہا۔ ”کوائف!“ لوکا سا نے مجھے جھڑک دیا۔ ”تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔ یہ دلیری نہیں گستاخی ہے۔ یہ دنیا وہ نہیں ہے جہاں سے تم آئے ہو۔ یہ سارا علاقہ امتحان گاہ ہے۔ ہر وقت ایک آزمائش ہے۔ ہر پل ایک امتحان ہے۔ اس کا انحصار مجھ پر ہے کہ میں کس وقت تمہارے لیے کیا حکم دیتا ہوں۔ مجھے گستاخ لوگ ناپسند ہیں۔“

وہ آدمی نہیں جانور تھا۔ وہ بولتا تھا تو کسی درندے کی خونخواری آتی تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو جاتا اور اشتعال میں دیر تک بہکتا رہتا۔ اس نے مجھے کئی بار مشتعل کر دیا۔ اس کی گردن دبوچنے کے لیے میرے ہاتھوں میں کسمساہٹ ہوئی لیکن میں نے اپنے پیر زمین پر جمالے اور اپنا

وجود فراموش کر دیا۔ اس کی کینہ تو ز اور حقارت آمیز نظریں میرے جسم کا طوائف کرتی رہیں۔ میری خاموشی پر اس نے برہمی سے کہا۔ ”تمہیں غالباً جزیہ باگمان اور اس کے ناظم اعلیٰ کے مرتبے کے متعلق تفصیل سے آگاہ نہیں کیا گیا۔“

”مجھے یہاں کے اسرار سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ میں نے ٹنگ آ کر کہا۔

لوکاسا کا چہرہ اور غضب ناک ہو گیا۔ اس کی نگاہیں خون برسا رہی تھیں۔ ”اے شخص! آج تک لوکاسا سے آنکھیں ملانے کی جرات کسی کو نہیں ہوئی۔ لوگ اس کا نام سن کر لرز اٹھتے ہیں۔ روصیں راستہ بدل دیتی ہیں۔“

”شاید مقدس ناظم اعلیٰ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں اس کی توہین کی جرات نہیں کر سکتا۔ شاید ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقدس لوکاسا کو جزیہ باگمان پر میری آمد سے کوئی خوشی نہیں ہوئی؟“ میں اپنے جملوں میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش میں ناکام رہا۔

وہ اور برا فروختہ ہو گیا۔ ”لوکاسا کو غلط فہمی، لوکاسا کی توہین، لوکاسا کی ناراضی..... کیا تمہاری زبان کھینچ لی جائے؟ کیا تمہارے منہ میں آگ بھردی جائے۔ اسے انجانا شخص! کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ لوکاسا نے طیش میں کہا۔ ”وقت بتائے گا کہ تو نے اپنی زبان دراز کر کے عرصہ حیات اپنے اوپر تنگ کر لیا ہے۔ لوکاسا پر طرہ۔ اوہ۔ اوہ لوکاسا کی توہین۔“

وہ تلملا کر زمین پر پیر مارنے لگا۔

”یقیناً مجھ سے گستاخیاں ہو گئی ہیں۔ میں اپنے مطمع نظر کی ترسیل مناسب الفاظ میں نہیں کر رہا ہوں لیکن لوکاسا کی عظیم ذات کا عرفان مجھے رفتہ رفتہ ہو رہا ہے۔ مجھے کوئی حکم دیا جائے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

اسے سرد کرنے میں دیر لگی۔ میں نے وہاں غیر معمولی برداشت کا مظاہرہ کیا آخر اس نے مجھے حکم دیا کہ دودن بعد قصر لوریمیا میں جوشان وارجشن منعقد ہونے والا ہے میں اس میں شرکت کروں لوریمیا کے سامنے اطاعت گزاری کا عہد کروں۔ لوریمیا جو اس علاقے میں ایک عظیم دیوی کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔ ہر عہد میں دیوی کی ترجمان ایک دوشیزہ ہوتی ہے۔ جو دیوی کا پرتو کھلاتی ہے۔ اُسے دیوی کی جانشین سمجھ کر جزیہ باگمان کا ہر شخص اس کی عبادت اور اطاعت اپنا فرض سمجھتا ہے۔ لوکاسا ایک سردار کی حیثیت سے فعال رہتا ہے اور جزیہ پر اس کا کلی تصرف رہتا ہے۔ لوریمیا دیوی سردار نامزد کرتی ہے اور پھر خود اسی سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ لیکن لوریمیا کی حیثیت اس سے متاثر نہیں ہوتی۔ وہ جزیہ میں سب سے محترم اور افضل رہتی ہے مجھے لوکاسا نے سرسری طور پر لوریمیا کے مقدس اور اس کی عظمت کے بارے میں بتایا۔

لوکاسا کی اکھڑی اکھڑی گفتگو سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ وہ اپنے موجودہ عہدے سے کلی طور پر مطمئن نہیں ہے، یقیناً لوکاسا اپنی غیر معمولی جرات و شجاعت، اہلیت اور صلاحیت کے بعد ہی جزیہ پر اس کا سردار منتخب ہوا ہوگا۔ میں اس سے بہت سے سوال کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس موقع پر مزید گفتگو مناسب نہیں سمجھی، ہاں لوریمیا کو دیکھنے کا اشتیاق میرے دل میں پیدا ہو گیا۔ میں نے جشن لوریمیا میں شرکت پر اپنی خوشی کا اظہار کیا تو لوکاسا نے سختی سے کہا۔ ”میں کوئی ایسی بات پسند نہیں کروں گا جو مقدس لوریمیا کی شان کے خلاف ہو۔“

”میں عورتوں کی قدر کرتا ہوں۔“ میری خوش دلی لوٹ آئی۔

”لیکن مقدس لور یا کوئی عورت نہیں ہے، وہ دیوی ہے، لوکا سا کا سر بھی اس کے سامنے جھک جاتا ہے۔“ لوکا سانے تلخی سے کہا۔

”وہ میرے لیے قابل پرستش ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”اس کا دیدار بھی ایک امتحان ہے۔ وہاں تمہیں اپنی شجاعت اور ذہانت کے جوہر دکھانے کا موقع دیا جائے گا ممکن ہے کل ہی فیصلہ ہو جائے۔ بہتر یہی ہے کہ تم تکلیفوں سے بچ جاؤ۔ میں سمجھتا ہوں، موت زیادہ آسان طریقہ ہے۔“ لوکا سانے سرگوشی کی۔

”میں سمجھانہیں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم جاسکتے ہو۔“ لوکا سانے حقارت سے کہا۔ میں نے کسی ایسی مشین کی طرح عمل کیا جس کا کوئی بٹن دبا دیا گیا ہو۔ میں لوکا سا سے اور

گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ اس کا اشارہ پا کر میں نے خاموشی اختیار کر لی اور چپ چاپ واپسی کے راستے پر ہولیا۔ راستے میں

اندھیروں نے پھر میرا احاطہ کر لیا۔ میں راستہ ٹٹولتا ہوا غار کے دہانے سے باہر آ گیا۔ باہر سردکھلی ہوا میں سانس لیتے ہی مجھے متلی ہونے لگی اور میں نے

حلق میں ہاتھ ڈال کر تمام گوشت لوٹ دیا۔ جی کو کسی قدر سکون ہوا تو میں نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا، میرا کوئی جادہ نہیں تھا، میری کوئی منزل نہیں تھی۔

ہر سواندھیرا تھا اور کوئی میرا رہبر نہیں تھا۔ طعام و قیام کا مسئلہ مجھے خود حل کرنا تھا۔ میں ایک درخت کے کنارے سستانے بیٹھ گیا اور دیر تک اپنے

خیالوں میں گم رہا۔ گاہے گاہے روشنی کے جھماکے میری نظریں خیرہ کر جاتے تھے، ہر طرف درخت تھے، صرف اندھیروں میں بڑھنے والے یہ درخت

اور ان میں رہنے والے جانور میرے ساتھی تھے۔ آبادی دور کہیں بہت دور نظر آتی تھی۔ میں نے سوچا اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ رہنے سے کیا

ہوگا۔ میں نقاہت سے ختم ہو جاؤں گا۔ مجھے اپنی غذا حاصل کرنی چاہئے، چاہے مجھے آبادی کی طرف جانا پڑے۔ یہ کیسا علاقہ ہے جہاں مجھے کوئی نہیں

پوچھتا۔ وہ مجھے قید بھی نہیں کر رہے ہیں، کم از کم غذا اور قیام کے بارے میں بے فکر ہو جاؤں۔ انہوں نے مجھے ایک آوارہ کتے کی طرح چھوڑ دیا ہے جو

کونے کھدروں میں اپنی غذا سونگتا پھرتا ہے۔ پھر مجھے اس بندر کا خیال آیا، پتہ نہیں اسے کیا ملا۔ میں چھ دن تک اس کمرے میں بند رہا تھا۔ لور یا کا

جشن ہونے میں دو دن رہ گئے تھے اور فریسا نے مجھے بتایا تھا کہ جشن آٹھ روز میں منعقد ہوگا۔ کمرے کی سیاہی میں رات دن کی تمیز مشکل تھی۔ پانچ دن

پانچ راتیں میں اور بند رہو کے رہے۔ خیال آتے ہی بھوک اور تیز ہو گئی میں نے درخت ٹٹولنے شروع کیے کہ شاید کوئی پھل مجھے مل جائے لیکن وہاں

سبز پتوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے مجبور ہو کر اشمار کے سکھائے ہوئے کچھ عمل کیے اور جارا کا کا کی کھوپڑی کو ایک خاص سمت میں رکھ کر اس سے

رہنمائی کی درخواست کی۔ اسی لمحے مالا سے روشنی کی کرن پھوٹی اور میں بستی کی طرف چل دیا۔ مالا کی روشنی نے بستی کی سمت اشارہ کیا تھا۔ میں تیز تیز

قدموں چلتا ہوا بستی میں داخل ہو گیا۔ بستی گنجان تھی اور چھوٹی بڑی جھوپڑیوں پر مشتمل دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ انسانی آوازیں کی گونج اور چہل پھل

نے میرے اوسان بحال کیے۔ تھوڑی دیر تک میں جھوپڑی کی قطاروں کے ساتھ بل کھاتے ہوئے راستوں پر چلنے لگا۔ کوئی دیا کہیں ٹٹمنا رہا تھا تو

کہیں بچوں کے ہنسنے رونے کی آوازیں آرہی تھیں، آخر ایک نسبتاً صاف، کشادہ اور روشن جھوپڑی میں، میں بے دریغ داخل ہو گیا۔ میرے گلے میں

پڑی ہوئی مالا سے روشنی پھوٹ رہی تھی جس سے جارا کا کا کی کھوپڑی نمایاں ہو گئی تھی۔ اندر پہنچ کر مجھے ایک بوڑھی عورت اور اس کی نوجوان بیٹی نظر

آئی۔ وہ میری آمد سے سہم گئیں میں نے جزیرہ توری کی رسم کے مطابق انہیں سلام کیا اور ان سے کہا۔ ”مجھے کھانا چاہئے۔“

اقابلا (دوسرا حصہ)

سے متاثر نہ ہوتیں۔ اُن پر لوکا سا کا خوف طاری تھا۔ لوکا سا کوئی مقبول اور پسندیدہ شخص نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے یہی کمزوری پکڑ کر اُن سے گفتگو چھیڑ دی۔ آخر مجھے چند باتیں پتہ چل گئیں کہ لوکا سا حال ہی میں سرداری کے منصب پر فائز ہوا ہے اور اس نے آتے ہی سخت قوانین نافذ کر دیے وہ جسے چاہتا ہے قتل کر دیتا ہے۔ ساری بستی اس کے نام سے لڑتی ہے اس سے پہلے اسٹالا جزیرے کا سردار تھا۔ اسٹالا ایک دن جزیرے سے روپوش ہو گیا۔ لوکا ساخت تربیت کے بعد اسٹالا کا نائب بن گیا تھا، دوسرے دن قصر لوریماس سے ایک اعلان ہوا کہ اب اسٹالا کی جگہ لوکا سا سردار ہے۔ نگری میں نے جزیرے کے تمام لوگوں کے نام نہایت احترام سے لیے اور ایک بچے کی طرح کارآمد معلومات حاصل کیں۔ مجھے اس کا کوئی خوف نہیں تھا کہ ان معلومات کے عوض نگری پر کیا گزرے گی۔ پھر بھی میں نے تمام احتیاط ملحوظ رکھی اور اسے بچانے کے لئے الٹے سیدھے سوالات کیے اس جزیرے کی سیاست کے متعلق نگری بہت زیادہ معلومات فراہم نہیں کر سکتی تھی لیکن مجھے اس بکھرے ہوئے مواد سے مفروضے قائم کرنے میں مدد ملی۔ مفروضے جن کی بنیاد پر میں آئندہ اپنے لیے کوئی راہ متعین کر سکتا تھا۔ نگری نے میرے جذبات میں ہلچل مچائی لیکن میں اس سے دُور ہی رہا۔ کچھ دیر بعد میں بستی میں گھومنے چلا گیا۔ جشن لوریماس کی تیاریاں شباب پر تھیں۔ ہر سال لوریماس کی سالگرہ کا جشن نہایت تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔ بستی سے نکل کر میں پھر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر لوریماس کے متعلق سوچنے لگا۔ میرا ذہن اس وقت عجیب پیچیدگیوں میں مبتلا تھا۔ جزیرہ توری کی سرداری کے دوران اور شوالا کو زیر کرنے کے بعد میں اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا تھا۔ لوکا سا میرے امتحان کی مدت طویل کر سکتا تھا اور لوکا سا مجھے جلدی یہاں سے روانہ بھی کر سکتا تھا۔ اس منغص اور نفرتی شخص نے مجھ پر کوئی اچھا اثر نہیں چھوڑا تھا۔ نگری کی زبانی اسٹالا کی سرکوبی کی خبر سن کر مجھے لوکا سا کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ لوکا سانے اسے سازش کر کے ہی ہٹایا ہوگا۔ اسٹالا خود بھی غیر معمولی طاقتوں کا مالک ہوگا۔ بہر حال مجھے یہاں کی سیاست کے پیچ و خم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری دلچسپی کا محور تو میں خود تھا جو جلد سے جلد یہاں سے فارغ ہو کر اپنے جزیرے پر پہنچنا چاہتا تھا اور اس کی بارگاہ میں قرب کا جو یا تھا، مجھے معلوم نہیں کہ سورج کس وقت چھپا اور کس وقت طلوع ہوا ہوگا، جزیرہ باگمان سے سورج بچ کر چلتا تھا۔ میں نگری کی جھوپڑی میں دھرنادے کر بیٹھ گیا۔ دوسرے وقت کا کھانا بھی میں نے اسی درندگی اور چھینا جھپٹی میں کھایا۔ وہ میری موجودگی سے سخت ہراساں تھیں۔ نگری خود کو کوئی بات نہیں کرتی تھی۔

اور پھر وہ وقت آ گیا جب لوریماس کا جشن سالگرہ منایا جانے والا تھا۔ اس وقت بستی کے لوگ جوق در جوق ایک سمت جا رہے تھے میں بھی ان میں شامل ہو گیا اور بستی سے خاصی دور ایک کھلے میدان کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ ڈھول پیٹتے، کڑے اُچھالتے، رقص کرتے، گانا گاتے اور شور مچاتے اس طرف جا رہے تھے۔ یہ ان کا مذہبی تہوار تھا۔ افریقی قبائل کے ان تہواروں کو وہاں کی تہذیب میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ جو سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ میدان میں سورج پوری آب و تاب سے طلوع تھا۔ میدان کے باہر اندھیرا تھا۔ عجیب حیرت کا مقام تھا کہ سورج نے زمین کا صرف ایک حصہ اپنی شعاعوں کے لئے منتخب کیا تھا۔ سورج کی روشنی میں آ کر جزیرہ باگمان کے لوگ اچھلنے کودنے اور زمین پر لوٹنے لگے۔ جو لوگ سال میں صرف ایک مرتبہ سورج دیکھتے ہوں۔ ان کا کیا عالم ہوگا۔ اس دھماکہ چوکڑی اور غل غپاڑے کو دیر ہو گئی۔ اُن کے سیاہ جسم سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ عورتیں مردوں کے ساتھ دیوانہ وار رقص کر رہی تھیں ان کے انداز میں جارحیت تھی جیسے آج رقص میں وہ اپنے حواس کھودیں گے۔

ڈھول کی تھاپ، سمندر کی سیسیوں سے بنائے ہوئے باجوں، رنگین جسموں اور ان کے گلے اور ہاتھوں میں پڑے ہوئے کڑوں کی جھکڑوں نے ایک عجیب سا پیدا کر رکھا تھا۔ پھر غلغلہ ہوا اور میدان میں زور سے نقارے بجنے لگے۔ سامنے پتوں سے بنا ہوا جال کا پردہ ہٹا دیا گیا اور جزیرہ باگمان کے تمام لوگ زمین کو بوسے دینے لگے۔ سب سے پہلے لوکا سا نمودار ہوا اور اس نے ہاتھ بلند کر کے رقص کرتی ہوئی دو نوجوان لڑکیوں کو اشارے سے آگے بلایا۔ لوکا سا کے دائیں طرف پتھر کی بنی ہوئی ایک مورتی نصب تھی۔ وہ ایک عورت کا ایک مجسمہ تھا جس کے ہاتھ میں پھول تھا اور اس کا سارا جسم عریاں تھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھکی ہوئی تھی۔ نوجوان لڑکیاں اس مجسمے کے قریب پہنچ گئیں تو لوکا سا نے بڑی پھرتی سے اپنے دونوں ہاتھوں کے خنجر ان کے سینوں میں بھونک دیئے۔ لڑکیاں تیرا کر مجسمے کے قدموں میں گر پڑیں اور بڑی طرح ترپنے لگیں۔ خون چاروں طرف بہنے لگا۔ مجمع کی ہاؤ ہو، شورغل میں اور اضافہ ہو گیا۔ نقارے اور تیزی سے پیٹے جانے لگے۔ پھر چند لمحوں بعد ان دونوں ترپتی ہوئی لڑکیوں کو مورتی کے قدموں سے ہٹا دیا گیا اور وہاں ہنر پتوں، سرخ پھولوں سے ڈھکی ہوئی لڑکیاں جلوہ گر ہو گئیں۔ ان کے کندھوں پر ایک تخت رکھا ہوا تھا جس پر ایک نازک اندام حسین و جمیل لڑکی تمکنت کے ساتھ رونق افروز تھی۔ وہ یقیناً اشار اور سارا کے حسن و جمال کا عکس تھی اور ان سیاہ فام حبشیوں میں سب سے علیحدہ نظر آرہی تھی۔ اس کی رنگت سرخ تھی اور نقش و نگار حبشیوں سے قطعی مختلف تھے۔ جلد ہی تخت مورتی کے قدموں کے آگے رکھ دیا گیا اور مورتی کا عکس اس کے زہد شکن شباب پر پڑنے لگا۔ وہ لور یما کی جانشین کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی حسین لڑکی لوکا سا جیسے کریمہ اور بھدے شخص سے غلوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ میں دور کھڑا تھا اور اسے قریب سے دیکھنے کے لئے میرا دل بڑی طرح مضطرب ہو رہا تھا۔ ہجوم میں راستہ بناتا ہوا میں اس کے قریب ہوتا گیا اور ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

وہ اقبال کی پری جمال دوشیزاؤں کے حلقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے جلوہ گر ہوتے ہی ایک ادا کے ساتھ اپنا ہاتھ بلند کیا۔ ایک خلقت لور یما کے اوصاف کے گن گانے لگی۔ پھر اس نے ہاتھ بلند کر کے انہیں خاموش کر دیا۔ لوکا سا اپنے نائین، اپنے محافظ دستے اور جزیرے کے سربراہ و ردہ لوگوں کے ساتھ بڑے طنطنے اور دبے سے کھڑا تھا۔

”مقدس لور یما تمہاری مسرتوں میں شریک ہے۔“ لوکا سا کی آواز آئی اور مجمع میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ پھر جزیرے کی ساری آبادی رقص کرتی ہوئی قطاروں کے ساتھ لور یما کے سامنے آتی رہی اور لور یما پر پھولوں کی پیتیاں بکھیرتی ہوئی کھلے میدان میں جمع ہوتی رہی۔ لور یما کے خوبصورت ہاتھ ان کی عقیدوں کا بہت آہستگی سے جواب دے رہے تھے۔ میں اس کے اور قریب ہو گیا اور میرا دل ڈولنے لگا۔ مجھے لوکا سا پر رشک آنے لگا۔ اس نازک بدن لڑکی کے سارے حقوق اس کے نام منتقل ہیں۔ اس کے لب پھولوں کی پیتیاں، اس کے رخسار جیسے دھکتے ہوئے شعلے، اس کے دانت جیسے یمن کے موتی، اس کی نگاہیں جیسے گہری نیلگوں جھیلیں، وہ سمن بردہ ستم گردہ عارت گر جب نگاہیں اٹھاتی تھی تو عام شخص لڑکھڑاتا تھا۔

”یہ ہے وہ۔“ زیر لب میں نے خود سے کہا۔ میں اس کے پاس جانے کے لئے پرتو لے لگا۔ لیکن لوکا سا کی موجودگی میں کسی گستاخی کی سزا مجھے معلوم تھی۔ اسی اثناء میں میدان میں درمیان کی جگہ خالی ہو گئی اور جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا رنگ برنگ ایک جلوس شور مچاتا ہوا گزرا پھر کچھ ستم رسیدہ

قیدی سامنے لائے گئے۔ ان کے چہرے مسخ ہو چکے تھے اور وہ مجہول انداز میں گرتے پڑتے زنجیروں کے حلقے میں چل رہے تھے۔ انہیں ایک ایک کر کے دہکتی ہوئی آگ میں جھومنے بے پروائی سے جھونک دیا۔ ان کی دل دوز چیخوں کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر لوکا سا اس کے قریب آ گیا اور اس نے وہاں ایک کاہن کی موجودگی میں غسل آتش کیا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ لوکا سا آگ میں کود گیا تھا اور دوسری طرف سے صحیح و سلامت نکل آیا تھا۔ اس کے نمودار ہوتے ہی مجمع میں ایک جھنڈناہٹ سی ہوئی۔ لوکا سا قریب آ کر لور یما کے سامنے سر بسجود ہو گیا۔ دیوانگی اور وحشت کے کئی اور مظاہرے وہاں ہوئے۔ پھر کھیلوں کے مقابلے، جسمانی کرب اور وحشیانہ رقص قبیلے کے منتخب نوجوان مجمع کو چیلنج کرتے، کوئی سامنے آتا، ان سے لڑتا اور جو جیت جاتا وہ لور یما کے پہلو میں کھڑا کر دیا جاتا۔ جسمانی طور پر بہادر لوگ ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے لور یما کے پہلو میں کھڑے ہوتے تھے۔ لور یما یہ مقابلہ بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی جب ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے ایک نوجوان سر بلند قرار دیا گیا تو لوکا سا نے مجمع کو مخاطب کیا کہ اب کوئی اس نوجوان سے مقابلے کا دعویٰ کرنے پر آمادہ ہے؟ میں نے سوچا مجھے آگے بڑھنا چاہئے۔ یہ نوجوان شوالا نہیں ہے پھر بھی اگر میں ہار گیا تو میرے تمام منصوبے خاک میں مل سکتے ہیں۔ بڑی ذلت کا سامنا کرنا ہوگا۔ میں نے نوجوان کے جسم کا جائزہ لیا، وہ ایک بھرپور اور مضبوط شخص تھا میں نے جارا کا کا کی کھوپڑی ہاتھ میں پکڑی۔ آنکھوں میں اقبال کا چہرہ گھوم گیا۔ اس وقت مجھے سرنگا بھی یاد آیا۔ زبردست خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں لوکا سا کے سامنے آ گیا اور میں نے با آواز بلند کہا۔ ”میں اس مضبوط نوجوان سے مقابلے کے لئے تیار ہوں۔“

لوکا سا میری جرات پر حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے بہت قریب سے لور یما کے حسین چہرے پر نظر ڈالی۔ اس سے میری نظریں چار ہوئیں تو مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوئی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کی سنجیدگی نے مجھے اور کرب میں مبتلا کر دیا۔ میں نے خود کو دواؤں پر لگا دیا تھا اور وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ لور یما کے سامنے مجھے اپنی زبان کی فصاحت اپنے لہجے کی دلکشی اور اپنے اطوار کی شاننگی دکھانے کا موقع مل گیا۔ لوکا سا نے مجھے منع کیا۔ اس نے اصرار کیا۔ میں انکار و اصرار کو طول دینا چاہتا تھا تاکہ میں کسی طرح لور یما کے دل میں اقبال کی طرف سے آئے ہوئے جزیرہ توری کے سردار کے لئے کوئی گداز پیدا کر سکوں۔ میں کچھ دیر لوکا سا کو ادھر ادھر کی باتوں میں الجھائے رہا۔ میرے چہرے کے خدو خال، جاذبیت اور میری آنکھوں کی تہذیب نے لور یما کو میری طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ میرا اس سے تعارف کرایا گیا اور لوکا سا نے مجھے ذلیل کرنے کے لئے اس کے سامنے دھمکیاں دیں اور اپنے اثر و اقتدار کی نمائش کی۔ میرا حربہ کامیاب تھا۔ میں خود کو ایک خاص حیثیت سے روشناس کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن جب لور یما نے ہاتھ اٹھا کر لوکا سا کو خاموش کر دیا اور مقابلے کے آغاز کا اعلان کیا تو یک بارگی میرے اعصاب میں رعشہ سا آ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا لیکن حبشیوں نے مجھے بے دردی سے کھینچ لیا اور میدان میں کسی جانور کی طرح پھینک دیا۔ ابھی میں اٹھنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ ایک بزرگ شخص میرے پاس آیا اور اس نے میرے گلے سے جارا کا کا کی کھوپڑی اور مالا اتار لی، نوجوان نہتا تھا۔ اس نے آتے ہی غرا کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں جھکائی دے کر اسے زمین پر گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ شوالا سے جنگ جیتنے کے بعد میں کوئی نئی بات محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس مقابلے کی طوالت کا ذکر میرے خیال سے مناسب نہ ہوگا۔ مختصر یہ کہ میں نے پہلے تو نفسیاتی طریقوں سے اسے دہشت زدہ کرنے کے حربے اختیار کئے۔ پھر مختلف طریقوں سے اس کے وار پچاتا رہا، اسے تھکا تار ہا اور خود مسکراتا رہا، میں اس کے سامنے اس طرح کھڑا ہو جاتا جیسے وہ ایک شیر خوار بچہ ہو۔

جب وہ غصے میں بھرا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوتا تو میں کبھی غیر متوقع طور پر اس کی ٹانگیں پکڑ کر اسے لوٹ دیتا، کبھی سامنے سے ہٹ جاتا اور وہ زمین پر دھب سے گر پڑتا۔ وہ ایک تو مند اور متوسط قد کا فولادی آدمی تھا، سارے مجمع کے لئے یہ کھیل دلچسپ تھا۔ کچھ میرے انداز کے سبب سے اور کچھ آخری مقابلے کی وجہ سے۔ میں درمیان میں ایسے جملے بولتا رہا جو اس کی ہمتیں پست کر سکیں۔ وہ ایک پیشہ ور جسم باز تھا۔ میں اس میدان کا کھلاڑی نہیں تھا لیکن میں عام انداز سے ہٹی ہوئی کشتی لڑ رہا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اس نے میرا جسم اپنے اپنی ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنا سخت جان ہے اور میرا خیال ہے اسے بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جابر بن یوسف الباقرا نام کا کوئی شخص اس کی گرفت میں ہے، میں نے اسے زور کرنے دیا۔ وہ مجھے ہلا بھی نہ سکا۔ مجھے خود اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔ یہ کس بل پہلے تو نہ تھا۔ اس ہنگامے میں خاصا وقت گزر گیا۔ وہ پسینے میں تر ہوا گیا میں نے آخر دیوتاؤں کا جام نوش کیا تھا میں نے زور کرنا شروع کیا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پے در پے حملے کرنے شروع کر دیئے۔ میں اتنی پھرتی اور اتنی مستعدی سے اس پر وار کر رہا تھا کہ وہ بوکھلا گیا اور ایک جگہ لڑھک کر گر گیا۔ یہی موقع تھا جب میں پورے طور پر اس دیو پر غالب آ گیا۔ کاہن نے مجھے اس سے علیحدہ کیا۔ مجمع میں پھر ہتھارے بجنے لگے اور نعرہ ہائے داد و تحسین بلند ہوئے۔

کاہن نے میری مالا اور جارا کا کا کی کھوپڑی واپس کر دی۔ پھر مجھے اس کے روبرو لے جایا گیا۔ اس نے چمکی آنکھوں سے میرے سراپا کا جائزہ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔ اس نے ایک ادائے دلبرانہ سے مجھے دیکھا۔ میں نے جھک کر اس کے قدموں کا بوسہ لے لیا اور اس کے صاف و شفاف پیر اپنی پلکوں سے لگا لیے۔ اس نے مجھے ایک سنہری مالا بطور تحفہ دی۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اپنی تشنگی کی کئی داستانیں اسے سنا دیں۔ اس نے لوکا سا کو اشارہ کیا۔ لوکا سانے اپنے گھنے زمین پر ٹیک دیئے۔ ”جابر بن یوسف الباقرا کو قصر میں پیش کیا جائے۔“

”مقدس اور یمہ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔“ لوکا سانے کہا۔

کاہن نے مجھے اس کے سامنے سے ہٹا دیا۔ لوکا سا کے چہرے پر خشونت کا اظہار چھپ نہ سکا۔ اس مقابلے کے بعد جانوروں پر قابو پانے کے مقابلے میں پیش ہوئے۔ یہ ایک دل ہلا دینے والا منظر تھا۔ چند آدمی درندوں کے سامنے چھوڑ دیئے جاتے تھے اور وہ انہیں سر کرنے کی کوشش میں ان کا لقمہ بن جاتے تھے۔ آدمیوں کا انتخاب کاہن کرتا۔ وحشی ہاتھی، چیتے، شیر اور گیدڑ۔ میدان میں پہلے گیدڑ چھوڑے گئے اور دس آدمیوں کی ٹولی کاہن نے پسند کر کے انہیں میدان میں چھوڑ دیا لیکن انہوں نے گیدڑوں پر قابو پا لیا۔ پھر ایک مست ہاتھی، پھر ایک چیتا۔ الامان والحفیظ۔ ان لہرہ خیز مقابلوں کی روداد بیان کرنے کا یارا نہیں۔ ہاتھی نے یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں کو پکھل دیا۔ پھر بھی وہ اس پر قابو نہ پاسکے۔ میدان میں خون ہی خون بکھرا پڑا تھا۔ چیتے کے ساتھ بھی یہی وحشت انگیز خونیں تماشا کیا گیا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں لوکا سا مجھے منتخب نہ کر لے۔ میں درندوں پر حاوی تھا لیکن یہاں میرا کون سا جادو چلتا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کاہن نے لوکا سا کے اشارے پر میرے سینے پر انگلی رکھ دی اور ناچار مجھے پندرہ آدمیوں کی ٹولی کے ساتھ ایک کھلے ہوئے چیتے کے سامنے جانا پڑا۔ ان سب کے چہرے سفید ہو گئے تھے۔ کاہن نے دوبارہ جارا کا کا کی کھوپڑی اور مالا میری گردن سے اتار لی تھی میں نے ان سب کو منظم کیا اور کہا کہ وہ ایک ساتھ مقابلہ کریں۔ ہم ایک ساتھ آگے بڑھے۔ مگر چیتے نے ایک دم جست لگائی اور ہمیں زخمی کرتا ہوا دوسری طرف پھلانگ گیا۔ میں نے انہیں پھر حوصلہ دلانے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ اس بار چیتے کو ناگموں اور دُوم سے پکڑنے کی کوشش کریں۔ جب وہ دندناتا ہوا

ہمارے غول کی طرف بڑھا تو وہ اس کی ٹانگیں اور دم کا پھندا پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن چیتے کی خوفناک غراہٹ سے دہشت زدہ ہو گئے وہ ان کے ہاتھوں سے پھر نکل گیا۔ اس کے پنجوں سے دوا دی نیم جاں ہو کر زمین پر لوٹنے لگے۔ اب چیتے کا غضب بڑھ گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں قہر امنڈ آیا تھا یہ ایک بہت خطرناک کھیل تھا۔ میں نے ان کا عزم جو ان کرنے کی کوشش کی۔ چیتا اس بار پھر ہمارے ہاتھوں میں آ گیا اور دو چار کوشمی کر کے دوبارہ گرفت سے آزاد ہو گیا۔ اس خونیں کھیل میں رفتہ رفتہ 9 آدمی ڈھیر ہو گئے۔ چیتا کسی کے قابو میں نہیں آتا تھا۔ سارے ہجوم پر ایک گہری خاموشی طاری تھی اور پھر وہ وقت آ گیا جب ہماری تعداد صرف تین رہ گئی۔ جو شخص میدان سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ لوکا سا کے محافظ اسے اندر دھکیل دیتے اور وہ لرزتا ہوا ہمارے ساتھ شامل ہو جاتا۔ جب تین آدمی رہ گئے تو مجھے تشویش سی ہونے لگی۔ میری تمام ہدایات ضائع گئی تھیں۔ اس لیے باقی افراد میری باتوں پر کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ایسے عالم میں مجھے کاہن اعظم سورال یاد آیا۔ سرنگا کو میں نے پکارا اور جب ان میں سے کوئی میری مدد کو نہیں آیا تو میں نے کاہن کو آواز دی۔ کاہن کو آواز دیتے ہی میرے بدن میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ میں نے بڑی آسانی سے چیتے کی ایک بھرپور جست پر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔ میں نے اسے دبوج لیا تھا اور میرے دوستا تھیوں نے فوراً اس کی ٹانگیں مروڑنی شروع کر دی تھیں۔ چیتے کو زبردیکھ کر دوسرے زخمی بھی کراہ کراٹھ آئے اور ہم سب اس پر پے در پے ٹوٹ پڑے۔ ہماری لاقوں، گھونٹوں اور پے در پے حملوں سے چیتا بے ہوش ہو گیا۔ یہ معرکہ اتنا سخت تھا، اتنا سنسنی خیز تھا کہ میں اب بھی یاد کرتا ہوں تو میرا رواں کا پھٹنے لگتا ہے۔ مجھے دوبارہ لوریم کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے ایک بھرپور نظر ڈال کر مجھے دیکھا۔ میں وہ نظریں پچھانتا تھا۔ حالانکہ اس مقابلے میں مجھے لوریم کی طرف سے ایک اور مالا پیش کی گئی لیکن میرا تھخہ تو اس کی وہ مسکراہٹ تھی جس کا کوئی مول نہیں۔

سورج غروب ہونے لگا اور جزیرہ باگمان کی طویل ترین رات کا آغاز ہو گیا۔ ساری بستی اندھیروں میں ڈوب گئی۔ میں بستی کے لوگوں کے جلو میں سرفراز نگری کے گھر جا رہا تھا۔ نگری بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ رات کو وہاں چراغاں تھا۔ عام دعوت میں آگ پر مسلم جانور بھونے جا رہے تھے اور شراب انڈلی جا رہی تھی۔ لوگ بدمست تھے۔

دوسرے دن صبح۔ وہ صبح ہی ہوگی، جزیرہ باگمان میں زندگی اپنے معمول پر آ گئی۔ میں نے اٹھ کر ویران جھونپڑی کی طرف دیکھا۔ نگری اور اس کی بوڑھی ماں دونوں موجود نہیں تھیں، میں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور اپنے منہ پر پانی کا ایک چھپکا مار کر تیزی سے جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ ساری بستی سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں نگری کی تلاش میں بستی سے آگے نکل گیا۔ میرے خدشات درست ثابت ہوئے بستی سے آگے ایک جگہ مشعل روشن تھی اور وہاں نگری اور اُس کی ماں کے سر لٹکے ہوئے تھے۔ مشعل کی روشنی میں ان کے خود آلود چہرے بڑے بھیانک لگ رہے تھے، ان دونوں کے جسم زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ یہ خوف ناک منظر دیکھ کر صدمے سے میری حالت غیر ہو گئی۔ قتل و خون اذیت ناک سزاؤں اور درندگی کا یہ کھیل یہاں عام تھا لیکن ان دونوں کی گردنیں صرف میری وجہ سے تہ تیغ ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے اعانت کی بڑی شدید، بہت عبرت ناک سزا پائی تھی۔ میرے دل میں لوکا سا کے لئے نفرت اور غضب کا ایک طوفان اٹھا۔ میری مٹھیاں بھنچ گئیں اور رگیں تن گئیں میں نے نگری کا سر اُتار کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور تلملا کر بستی سے آگے بڑھ گیا۔ میں کچھ ہی آگے گیا ہوں گا کہ لوکا سا کے محافظوں نے مجھے آلیا۔ کاہن ابھی ان کے ساتھ تھا جو میری

کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اندھیرے راستوں سے گزرا کر ایک بڑے دروازے تک پہنچا دیا گیا۔ سارے پہرے دار باہر رہ گئے ہیں۔ اکیلا دروازے میں داخل ہوا۔ اندر روشنیاں ہی روشنیاں تھیں، وہ محل میری توقع اور تصور کے مطابق تھا۔ اس کی تعمیر بھی اقبال کے قصر کی طرح ہوئی تھی اور وہ شان و شوکت کے اعتبار سے جزیرہ باگمان کی حسین و جمیل دیوی لوریمیا کے عین شایان شان تھا۔ میں تفصیلات سے گریز کر رہا ہوں، صرف اتنا فرق تھا کہ یہاں قصر اقبال کی طرح سفید فام دو شیزاؤں کے بجائے سیاہ فام لڑکیوں نے میرا استقبال کیا۔ میں مختلف کمروں اور ایوانوں سے گزرا کر ایک آراستہ شبستان میں پہنچ گیا۔ پورا ماحول گلاب کی خوشبو سے معطر تھا۔ شاید لوریمیا دیوی کو گلاب بہت پسند تھا۔ ایسی جاذب نظر دلکش سیاہ فام دو شیزائیں میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں، ان کے انتخاب میں بہت احتیاط برتی گئی تھی، وہ سب کی سب متوازن بدنوں کی تھیں، انہوں نے میرے گرد احاطہ کر لیا اور مجھے جلد ہی مقدس لوریمیا کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔ اس لوریمیا کے پاس جو جزیرہ باگمان میں سب سے محترم تھی اور لوریمیا دیوی کی جانشین کہی جاتی تھی۔ میں نے لوریمیا کو متاثر کرنے کے لئے رات بھر مختلف طریقے سوچے تھے۔ اس وقت حسن و شباب کی وہ دیوی میرے سامنے تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی جلد اس کی بارگاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ وہ ایک بڑے مجسمے کے نیچے تمام تر شکوہ اور رعنائی سے فروکش تھی۔ میں جاتے ہی اس کے سامنے جھک گیا۔ اس کے دل نواز ہونٹوں پر تبسم رقص کرتا نظر آیا۔ میری اس سے نگاہیں چار ہوئیں تو میں نے حسرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مقدس لوریمیا نے مجھے شرف باریابی بخش کر ایک اجنبی کو نوازا ہے، اس کے لئے سارے احترام واجب ہیں۔ میں اپنی جان نذر کرتا ہوں۔“ میں نے شائستگی سے کہا۔

”آہا۔ تمہارے بارے میں سچ سنا گیا تھا۔“ اس کے ہونٹ پھول کی طرح کھلے۔ ”جابر بن یوسف! تمہاری شجاعت اور ذہانت نے لوریمیا کو بہت متاثر کیا۔“

”کون جانتا ہے مگر مقدس لوریمیا کے علم میں ہوگا۔“ میں نے بلیغ انداز میں کہا۔ ”کہ شجاعت کی تحریک کس کے قرب جمال سے پیدا ہوئی؟“

”اوہ۔ اوہ۔“ وہ مسکرائی۔ ”لطیف۔ خوبصورت۔“

وہ اقبال نہیں تھی، اقبال نے آج تک مجھے براہ راست مخاطب کرنے کی سعادت نہیں بخشی تھی، صرف اس کے مخاطب ہونے کی دیر تھی، پہلے میں سمجھ رہا تھا کہ اس کے ہاں بھی ترجمانی کے فرائض کوئی اور انجام دیتا ہوگا۔ چنانچہ مجھے اظہار میں خاصی دقت پیش آئے گی مگر اب میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ میں نے شکوہ لفظی اور تاثر انگیزی میں اپنی ساری توانائی استعمال کی۔ جہاں حسن ہو جہاں آمادگی ہو، یوں کہیے کہ مناسب محل وقوع ہو اور پھر جہاں جابر بن یوسف ہو، وہاں کیا کیا کرشمے و رومانہ ہوتے ہوں گے۔ لوکا سا کے مقابلے میں مجھے برتری کا ایک احساس تھا۔ برتری کا احساس کہ میں مہذب دنیا کا ایک فرد ہوں، میں نے اقبال کا قرب حاصل کیا ہے، اشار جیسی نادر لڑکی میرے تصرف میں رہی ہے، میں نے کاہن اعظم کی لڑکی سمورال کو فتح کیا۔ تو شا اور نیری کو اپنے قالب میں ڈھالا، ژولین مجھ سے متاثر ہو گئی اور فلورا جیسی لڑکی آخر مجھ پر ملتفت ہو گئی اور سرتیتا۔ نہیں نہیں، اس کے بارے میں تو عجب احساسات دل میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ سرتیتا۔ یہ کیسے موقع پر یاد آ گئی۔ نہ جانے وہ کیسی ہو؟ سرنگا پر کیا گزری ہو؟ مجھے شدت سے اپنا قبیلہ یاد آیا لیکن میں اس وقت مقدس لوریمیا کے سامنے تھا۔ میں نے شاعری شروع کر دی اور اس سے درخواست کی کہ وہ میری

ہبری کرے اور گا ہے گا ہے اپنے حسن جہاں تاب سے سیرابی کا موقع عطا کیا کرے، میں نے اظہار و ابلاغ کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا چنانچہ مجھے لوریمیا کے نازک ہاتھوں کا بوسہ لینے کا اعزاز حاصل ہو گیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس کی مخصوص وابستگی کی حدود اور اپنے شوق کی لامحدود وسعت سے ایک کش مکش اُس کے دل میں پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ میں نے بہر صورت ایک چنگاری روشن کر دی تھی، یہ چنگاری جو دل نشین پیرا سیہ اظہار دلکش برتاؤ اور جرات و ذہانت سے بھڑکتی ہے۔ میں دیوانہ وار اس کے ہاتھوں کے بوسے لے رہا تھا۔ اچانک ایک سیاہ فام دوشیزہ مؤدبانہ اندر داخل ہوئی اور اس نے ہمارے انہماک و ارتکاز میں خلل ڈال دیا۔ اس نے لوکا سا کی آمد کا اعلان کیا۔ دیوی نے سر کی جنبش سے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اس اطلاع سے مجھے وحشت ہوئی لیکن میں اس کی اجازت کے بغیر اس کا ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ چند ثانیوں بعد لوکا سا اندر داخل ہو گیا۔ لوریمیا نے وقار و تمکنت سے اسے دیکھا، جیسے اُسے اس وقت اس کی آمد ناگوار گزری ہو اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور میں اس سے ہٹ کر کسی قدر دور کھڑا ہو گیا۔

”مقدس دیوی!“ لوکا سا کے لہجے میں تلخی چھپی ہوئی تھی یا ممکن ہے کہ یہ صرف میرا گمان ہو، اس نے کہا۔ ”اس نوجوان جابر بن یوسف الباقرا کو مقدس اقبال نے بھیجا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ لوریمیا نے بے نیازی سے کہا۔

”مقدس دیوی کے علم میں یہ بات بھی ہوگی کہ یہ نوجوان تاریک براعظم میں اجنبی ہے اور دوسری دنیا سے آیا ہے۔ اور اجنبی ہمارے لئے ہمیشہ شخص ثابت ہوتے ہیں۔“ لوکا سا نے نرمی سے کہا۔

”میں اب اجنبی نہیں ہوں۔“ میں نے درمیان میں دخل دیا۔

”میں اس حقیقت سے واقف ہوں لیکن وہ ہم سب سے افضل ہے وہ جانتی ہے کہ کون شخص شخص ہے، کون سعد۔“ لوریمیا نے وقار سے کہا۔

”وہ محترم ہے۔“ لوکا سا نے سنبھل کر کہا۔ ”تیری بارگاہ میں اس وقت میری حاضری کا مقصد یہی نوجوان ہے۔ اس نے اپنی ابتدائی تربیت مکمل کر لی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اسے زارشی کی پہاڑیوں پر ریاضت کے لئے بھیج دیا جائے۔“ لوکا سا نے ادب سے کہا۔

”زارشی!“ لوریمیا نے زیر لب دہرایا اور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”لوریمیا کی خواہش ہے کہ یہ شخص مقدس اقبال کی خدمت میں کامیاب واپس جائے۔“

”یہ سب اس کی مشقت و ریاضت پر منحصر ہے۔“ لوکا سا نے جواب دیا۔

”جابر بن یوسف!“ لوریمیا نے مجھے نکھیوں سے دیکھا۔ ”اگر تم کامیاب و کامران واپس آئے تو لوریمیا کو خوشی ہوگی۔“

”مجھے یقین ہے، دیوتا میرے ساتھ رہیں گے۔ میرے دل میں نیکی اور جستجو ہے، مجھے یقین ہے کہ میں جلد ہی مقدس لوریمیا کی قدم بوسی کا شرف حاصل کروں گا۔ میں اس کے جلوے سے سرفراز ہوں گا۔“ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

لوکا سا کی آمد کے بعد ماحول کا رنگ بدل گیا تھا۔ میری حیثیت ایک غلام کی سی ہو گئی تھی اور مجھے الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ میں لوریمیا سے

اور گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن لوکا شاید لوریا کے پاس زیادہ دیر میرا قیام پسند نہیں کرتا ہوگا۔ اسی لیے وہ پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ نمری اور اس کی ماں کی ہلاکت کے بعد مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس نے یہاں میری گفتگو دیکھ لی تھی، لوریا کا اشارہ پا کر مجھے باہر جانے کا حکم دیا گیا۔ دوسرا فام کینز مجھے لے کر باہر آ گئیں، لوکا سا وہیں ٹھہر گیا۔ کمرہ خاص سے باہر آ کر میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ یہ کس قدر اذیت کی بات تھی کہ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میرے تصور میں لوریا کا خوبصورت چہرہ گھوم گیا..... بستی میں جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ یقیناً یہ فیصلہ غلط میں کیا گیا ہے، زارشی کی پہاڑیوں پر بھیجے کا فیصلہ لوکا سانسے کہیں کسی خاص مصلحت سے تو نہیں کیا ہے؟ بہر حال میں ایک غلام تھا۔ اس کی اطاعت میں نجات تھی، میں جنگل میں ایک درخت کے کنارے ٹک گیا اور مجھے نیند آ گئی۔

☆=====☆=====☆

کاغذی قیامت

ہماری دنیا میں ایک ایسا کاغذ بھی موجود ہے جس کے گرد اس وقت پوری دنیا گھوم رہی ہے۔ اس کاغذ نے پوری دنیا کو پاگل بنا رکھا ہے۔ دیوانہ کر رکھا ہے۔ اس کاغذ کے لئے قتل ہوتے ہیں۔ عزتیں نیلام ہوتی ہیں۔ معصوم بچے دودھ کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ کاغذ ہے کرنی نوٹ..... یہ ایسا کاغذ ہے جس پر حکومت کے اعتماد کی مہر لگی ہے۔ لیکن اگر یہ اعتماد ختم ہو جائے یا کر دیا جائے تو پھر کیا ہوگا؟ اس کاغذ کی اہمیت یکنخت ختم ہو جائیگی اور یقین کیجئے پھر کاغذی قیامت برپا ہو جائے گی۔ جی ہاں! کاغذی قیامت.....

اور اس بار مجرموں نے اس اعتماد کو ختم کرنے کا مشن اپنا لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کاغذی قیامت پوری دنیا پر برپا ہو گئی۔ اس قیامت نے کیا کیا رخ اختیار کیا۔ پوری دنیا کی حکومتوں اور افراد کا کیا حشر ہوا؟ اسے روکنے کے لئے کیا کیا حربے اختیار کیے گئے۔ کیا مجرم اپنے اس خوفناک مشن میں کامیاب ہو گئے..... یا.....؟

اس کہانی کی ہر ہر سطر میں خوفناک ایکشن اور اس کے لفظ لفظ میں اعصاب شکن سسپنس موجود ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو یقیناً اس سے پہلے صفحہ قرطاس پر نہیں ابھری۔ اس کہانی کا پلاٹ اس قدر منفرد ہے کہ پہلے دنیا بھر کے جاسوسی ادب میں کہیں نظر نہیں آیا۔ **عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس** نے اس کہانی میں کیا کردار ادا کیا ہے جہاں دنیا بھر کی حکومتیں اور سیکرٹ سروسز خوف و دہشت سے کانپ رہی ہوں جہاں موت کے بھیا تک جبرٹوں نے دنیا میں بسنے والے ہر فرد کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہو وہاں عمران اور سیکرٹ سروس کے جیالوں نے کیا رنگ دکھائے۔ یہ عمران کی زندگی کا وہ لافانی اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ جس پر آج بھی عمران کو فخر ہے اور کیوں نہ ہو، یہ کارنامہ ہے ہی ایسا.....

کاغذی قیامت کتاب گھر کے **جاسوسی ناول سیکشن** میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اور اس کے بعد میری زندگی کے سب سے بھیا تک دور کا آغاز ہو گیا۔ انہوں نے دوبارہ مجھے بینائی سے محروم کر کے طویل مسافت کے بعد کسی لاش کی طرح ایک پہاڑی پر ڈال دیا۔ کوئی بیس روز کی مسافت کے بعد میں نے خود کو تپتے سورج کی روشنی میں تاحد نظر لوق ودق، بے آب و گیاہ پہاڑیوں پر پایا۔ دُور دُور تک آدمی کا نشان نہیں تھا۔ دُور دور تک کوئی درخت نظر نہیں آتا تھا۔ شدید دھوپ، تیز گرم ہوا اور وحشت ناک تنہائی تھی۔ پہلی ہی ساعت میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں زندگی کی گاڑی کھینچنا ناممکن ہے، بھورے رنگ کی ان چٹانوں میں قبرستان کا سا سکوت طاری تھا۔ وہاں کوئی سایہ نہیں تھا۔ صرف چٹانوں کا سایہ تھا۔ قدرت نے ان چٹانوں کو ہر قسم کی نعمت سے محروم کر دیا تھا۔ ایک نظر ارد گرد دوڑانے کے بعد ہی کوئی شخص حوصلہ ہار بیٹھے۔ یہ ریاضت کی کون سی جگہ تھی اور یہاں مجھے کس نوع کی ریاضت کرنی چاہئے تھی، میں حیران و پریشان تھا۔ مجھے یاد آیا کہ زارشی کا نام سن کر رورویا کے چہرے پر بخد کر کے آثار نظر آئے تھے۔ یہ آزمائش گاہ بہت سخت ہوگی مگر اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہوگا کہ مجھے آسانی سے ہلاک کرنے کے لئے یہاں ڈال دیا جائے اگر مجھے ختم کرنا ان کا مقصد ہوتا تو وہاں انہیں کس نے روکا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو ہر طرح سمجھایا اور وہاں کے محل وقوع کا جائزہ لینے کے لئے ایک سمت چلنا شروع کر دیا۔ میں چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ یہاں ایک ہی بات مجھے اچھی لگی کہ وہ ہول ناک اندھیرا ختم ہو گیا تھا جس کی لپیٹ میں جزیرہ باگمان ہمیشہ رہتا تھا۔ یہاں دھوپ تھی، روشنی تھی، آگے بڑھنے کے ساتھ گرمی کی شدت کی وجہ سے مجھے پیاس لگنے لگی، اب میرا مقصد صرف پانی کی تلاش تھا۔ میں چٹانوں چٹانوں چلتا رہتا تھا اس کے شام ہو گئی اور طلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ پیاس کی شدت نے زیادہ تپایا تو مجھ سے آگے نہ چلا گیا۔ ایک چٹان پر بیٹھ کر میں نے نئے سرے سے حالات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہاں پانی بھی ہونا چاہئے اور انسان بھی، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ضبط نفس کا امتحان ہے، بے ہوشی اور ناتوانی سے پہلے مجھے اس کا کوئی حل ڈھونڈنا چاہئے آخر میں نے جارا کا کا کی کھوپڑی اپنے سامنے رکھی اور اشارے کے سکھائے ہوئے چند عمل پڑھ کر نتائج کا انتظار کرنے لگا۔ یکا یک مغرب کی سمت سے گردوغبار اٹھتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے کوئی غیبی اشارہ سمجھ کر اس طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ گردوغبار کے طوفان میں داخل ہو کر میرا سر چکرا گیا اور مجھے متلی ہونے لگی، میں جارا کا کا کی کھوپڑی ہاتھ میں پکڑ کر کسی امید میں آگے ہی بڑھتا رہا۔ میری امید برآئی۔ وہ طوفان تھا تو نشیب کی طرف مجھے پتھر کے چند مکانات نظر آئے۔ میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا اور میں نے گرتے پڑتے نشیب کی طرف اپنا وجود گرا نا شروع کر دیا۔ یہی صورت وہاں تک جلد پہنچنے کی تھی، مکانات پر سکوت طاری تھا۔ قریب پہنچ کر وہاں سے مجھے انسانوں کی بجھننا ہٹ سی سنائی دی، اندر کئی آدمی تھے جو کورس کے انداز میں کوئی عمل پڑھ رہے تھے وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ تین طرف دیواریں کھڑی تھیں اور ایک طرف سے کھلا حصہ تھا۔ میں بے تحاشا اندر داخل ہو گیا۔ وہ آگ کے گرد بیٹھے تھے۔

”صاحبو!“ میں نے فریاد کی۔ ”مجھے معاف کرو۔ میں تمہاری عبادت میں غل ہو رہا ہوں، مجھے زندہ رکھنے کے لئے پانی دو۔“

انہوں نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور پھر وہ ایک دوسرے کا منہ ٹکٹنے لگے۔ وہ سب کے سب برہنہ تھے اور بوڑھے تھے، ان کی کھالیں ان کے جسموں سے علیحدہ ہو کر لٹک رہی تھیں، چہروں پر خاک ملی ہوئی تھی۔

”صاحبو! اے تاریک براعظم کے برگزیدہ لوگو! کیا تم بھی اتنے شقی ہو؟ میری بات سنو، مجھے پانی کی ضرورت ہے، میں مر رہا ہوں۔“

میں نے دوبارہ منت کی۔

اُن میں سے ایک شخص نے اپنے قریب رکھا ہوا برتن جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا اور اپنے ہاتھ جلنے کی بھی پروا نہ کی، پھر اس نے پانی سے بھرا ہوا لبالب ہاتھ دراز کیا۔ میں اس کے قریب جانا چاہتا تھا لیکن اس کا ہاتھ دراز ہوتا گیا۔ تاہم میں نے پانی لے کر ان کی طرف بہ نظر استحسان دیکھا اور تمام تر عجلت کے سامنے اسے منہ سے لگا لیا۔ وہ صاف و شفاف خوشبودار اور سرد پانی تھا۔

”تمہارا شکریہ اے مقدس لوگو! جب تم اپنی عبادت سے فارغ ہو جاؤ تو میری طرف توجہ دے لینا۔ میں تمہاری دیوار کے سہارے یہاں لیٹا ہوں، میرے گلے میں جاراکا کا کی کھوپڑی ہے اور میں نے ہمیشہ نیکیوں کی طلب کی ہے میرا نامہ اعمال صاف ہے اور میں تمہاری مدد کا طالب ہوں۔“ وہ پھر اپنے عمل میں مصروف ہو گئے اور میں دیوار سے باہر چلا آیا اب مجھے کسی قدر سکون تھا کہ میں ایسی جگہ پہنچ گیا ہوں جہاں چند انسان موجود ہیں، ہر چند کہ وہ بوڑھے انسانوں میں شمار نہیں کئے جانے چاہئیں۔ رات ہو گئی اور وہ اپنی عبادت سے فارغ نہ ہوئے۔ میں نے پھر اندر جا کر دیکھا، وہ اسی طرف مصروف تھے جیسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ میں رات گئے تک ان کی فراغت کا انتظار کرتا رہا۔ انہیں چھیڑتے ہوئے جھجک ہوتی تھی، میں پھر دیوار کے سائے میں چلا گیا اور ان کی آواز پر کان لگائے رہا۔ خاصی رات گزر گئی اور مجھے بھوک نے پریشان کیا تو میں دوبارہ اندر گیا ان کے انہماک و استغراق میں سرمو کوئی فرق نہ آیا تھا۔ میں حیرت سے انہیں تنکے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میری موجودگی سے بے نیاز ہوں، میں نے پھر جرات کر کے کہا۔ ”دیوتاؤں کے عظیم فرزندو! کیا مجھے ہم کلامی کا شرف نہیں بخشو گے، مجھے اس علاقے میں ریاضت کے لئے بھیجا گیا ہے مجھے مشورہ دو کہ میں اپنا کام شروع کر دوں۔“

انہوں نے حسب سابق ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان کی توجہ پھر آگ کی طرف مرکوز ہو گئی۔

”مجھے بھوک لگی ہے، اپنا مبارک ہاتھ دراز کرو اور اس نفس کے غلام کے جنم کی آگ بجھانے کی کوئی سبیل کرو۔“

انہوں نے ایک اور برتن آگ میں ڈال دیا اور چشم زدن میں میرے لیے کھانا فراہم ہو گیا۔ میں اپنا کھانا اور پانی لے کر واپس آ گیا۔ وہ ایک لذیذ غذا تھی، میں اس کے مرکبات نہیں گنا سکتا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کن اجزاء کا مرکب تھی، صبح ہوئی، پھر شام ہوئی، پھر رات ہوئی، میں ان کے پاس جاتا اور کھانا طلب کرتا رہا لیکن وہ بوڑھے اپنی جگہ سے ایک انچ ہل کر نہیں دیے۔ یہاں تک کہ ایک ہفتہ گزر گیا۔ یہ مدت کم نہیں ہوتی۔ وہ میری خوشامد میری فریاد اور میری منتوں کے باوجود مجھ سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ مجھے میری خواہش پر کھانا اور پانی مل جاتا تھا اور بس، مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کبھی نہیں اٹھیں گے، یہ آگ روشن رہے گی۔ وہ اسی طرح عبادت میں مصروف رہیں گے اور میں یوں ہی بیٹھا رہوں گا۔ میں نے راستے کے نشانات متعین کر کے وہاں سے جانے کی ٹھانی۔ میں پتھروں کو ایک خاص ترتیب سے رکھتا ہوا آگے کی طرف بڑھتا رہا۔ کچھ کھانا میں نے بچا لیا تھا اور سیر ہو کر پانی پی لیا تھا۔ میں شام تک چلتا رہا۔ کھانا ختم ہو گیا اور پانی تو میرے پاس موجود ہی نہیں تھا میں اس سمت میں کئی میل سفر کر کے واپس آ گیا۔ دوسرے دن میں نے دوسری سمت پر اسی طرح سفر شروع کیا اور گھائیاں عبور کرتا ہوں دور تک چلا گیا۔ وہاں بھی مجھے زندگی کا کوئی نشان نہیں ملا۔ تیسرے دن میں نے جنوب کی سمت اختیار کی اور میری حیرت دو چند ہو گئی جب میں نے بہت دور جا کر چند آدمی اپنی طرف آتے دیکھے، اُن کے ہاتھ میں بڑے بڑے تھے اور جسموں پر بہت سے تھیلے لٹکے ہوئے تھے جیسے وہ دور دراز کے سفر کے بعد واپس آئے ہوں۔

ان کے جسم سیاہ اور چہرے گردوغبار سے اُٹے ہوئے تھے میں نے انہیں دُور سے دیکھ کر ہاتھ بلایا تاکہ وہ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، میرے جواب میں انہوں نے بھی ہاتھ بلایا مگر نیزے تانے رکھے، جب ہم قریب پہنچ گئے تو میں نے گفتگو میں پہل کی۔ ”دوستو! خوش آمدید۔ اس ویرانے میں زندہ انسانوں کو دیکھ کر مجھے دلی مسرت حاصل ہوئی ہے۔“

”تم کون ہو؟“ ایک دراز قد شخص نے آگے بڑھ کے کہا۔

میں نے اپنا نام اس علاقے میں آنے کا مقصد اور سب کچھ بے کم و کاست بیان کر دیا اور اس علاقے میں جو کچھ مجھ پر گزری تھی وہ بھی کسی جھجک کے بغیر بتا دیا۔ دراز قد شخص نے اپنی گردن کے ایک چمک دار پتھر پر راکھ ٹلی اور کچھ پڑھ کر اس میں دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس غیر دلچسپ حرکت میں مصروف رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”تو اس نے تمہیں یہاں بھیجنے میں عجلت کی۔ وہ ذلیل شخص، دیوتا اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اس نے جزیرہ باگمان پر ہر جگہ ڈکھ بودئے ہیں۔“

”تمہاری مراد کس سے ہے؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

”جزیرہ باگمان پر ایک شیطان کی حکومت ہے، کیا لوکاں ساکسی ایلین سے کم ہے؟“ اس شخص نے غصے سے کہا۔

”تم کون لوگ ہو؟ کیا یہ بھی میرا کوئی امتحان ہے؟ مجھے اس کی ناراضی کی سزائیں معلوم ہیں، ازراہ کرم مجھ سے اس کے بارے میں کچھ نہ پوچھو۔“ میں نے خوف زدگی کا احساس دلایا۔

”ہم اس کی دسترس سے دور ہیں، اسلذا پہلے ہی اس کی سازشوں سے زارشی چلا آیا تھا، زارشی جو مصیبت زدوں کی پناہ گاہ ہے، اسلذا دیوتاؤں کو راضی کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اُس سازشی سے بھینک انتقام لے گا۔“ اس نے گرج کر کہا۔

”اسلذا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”میں نے یہ نام سنا ہے، سنا ہے وہ لوکاں سے پہلے جزیرہ باگمان کا ناظم اعلیٰ تھا۔“

”میں اسلذا ہوں۔“ اس نے دلیری سے کہا۔

”تم اسلذا ہو؟ مقدس اقبال مجھ پر رحم کرے، کیا یہ سچ ہے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”تم جزیرہ توری کے سردار جابر بن یوسف؟ میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا اگر لوکاں سازش نہ کرتا تو تم میرے پاس آتے اور میں تمہیں بہت کچھ سکھاتا۔“ اس نے تاسف سے کہا۔

”کیا تم واقعی اسلذا ہو؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔ ”مگر تم اس ویرانے میں کیا کر رہے ہو؟“

”میں دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے اپنی راتیں، اپنے دن قربان کر رہا ہوں، معتب لوگوں کے لئے زارشی ہی ایک جگہ ہے۔“

”اقبالا تمہارا سہارا بنے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اگر تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے تو تم نے دیوتاؤں سے مدد کیوں نہیں چاہی، کیا وہ نہیں دیکھ رہی ہے، اس کی آنکھیں بڑی اور اس کے کان لمبے ہیں۔“

”دیوتا۔ کاش وہ ہر معاملے میں دخل دیا کرتے، میرا اعتماد میری غلطی تھی۔ مقدس اقبال کے لئے یہ انقلاب ایک تماشے کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اندھا ہو گیا تھا میری آنکھیں عقب کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں اسی لئے اس نے مجھے وہاں سے علیحدہ ہو جانے اور یہاں ٹھوکریں کھانے پر

مجبور کر دیا ہے، میرے ساتھ میرے وفادار ساتھی بھی چلے آئے، وہ نہ طاقت میں مجھ سے زیادہ تھا نہ علم میں، لیکن اس نے مجھے اعتماد میں لے کر میرے نادر تحائف پر قبضہ کر لیا جو مجھے سخت ریاضت کے بعد دیوتاؤں کی طرف سے ملے تھے۔ پھر اس نے مجھے انہی کے ذریعے پریشان کیا۔ میں دیوتاؤں کے تحائف کی حفاظت نہ کر سکا اور مقدس لوریماس کے قبضے میں چلی گئی۔“

”کاش میں تمہاری کوئی مدد کرتا۔ مجھے ایک لڑکی نکری کے ذریعے اشارتاً یہ اندازہ ہوا تھا کہ تم وہاں کے مقبول و محبوب ناظم اعلیٰ تھے۔“ میں نے یہ یقین کر کے کہا کہ وہ واقعی اسٹالا ہے۔

”تم اپنی تربیت مکمل کرلو۔ ہم انہی ویرانوں میں تم سے ملتے رہیں گے۔ یہاں دیوتاؤں کے نائب ہوتے ہیں، یہاں کی ریاضت بڑی سخت ہے تم جس جگہ سے آرہے ہو، ایسی بہت سی جگہیں اس علاقے میں ملیں گی، جاؤ ان کے پاس واپس چلے جاؤ اور ان کے اشاروں پر سر جھکانا سیکھو، ممکن ہے تمہاری تربیت ختم ہونے سے پہلے ہی میں جزیرہ باگمان واپس ہو جاؤں ورنہ تم مجھے یہیں ڈھونڈ لو گے۔ میرا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے میں ان سب کے پاس جا رہا ہوں اور نہ جانے یہ سفر کب ختم ہو۔“

”مگر وہ مجھ سے بات نہیں کرتے۔ وہ شب و روز اپنے عمل میں مصروف رہتے ہیں، میں ان سے جو چیز طلب کرتا ہوں، مجھے مل جاتی ہے، چارونا چار تین دن سے تین سمتوں کی طرف گھوم رہا ہوں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”تم ان کے ساتھ عمل میں شامل ہو جاؤ اور اسی طرح ریاضت کی عادت ڈالو۔ یہ ایک سخت کام ہے لیکن اس نے تمہیں اسی مقصد سے یہاں بھیجا ہے، یوں تم ایک خوش نصیب شخص ہو۔“

”میری ریاضت کی یہ مدت کب ختم ہوگی؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”کسے پتہ ہے۔ بس تم جاؤ اور دیوتاؤں کے ان مقربین کی خدمت کے لئے وقف ہو جاؤ۔“

میں اسٹالا اور اس کے ساتھیوں سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ اتنی باتیں کر کے آگے بڑھ گئے اور میں اس دیوقامت، عجیب شخص کے بارے میں عجیب خیالات لیے ہوئے واپس چلا آیا۔ میری منزل پھر وہی پراسرار مکان اور اس کے مکین تھے جو نہ جانے کب سے آگ کے گرد بیٹھے دیوتاؤں کو خوش کر رہے تھے، دور سے وہ مکان دیکھ کر اس شدید گرمی میں سردی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے سوچا جابر بن یوسف! تمہاری ایک زندگی اُسی وقت ختم ہو گئی تھی، جب تم بیروت سے روانہ ہوئے تھے یہ تمہاری دوسری زندگی ہے جو تمہارے بس میں نہیں ہے، خود کو حالات کے سپرد کرو اور سوچنا چھوڑ دو، وہ شخص مرچکا ہے جو بیروت میں تھا۔ جابر بن یوسف تو ایک اور شخص ہے میں نے دیوتاؤں کا خاص جام نوش کیا ہے یہ سوچ کر میری آنکھیں سرخ ہو گئیں، اسٹالا کو ان ویرانوں میں عبرت ناک حالت میں دیکھ کر کچھ اور اداسی طاری ہوئی مجھے خیال آیا کہ وہ کبھی واپس نہ جاسکے گا کیونکہ لوکا سا بہت مضبوط اور چالاک ہے۔ پھر میرے دل میں کہیں سے یہ مذموم خیال آیا۔ ”اگر میں اسٹالا کی گردن لوکا سا کی خدمت میں پیش کروں۔ تو.....“ بوڑھوں کی اقامت گاہ قریب آگئی تھی۔ میں تیزی سے مکان میں داخل ہو گیا۔ آگ روشن تھی اور وہ بوڑھے گدھ حلقہ بنائے اسی طرح بیٹھے تھے جس طرح میں انہیں چھوڑ گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

میں ایک دیوار کے سہارے اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ زارشی کے صحراؤں کے وہ برگزیدہ بوڑھے حسب معمول گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر قفس کرتے ہوئے شعلوں کے سامنے اپنی عبادت و ریاضت میں مصروف تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کی عبادت کب ختم ہوگی۔ یہ آگ کب تک روشن رہے گی؟ اس بے آب و گیاہ سرزمین میں کوئی کسی کا پُرساں حال نہ تھا۔ اس زمین پر انسانوں کی پیداوار نہیں ہوتی تھی۔ جزیرہ باگمان کا سابق ناظم اعلیٰ اسٹالا اور اس کے جاں نثار یہاں کی جیتی جھلتی دھوپ میں دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی جستجو میں بھٹک رہے تھے۔ تاحد نظر نامہربان زمین تھی۔ ریت ہی ریت، دھول ہی دھول، اونچے نیچے ٹیلے۔ نہ کوئی منزل نہ منزل کا نشان۔ میں دیر تک بوڑھوں کی لرزہ خیز ریاضت دیکھتا رہا۔ ان کے قریب جا کر اور اس مکان کی ہیئت دیکھ کر مجھے اپنی ناگوں میں لرزش سی محسوس ہونے لگی۔ کیا مجھے ان میں شامل ہو جانا چاہئے؟ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ میں نے ایک بار پھر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا اور با آواز بلند کہا۔ ”میں پھر تمہارے مقدس مسکن میں آ گیا ہوں، اے نیک باطن لوگو! کچھ میری طرف توجہ کرو! مجھ خستہ حال کو تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔ مجھے آگے کا راستہ نظر نہیں آتا۔ یا پھر مجھے اجازت دو کہ میں بھی تمہارے ساتھ اس مقدس آگ کے گرد ریاضت کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں؟“

شاید اُن تک میری آواز نہیں گئی۔ اُن کے جمود میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں نے دوبارہ ان سے فریاد کی لیکن ان کے جسوں میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوا۔ پھر میں نے عاجزی سے کہا۔

”اے مقدس نفس کشو! دوسرے کے نفس کا خیال تو کرو۔ اس نیکی سے تمہارے حساب میں اور اضافہ ہوگا۔“

میرے خیال تھا کہ میں اپنی چیخ، پکار اور داد و فریاد سے انہیں اپنی طرف متوجہ کر سکوں گا۔ میری بات پر اُن میں سے ایک بوڑھے نے حسب سابق آگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کا ہاتھ آگ سے نکل کر مجھ تک دراز ہوا اور زمین پر خوان نعمت اور آب شیریں رکھ کر مختصر ہوتا گیا۔ انہوں نے میری کیا خوب داد دی تھی۔ انہوں نے اپنے در پر بھونکنے والے کتے کو رات بفرام کر دیا تھا۔ میں کھانا چھوڑ کر دیوار کی پشت پر چلا آیا۔ دیوار کے سائے میں کچی زمین پر سر کے نیچے پتھر رکھ کر میں نے خود کو گرا دیا۔ اس تنہائی اور بے یقینی کے عالم میں میرے دل میں کئی طوفان آئے اور گزر گئے۔

اُدھر اندر ایک ابدی آگ روشن تھی۔ ادھر میرے دل میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ میرے انتشار نے مجھے کئی راستے دکھائے۔ میں کہیں اور جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ ان شفیق بوڑھوں کی موجودگی میں زندہ رہنے کی کوئی صورت تو نظر آتی تھی۔ اسٹالا کی ہدایت کے مطابق ان میں شامل ہو جانے میں ایک خوف مانع تھا۔ ان کی ناراضی سے بچنے کے لئے اجازت لینی ضروری معلوم ہوئی تھی۔ مجھے ان کی بزرگی اور سریت کا اندازہ تھا، مگر انہوں نے میرا کوئی استفسار درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ اپنے کام میں مشغول رہے۔ اپنے ذہن میں ابھرتے ہوئے بہت سے جوابوں کی نفی کر کے مجھے حاصل میں ایک ہی جواب ملا کہ مجھے ان کے قریب جانا چاہئے اور خطرہ و اندیشہ کا یہ وتیرہ چھوڑنا چاہئے، اگر وہ اسے ناپسند کریں گے تو جھڑک دیں گے۔ اگر وہ کوئی مزاحمت نہ کریں گے تو میں اس ابدی آگ کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو جاؤں گا۔ پھر یہ نہیں کیا ہو؟ ممکن ہے میں کوئی..... لیکن میں نے مستقبل کی خوش فہمیاں پاس نہ پھٹکنے دیں اور خود کو اس آگ کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

جب میں دوبارہ اندر داخل ہوا تو مجھے کنارے پر وہ غذا نظر آئی جو انہوں نے تھوڑی دیر پہلے مجھے عطا کی تھی۔ خیال آیا کہ بہتر ہے آگے بڑھنے سے پہلے، یہ غذا جزو بدن بنائی جائے۔ اگر وہ ناراض ہو گئے تو میں اس سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔ میری حریصانہ نظریں پتھر کے اس برتن پر پڑیں جس میں لذت بخش غذا موجود تھی۔ ساتھ ہی پانی کا ایک قدح بھی۔ اس ریگ زار میں پانی دیکھ کر آنکھوں میں تراوٹ آ جاتی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر اپنا حلق تر کرنا چاہا، دفعۃً مجھے احساس ہوا، یہ کم ہمتی اور نرم دلی کی بات ہے۔ جھنجھلاہٹ اور غصے میں میں نے اسے زمین پر پھینک دیا۔ پانی فوراً پیاسی زمین میں جذب ہو گیا۔ پھر میں نے غذا کے برتن کو ٹھوکر مار کر الٹ دیا اور مڑ کر ان بوڑھوں کی طرف دیکھا۔ وہ میرے ہر ہيجان اور ہذیان سے بے نیاز تھے اور زیر لب کوئی عمل پڑھنے میں ہمہ انہماک مستغرق تھے۔ ان کی ملی جلی آوازوں کا شور سن کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کہیں دور پہاڑ کی چوٹی سے آبشار گر رہا ہے۔ ان کے چہروں اور جسموں کی لنگی ہوئی کھالوں میں اسرار پنہاں تھے۔ میں نے جارا کا کا کی کھوپڑی اور کاہن اعظم سمورال کی دی ہوئی مالا چومی اور اشار کا سکھایا ہوا ایک ورد پڑھ کر پورے جوش سے آگے بڑھا۔ وہ لوگ آگ کے گرد بہت کم درمیانی فاصلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اُن کے درمیان کسی طرح نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ جب میں حلقے کے نزدیک پہنچا تو میں نے ایک بار پھر انہیں مخاطب کیا۔ ”تاریک براعظم کے عظیم اور مقدس بزرگو دیوتاؤں کے لئے میری بات سنو، میں تمہارے حلقہ ارادت میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ اب جو بھی ہو، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ وہ دیکھ رہی ہے کہ یہ سب میں کس کے لیے کر رہا ہوں، وہ اتنی ہی حسین اور عظیم ہے کہ اس کے ارادت مند بے خوف و خطر آگ میں کود پڑیں۔“

میں ان کے استغراق میں کوئی خلل نہ ڈال سکا۔ انہوں نے میری پیش قدمی پر کوئی مزاحمت بھی نہیں کی۔ میں حلقے کے قریب بیٹھ کر غور سے ان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ ذہن نشین کرنے لگا۔ وہ زبان میری سمجھ سے بالاتھی اور چونکہ وہ یک زبان ہو کر اپنا عمل دہرا رہے تھے اس لیے مجھے اور دشواری ہو رہی تھی۔ اپنی سماعت اور ذہن کی تمام صلاحیتیں میں نے ان کے الفاظ سمجھنے پر مرکوز کر دیں۔ وہ ایک طویل عمل تھا۔ ان کی آوازیں اس قدر گتھی ہوئی اور گندمی ہوئی تھیں کہ کئی ساعتیں بیت گئیں، میں کچھ نہ سمجھا۔ اسی لیے میرے اور ان کے عمل میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ میرے خیالات بھی بہک بہک جاتے تھے۔ میں انہیں سینٹا تھا اور وہ بکھر جاتے تھے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت نہ جارا کا کا کی کھوپڑی کوئی مدد دے رہی تھی نہ اشار کے سکھائے ہوئے چھوٹے موٹے عمل، نہ سمورال کی مالا۔ اس کشمکش میں لرزہ بر اندام کر دینے والی کئی کیفیتیں مجھ پر طاری ہوئیں اور میں نے تیزی سے ان کے الفاظ کی تکرار شروع کر دی۔ پھر میں نے انہیں علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کر کے یکے بعد دیگرے ایک ایک حصہ از بر کر لیا۔ اب ان کی بلاغت، ہم آہنگی صوتی نشیب و فراز ذہن میں منتقل کرنا رہ گیا تھا۔ دوسرا کام پہلے کام سے زیادہ مشکل نہیں تھا جب میں نے دوسری صبح تک اس پر بھی عبور حاصل کر لیا تو مجھ پر فتح مندی کا سانسہ چھا گیا۔ میں ان کے حلقے کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا، ان کی بے خبری اور عدم مزاحمت سے میرا جنون کچھ اور سوا ہوا۔ میں نے حبشیوں کے مخصوص انداز میں ایک چیخ ماری۔ ایک فلک شکاف نعرہ۔

”مجھے جگہ دو! شریف انسانو!“ میں نے عزم کے ساتھ کہا اور پہلی بار ان کے لب ساکت ہوئے۔ ان میں سب سے معمر شخص نے وظیفہ توڑ کر اپنے دوسرے ساتھیوں سے کچھ کہا جس پر انہوں نے اس کے ہاتھ چومے اور پھر اچانک کسی تاخیر کے بغیر وہ شخص اٹھا۔ اس کی کھال بدن پر جھول رہی تھی۔ دوسرے بوڑھوں نے پھٹی پھٹی آوازوں میں ہذیان بکنا شروع کر دیا۔ ان کا سب سے معمر ساتھی دیکھتے ہی دیکھتے آگ میں کود گیا۔

آگ کے گرد بوڑھوں کا دائرہ ٹوٹ چکا تھا اور شاید وہ سب اپنے ساتھی کا جشن مرگ منا رہے تھے، وہ اپنے ہاتھ بار بار بلند کرتے تھے اور اپنے ماتھے چھو کر ہاتھ ٹانگوں تک لے آتے تھے۔ مجھے اپنی ناک بند کرنا پڑی، لاش کی چراند سے دماغ مآؤف ہوا جاتا تھا۔ لاش لحوں میں جل بھن کر آگ میں شامل ہو گئی۔ اسی وقت ایک بوڑھے نے اپنی آگ اگلتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب حلقے میں بیٹھنے کے لئے میری جگہ خالی ہو چکی ہے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور انہوں نے کوئی دم لیے بغیر اپنا عمل جاری کر دیا۔ اس بار ان کی آوازوں میں میری آواز بھی شامل تھی۔ آگ کی تمازت اور حدت جلد ہی میری مینائی پر بوجھ بننے لگی۔ شروع شروع میں میری توجہ اس طرف مرکوز رہی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ بے شمار وسوسے یکسوئی میں حارج ہونے لگے۔ میں وہیں بیٹھے ہوئے کبھی جزیرہ باگمان پہنچ جاتا اور کبھی جزیرہ توری۔ لوریم، لوکاسا، کاہو اور اسٹالا، ان سب کی صورتیں اپنے پس منظر کے ساتھ پردہ ذہن پر نمودار ہوتیں اور مجھے کچھ کرنے پر اکستاتیں، میری آنکھیں بار بار کھلتی اور بند ہو جاتیں۔ زبان بار بار رکتی پھر ورتی شروع کر دیتی۔ کچھ دیر پورے دھیان اور توجہ سے میں بوڑھوں کے ساتھ عمل پڑھتا، پھر لحوں میں وحشتیں دوبارہ مجھ پر غالب آ جاتیں۔ میں خود سے سوال کرتا۔ ”جابر بن یوسف! تمہارے اندر حوصلہ نہیں ہے تو تم بھی آگ میں کود جاؤ۔“ کسے معلوم ہے کہ یہ ریاضت کب ختم ہو اور کس نے وقت مقرر کر دیا ہے۔ تمہاری کھال بھی جھول جائے گی۔ یہ جنون نہیں تو اور کیا ہے۔ اس جنون سے بہتر موت ہے، اگر اس ریاضت کا کچھ مآل نہ نکلا تو تم نے اذیتوں میں وقت ضائع کر دیا۔ ہو سکتا ہے صدیاں بیت جائیں۔ تمہارے چہرے کے نقوش بھی آگ کی تپش سے تپ کر بھر بھر جائیں۔ ممکن ہے کل تم بھی ان بوڑھوں کی طرح اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت کھو بیٹھو۔“

لیکن یہ صرف منتشر اور پراگندہ خیالات تھے جن کی آمد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی تھی۔ آدمی کا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا دشمن اس کا ذہن ہے۔ اس ضدی، خود سر، حساس، نازک مزاج اور خوف زدہ چیز کے بغیر آدمی درختوں کی طرح خوش رہتا اور پتھروں کی طرح مطمئن زندگی گزارتا۔ دل چاہتا تھا کہ وہاں سے اٹھوں اور دور بھاگ جاؤں۔ مگر بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔ اس امتحان گاہ میں کامیابی سے پہلے چھٹکارا پانا محال تھا۔ سو میں نے خود کو بھلا دیا۔ ان سب کے چہرے بھلا دیے جو مجھ سے متعلق تھے۔ صرف ایک چہرہ یاد تھا۔ وہ غیرت ناہید چہرہ۔ میں نے خود کو زمان و مکاں کی فکر سے آزاد کر کے حالات کے سپرد کر دیا۔ اول اول کچھ پریشانی ہوئی۔ پھر میں پوری طرح ڈوب گیا اور مجھے شب و روز اور زمین کی گردش کا احساس نہ رہا۔ بھوک پیاس کی حس مٹ گئی کسے ہوش تھا کہ میں کتنی مدت تک جذب کی کیفیتوں سے دوچار رہا۔ کتنے ہفتے، کتنے مہینے، کتنے سال ان بزرگوں کی معیت میں اور اس آگ کے گرد میں نے گزارے؟ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ ہاں مجھے اس وقت کچھ احساس ہوا جب ایک دن میری طرح ایک شخص نے اس مکان میں داخل ہو کر ہم سے مدد طلب کی۔ اس کی پڑمردہ آواز پر میرے ہاتھ خود بخود قریب رکھے ہوئے برتنوں پر گئے اور میں نے آگ میں انہیں ڈال دیا۔ لحوں بعد مشینی انداز میں، میں نے آگ کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ برتن نکالے۔ برتن غذا اور پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے اس شخص کی طرف اپنا ہاتھ بلند کیا۔ میرا ہاتھ دراز ہوتا گیا اور تھکے ہوئے مسافر کو غذا پہنچا کر اپنی اصل حالت میں آ گیا۔ اس کے بعد وہ مسافر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اور بوڑھوں کے متحرک لب خاموش ہو گئے۔ ان کی جھنجھٹا ہٹ رگ گئی۔ ان سب کی نظریں میرے چہرے پر پکی ہوئی تھیں۔ جیسے میں اب بھی ان کے لئے اجنبی ہوں۔ وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اچھلنا شروع کر دیا۔ ماحول میں ایک بار

پھر زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر ایک بوڑھے نے اپنے ہاتھ میں ایک شعلہ اٹھایا اور اسے میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ یہ دکھتا ہوا انگار میری ہتھیلی پر آتے ہی آنا فانا ایک چمکدار موتی کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ میں ریاضت میں اس وقفے کے متعلق کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک بوڑھا اپنی نیم جاں آواز میں پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”تم یہاں سے جاؤ۔ تمہارا کام پورا ہو گیا۔“

میں بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔ ”مقدس بزرگ! میں اپنا کام پورا ہو جانے کے بعد بھی یہاں سے نہیں جانا چاہتا۔ یہاں بڑا سکون ہے۔ اس ریاضت کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ ترک لذت اور ضبط نفس میں کیا لطف اور کیسا نشہ ہے۔ میرا ذہن تازہ اور میرے حواس اس تمام عرصے میں سکون سے رہے ہیں اور میں نے اس عالم میں ان گنت دنیاؤں کی سیر کی ہے۔ مجھے اپنے ساتھیوں میں شمار کرو۔ تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ، مجھے اس سرفراز آگ میں جھونک دو مگر باہر مت بھیججو۔“

”نہیں نہیں۔“ اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ آ گیا ہے۔ اب یہاں تمہاری کوئی ضرورت نہیں رہی۔ وہ ہمیشہ کے لئے آیا ہے۔ تم عارضی قیام کے لئے آئے تھے۔ تمہارے پاس شپالی ہے جو تمہاری کامیابی اور اقبال مندی کی ضمانت ہے۔ تم یہاں سے جاؤ اور اس بوڑھے کو یہاں بیٹھنے دو جس نے بقا کا فیصلہ کیا ہے۔“

میں نے اس معمر اجنبی کی طرف دیکھا جو شکل و صورت سے کوئی بہت برگزیدہ شخص معلوم ہو رہا تھا۔ وہ حسرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے میرے اٹھنے کا انتظار ہو۔ بوڑھا صرف ایک بات کی تکرار کر رہا تھا کہ مجھے جلد از جلد یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی اور سوال کرتا اس نے اجنبی شخص کی طرف اشارہ کیا، وہ تیزی سے ان کے رقص میں شامل ہو گیا میں بھی اس بے ہنگم رقص میں ان کی تقلید کرنے لگا۔

اچانک وہ بیٹھ گئے اور میری جگہ پر تیزی سے اجنبی شخص نے قبضہ جما لیا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اب میں زندہ لوگوں کی بستیوں کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں حیران پریشان اسے دیکھتا رہا۔ اب وہاں میرے بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا صبر آزماء عمل دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ میں کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے گوگو کے عالم میں حلقے سے باہر آ گیا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے راستے امتحان اور رہنمائی کے لئے چیخ چیخ کر کہا لیکن وہ میری کسی بات کا جواب نہ دے سکے اور مجھے گردن جھکائے مکان سے باہر واپس آنا پڑا۔ میرے ہاتھ میں وہ نادر ہیرا موجود تھا جسے بوڑھے نے شپالی کا نام دیا تھا۔ مکان کے احاطے سے نکل مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے خاصا بڑا وقت ان لوگوں کے ساتھ گزار دیا ہے۔ میری داڑھی بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی اور میرا جسم خاک اور دھول میں اٹا ہوا تھا۔ بالوں میں اتنی خشکی اور گرد جمی ہوئی تھی کہ مجھے اپنا سر ایک وزنی بوجھ کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ میری کھال ان بوڑھوں کی طرح نہیں جھول رہی تھی لیکن اس میں کھر دراپن آ گیا تھا۔ مجھے اپنے اس حلیے سے وحشت سی ہونے لگی۔ اپنی روح اس بدنما جسم سے علیحدہ کرنے کی خواہش شدت سے میرے دل میں جاگزیں ہوئی لیکن اس تمام وحشت ناک حلیے کے باوجود ایک توانائی تھی جو مجھے اپنے اندر محسوس ہوتی تھی۔ میں انگڑائیاں لیتا ہوا ایک سمت چل پڑا۔ کچھ ہی دور گیا ہوں گا کہ شدید دھوپ نے میرا جسم جھلسنا شروع کر دیا۔ جو ایک عرصے تک آگ کے گرد بیٹھا رہا تھا۔ اس دھوپ سے بچنے کے لئے چار سو دوڑنے لگا۔ مگر وہاں کوئی سایہ نہیں تھا۔

یہ سب کیا ہوا؟ وہ تو بے ہوشی کا زمانہ تھا۔ میں کچھ عرصے کے لئے مر گیا تھا۔ دوبارہ زندہ ہو گیا۔ میں تندور میں سویا ہوا تھا۔ یہ کیسی مشقت تھی جس کی کمائی کا مجھے احساس تک نہیں؟ کیا اتنے دنوں کی بے ہوشی کا معاوضہ صرف ایک شعلہ آتش تھا؟ کیا میں نے اپنی زندگی کے لمحات کم کر لیے؟ میں ان بوڑھوں کے متعلق سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ممکن ہے میرے نفس کی آزمائش کا دور ختم ہو گیا ہو اور حسین اقبال کے ربط خاص کی وجہ سے مجھے اذیتوں کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔ کاش میری ابتلا کا یہ زمانہ اب ختم ہو جائے۔ وہ میرا دل چیر کر دیکھ لے۔ اس میں صرف وہ موجود ہے۔ اُس کے سوا کوئی احساس نہیں ہے پھر یہ رسی امتحان وابتلا کیوں؟ وہ سب کچھ جانتی ہے تو اسے بار بار میرے باطن کا ثبوت کیوں مطلوب ہے؟ یہ کیسا مذاق ہے جس نے ایک سلجھے ہوئے شخص کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

بے سمت، بے راہ گھومتے ہوئے مجھے تین دن ہو گئے بھوک کب تک نہ لگتی؟ اب میں عالم بیداری میں گرفتار تھا۔ شپالی ابھی تک میری مٹھی میں بند تھا۔ مجھے اس کی طاقتوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ جب میں تھک کر نڈھال ہو گیا تو میں نے اپنا پُر اسرار تختہ آزمانے کی کوشش کی۔ سمورال کی مالا جس سے روشنی کی کرنیں پھوٹنے لگتی تھیں، بوڑھوں کی خانقاہ میں ماند پڑ گئی تھی لیکن اب بوڑھوں کی اقامت گاہ بہت دور نکل گئی تھی۔ میں نے یہ اسلحہ آزمایا تو میری خواہش کے مطابق کاہن اعظم کے عطیے نے میری مدد کی۔ میں ایک سمت ہولیا۔ اسالا بھی ان تین دنوں میں مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے گمان گزرا کہ کہیں معزول اسالا جزیرہ باگمان واپس نہ پہنچ چکا ہو۔ اگر یہ بات درست ثابت ہوئی تو جزیرہ باگمان سے میری واپسی جلد ممکن ہو سکے گی، بصورت دیگر بد قماش اور ظالم لوکا سا میری واپسی پر کسی خوشی کا اظہار نہیں کرے گا۔ میرے ذہن میں ایک بار یہ خیال بھی آیا تھا کہ اگر میں اسالا کو زیر کر کے اس کا سر لوکا سا کی خدمت میں پیش کروں تو اس کی مہربانیوں کے دروازے مجھ پر کھل جائیں گے لیکن یہ غیر شریفانہ بات ہوتی۔ جابر بن یوسف الباقرق خود سے ایسے کردار کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ اسالا سے جزیرہ باگمان کے عوام بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ سب سے افسوس ناک اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ لوریمیا کے نازک اندام سرپا پر لوکا سا جیسے کریہہ شخص کا تصرف تھا۔ یہ امر مجھ جیسے شخص کے لئے سخت ناقابل برداشت تھا۔ طویل راستوں پر میں منصوبے بناتا اور انہیں رد کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دل میں ایک کھلی مچی ہوئی تھی۔ اس برا عظم کے افسوس میں زندگی گزارنا ہی مقدر ہے تو پھر ایسی زندگی گزار دی جائے کہ یہاں کے لوگ یاد رکھیں، ایک شخص مہذب دنیا سے آیا تھا، اس کا نام جابر بن یوسف الباقرق تھا۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس نے سب کچھ حاصل کیا اور ایک انقلاب برپا کر دیا۔

مگر یہ بعد کی باتیں تھیں، اس وقت پیٹ کی اشتہا مٹانے اور راستہ ڈھونڈنے کا مسئلہ تھا۔ میں ٹیلوں اور غاروں میں زندگی کے آثار تلاش کرتا ہوا چلتا ہی رہا۔ خاصی دور جانے کے بعد اچانک میری بائیں جانب گردوغبار کا بڑا طوفان اٹھنے لگا۔ یہ طوفان کسی ہنگامے کا پیش خیمہ تھا۔ اس سے پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ میرا دل متزلزل ہونے لگا۔ یقیناً اسالا اس طوفان سے برآمد ہوگا۔ میں نے طوفان کی سمت بھاگنا شروع کر دیا۔ لحوں کی دیر تھی کہ گردوغبار کے اس انبوہ نے مجھے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ مٹی کے ذرات آنکھوں اور نتھنوں میں گھس رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں ہتھیلیاں چہرے پر جمالیں۔ میری داڑھی دو طرف پھیل گئی تھی۔ ہوا کے جھکڑ اتنے شدید تھے کہ مجھے اپنے پیر جمانے مشکل ہو گئے۔ دو تین بار میں نے خود کو سنبھالا مگر پھر میرے قدم اکھڑ گئے۔ ہوا کے ایک زبردست ریلے نے پوری شد و مد سے آکر مجھے زمین سے اٹھالیا اور میں کسی

حقیر تنکے کی طرح ہوا کے اشاروں پر ناپنے لگا۔ سنگلاخ پہاڑیوں پر لڑھکنے سے مجھے جوازیت ہوئی، اس سے میری چیخیں نکل گئیں کچھ لمحوں بعد طوفان کی شدت کم ہوئی تو میں نے خود کو نشی علاقے میں پڑا پایا جہاں دُور ایک جھونپڑی نظر آرہی تھی اور فضا میں ایک ماتم سا رہا تھا۔ کسی عورت کے رونے کی آواز طوفان کی آواز سے مل کر دل دہلائے دیتی تھی۔ ہر سمت سے گریہ وزاری کی آواز ابھر رہی تھی۔ کوئی بہت ہی دردناک انداز میں رورہا تھا۔ اس طوفان اور ریزگار میں جھونپڑی دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں میں جلدی سے اٹھا اور اسی جانب چل دیا۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے جانے کے بعد آہ وزاری کی سمت کا تعین کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں کسی جھک کے بغیر جھونپڑی میں داخل ہو گیا اور میرے قدم نمند ہو گئے۔ جب میں نے وہاں ایک چڑیل کی سی شکل کی عورت دیکھی اور ایک شیر خوار بچہ اس کی آغوش میں پڑا دیکھا بچہ ماں سے بُری طرح چپٹا ہوا تھا۔ عورت ہڈیوں کا پنجر نظر آتی تھی۔ اس کے برعکس شیر خوار بچہ خاصا صحت مند اور خوب صورت نظر آتا تھا۔ اس چھوٹی سی جھونپڑی میں ان کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ عورت کمر جھکائے بیٹھی بُری طرح بین کر رہی تھی۔ اس نے میری طرف جلتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی ہڈیوں میں پہلو بدلنے سے کڑکڑاہٹ کی آواز بلند ہو کر صحرائیں کہیں گم ہو گئی۔ اس کی نظریں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں لیکن ان میں پُراسرار چمک تھی۔ میں ان نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ مجھے جھرجھری آگئی۔ اسی لمحے عورت کی نحیف و زار آواز ابھری۔ اس نے روتے ہوئے کہا: ”اوہ۔ تو اُس نے مجھے معاف کر دیا۔ اجنبی مجھ پر رحم کرو۔ مجھے جلد از جلد اس عذاب سے نجات دلاؤ۔ کتنے سال گزر گئے۔ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ۔ تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

”تم کون ہو؟“ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
 ”میں ایک گنہگار ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک دن تم آؤ گے اور مجھے سزاؤں سے نجات دلاؤ گے۔ جلدی کرواے مقدس شخص!“ اس نے چیختے ہوئے کہا۔ ”اب مزید برداشت محال ہے۔“
 ”تم کیا چاہتی ہو؟“ میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔
 ”میں تم سے ظلم کی خواہش مند ہوں، اس ظلم میں میری عافیت ہے۔ یہ میرا گناہ ہے۔ تم اسے قتل کر کے اس کے خون کے چند قطرے میرے حلق میں پکادو۔ مجھے سکون آجائے گا۔“ اس نے وحشت زدگی سے کہا۔ ”یہی دیوتا چاہتے ہیں۔“
 ”کیا یہ تمہارا بچہ ہے؟“ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا اور مجھ سے چیخ چیخ کر مطالبہ کرنے لگی کہ میں اس کے بچے کو قتل کر دوں۔ وہ دیوتاؤں کا واسطہ دے رہی تھی۔ اتنے چھوٹے سے بچے کو قتل کرنے کا تصور بھی میرے نزدیک گناہ تھا۔ میں اب ایک غیر مہذب دنیا کا باشندہ تھا لیکن اتنا شقی القلب نہیں تھا۔ میری ہچکچاہٹ اور تردد دیکھ کر وہ عورت پھر رونے لگی۔ جانے یہ کیا راز تھا۔ میرے لیے یہ لمحات بڑے جاں گسل تھے۔ عورت مسلسل بین کر رہی تھی۔ اگر یہ کوئی امتحان تھا تو یہ تمام امتحانوں سے سخت تھا۔ میری فہم و بصیرت سخت تردد سے دوچار تھی۔ میں اس معصوم بچے کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن عورت جارا کا کا، مقدس اقبال اور دیوتاؤں کا واسطہ دے رہی تھی۔

”تم مجھ سے کوئی اور مدد چاہو۔ میں ایک معصوم بچے کو قتل نہیں کر سکتا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”اقتدار کے لئے جبر اور ظلم کی خولازم ہے اے نیک آدمی۔“ عورت نے یہ فلسفیانہ نکتہ مجھے تعلیم کیا۔

”میں تم سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ چند باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔“ میں نے تشویش سے کہا۔

”میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے تم تاخیر کر کے میرا عذاب سوا کر رہے ہو اور خود اپنے لیے کانٹے بھر رہے ہو۔“ عورت نے مکر وہ آواز

میں کہا۔ ”کیونکہ یہ کام تمہارے ہی لیے تفویض کیا گیا ہے۔“

”میرے لیے؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”میں تمہاری بات کا یقین کیسے کر لوں؟ ممکن ہے تم مجھے فریب دینا چاہتی ہو۔“

”تمہاری زارشی میں موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ تم اپنی فہم و فراست سے کوئی فیصلہ کرنے پر قادر ہو۔“ عورت نے ایک چبھتی ہوئی

بات کہی۔

میں تذبذب سے دوچار ہو گیا اور مجھے اسے بلائے ناگہانی سے نمٹنے میں دیر ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ ہو کہ آواز دوں لیکن مجھے ناکامی ہوئی

شاید دیوتاؤں نے میرا فیصلہ کسی رائے سے آلودہ نہ ہونے کے لئے پہلے ہی اس کا انتظام کر دیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ عورت نے مجھے جارا کا کا اور

مقدس اقبال کے ناموں کا واسطہ دیا ہے۔ اب فیصلے میں کیا دیر ہے۔ یہ عورت اور یہ بچہ مر جائے گا تو کائنات کی حرکت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔

میرے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی۔ یہ ایک اذیت ناک فیصلہ تھا۔ یہ صاف صاف قتل تھا۔ ہر چند کہ جزیرہ توری پر قدم رکھنے کے بعد انسانی جانوں کی

ہلاکت میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ انسان وہاں بڑے ارزاں تھے۔ میں نے بلکتی اور تڑپتی ہوئی اس عورت سے کہا۔ ”اے اجل رسیدہ! اس

ویرانے میں بے شک تیرے لیے موت بہتر ہے میں بھی تین دن سے بھوکا ہوں۔ تو اس ریگ زار میں نہ جانے کب سے زندگی بسر کر رہی ہے۔ میں

تیری خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہوں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ مجھے اپنے اس اقدام کا انجام نہیں معلوم۔“

”تم میری ہلاکت میں کوئی تاخیر نہ کرو۔ مجھے تمہاری باتیں گراں گزر رہی ہیں۔ یہ بچہ موت کا منتظر ہے۔ آہ اس کے بعد میں اس جسم کی قید

وبند سے آزاد ہو جاؤں گی۔“ اس بار اس کے لہجے میں مسرت تھی۔

میرے سارے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ میں نے ایک نوکیلا پتھر اٹھایا اور تمام تر شقاوت اور درندگی کے ساتھ پتھری نوک بھر پور انداز میں

بچے کے پیٹ میں بھونک دی۔ خون کی ایک لکیر کے ساتھ بچے کی کرب ناک چیخ اُبھری۔ میں نے لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ اس کے خون

سے ایک چلو بھر کر عورت کے کھلے ہوئے منہ میں پٹکا دیا۔ وہ بُری طرح تشنہ اور بے قرار نظر آ رہی تھی۔ اس کی بات درست ثابت ہوئی۔ خون کا قطرہ

منہ میں پڑتے ہی اس کا بدن ڈھلک گیا۔ بچہ ایک ہی ضرب میں ہلاک ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی کے لئے اس کی تڑپ زیادہ

دیر جاری نہ رہ سکی۔ میں ان دونوں کو چھوڑ کر بہت غلٹ کے ساتھ جھونپڑی سے باہر آ گیا۔

میری طبیعت مکدر ہو چکی تھی۔ اب بھوک بھی غائب ہو چکی تھی۔ ذہن منتشر تھا۔ اعصاب ٹوٹ رہے تھے۔ میں اسی عالم میں زمین پر گر

گیا۔ پتھر اٹھا کر اپنا کام تمام کرنا چاہا کہ اسی وقت ایک عجیب الخلقت شخص میری طرف بھاگتا ہوا آیا۔ اس کا سر بہت چھوٹا تھا اور ٹانگیں پتلی پتلی تھیں۔

چہرے پر صرف آنکھیں نظر آتی تھیں جسم پر کوئی بال نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

”آؤ آؤ مقدس بزرگ! سناؤ میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا تم بھی موت کے خواہاں ہو۔“ میں نے طنز کیا۔ ”میرے ہاتھ میں پتھر ہے۔“

”دیوتا تم سے خوش رہیں، جابر بن یوسف الباقرا! تمہاری واپسی جلد ہو سکتی تھی لیکن تم ابھی تمام اعلیٰ صفات اپنے اندر پیدا نہیں کر پائے ہو۔“ اس نے سرد مہری سے کہا۔

میں نے اپنی زبان کو لگام دی اور اپنا لہجہ بدل کر حیرت زدہ انداز میں پوچھا۔ ”محترم شخص! میں نے جو کچھ کیا وہ میرے ارادوں کا تابع تھا۔ میں نے جو مناسب سمجھا وہی کیا۔“

”اسے وہ لوگ ناپسند ہیں جو اس کی طلب ترک کر کے آسمانوں کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔“ اس نے اپنے انداز میں تبدیلی پیدا نہیں کی۔ ”مجھے بتایا جائے کہ مجھے اور کن مراحل سے گزرنا ہوگا؟ یہ زمین میرے لیے اجنبی ہے۔ کیا مجھے کوئی رعایت نہیں دی جاسکتی؟“ میں نے کسی قدر درشتی سے کہا۔

”کیا یہ رعایت کم ہے کہ تمہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔ تمہیں خود کو اعلیٰ مناصب کا اہل ثابت کرنا ہوگا۔ تم نے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کی ہے۔ تمہارے پاس درخشاں شپالی ہے۔ جاؤ اندر جا کر اس منحوس عورت کی ہڈیاں اپنے گلے میں ڈال لو اور اسے مایوس کرنے کی کوشش مت کرو جس نے تمہیں فضیلتیں بخشی ہیں۔“ اس شخص نے تنخی سے کہا۔

”فاصلہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ شاید وہ یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ کتنی عظیم ہے اور میں نے اس کی طلب کر کے کیسی نادانی کا ثبوت دیا ہے۔ روز اس کی عظمتیں مجھ پر منکشف ہو رہی ہیں اور میں اس سے دور ہو رہا ہوں۔ میں جس قدر اس کے قریب جاتا ہوں وہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم میں نے عمر کا کتنا حصہ بوڑھوں کی خانقاہ میں گزارا ہے۔ میری زندگی اسی تنگ و دو میں گزر جائے گی میرا سب کچھ مجھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے یہاں کے ماحول میں رچ بس جانے اور خود کو اس علاقے کا محبوب شخص بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ موت ہر لمحے میرے تعاقب میں رہتی ہے۔ مجھے اس کی قربت کے دن اگر نصیب ہوئے تو بہت کم ہوں گے۔“

”جابر بن یوسف! آہ تمہیں ابھی تک اس کے جلال کا عرفان نہیں ہے۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔ ”اس کے ہاتھ میں وقت کی نکیل ہے۔ وہ چاہے تو تمہیں مشروب حیات بخش سکتی ہے۔ وہ تمہاری روح پابند کر کے ایک دن اپنا غلام بنا سکتی ہے۔“

”بے شک میرے لیے اس کی قربت کے چند لمحے بھی بہت ہوں گے۔“ میں نے عالم شوق میں کہا۔ ”محترم بزرگ! تمہاری آمد مرثدہ جاں فزا ہے۔ میں تمہارے سامنے شرم سار ہوں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ میرے ذہن و دل پر گاہے گاہے میری گزشتہ زندگی کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ میں وہ باتیں کرنے لگتا ہوں جو کسی طور اس ماحول سے موزوں نہیں ہوتیں۔ میری فکر میرے گزشتہ دنوں کی سازش سے کبھی کبھی آلودہ ہو جاتی ہے۔ میں آئندہ مختار رہنے کا عزم کرتا ہوں۔“ میں نے ندامت سے کہا۔

”جاؤ ان ویرانوں میں تمہارا نصیب چھپا ہوا ہے۔“ عجیب الخلق بوڑھا جس طرف سے آیا تھا۔ اُسی طرف دوڑ گیا۔ میں اسے آوازیں دیتا رہا اور وہ میری نظروں سے میرے شکوک کی طرح دور ہوتا گیا۔

☆=====☆=====☆

جھوپڑی کے اندر دونوں لاشیں اس مختصر وقفے میں ہڈیوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ میں نے انہیں یکجا کیا اور جھوپڑی کے باہر لگی ہوئی پتھر سے انہیں ہار کی شکل میں باندھ کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اب میری گردن میں جارا کا کاکی کھوپڑی، سمورال کی مالا، لوریمیا کی دو مالائیں اور ہڈیوں کا ہار تھا۔ میں نے شپالی کو لوریمیا کی مالا میں سمولیا۔ بوڑھے سے گفتگو کے بعد میں نے اپنے مایوس ارادوں کی گرد اپنے ذہن سے جھاڑنا چاہی۔ اس کی باتیں خاصی حوصلہ افزا تھیں۔ مجھے اس صحرا میں ریت کے کسی ذرے کی طرح خود کو چھوڑ دینا چاہئے تھا۔ اب مجھے اسٹالا کی تلاش تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے بھوک اور پیاس کے عالم میں ایک دن کس طرح گزار دیا۔ میں ایک دن تک مسلسل چلتا رہا اور آخر ایک غار پر جا کر میرا سفر کہیں ختم ہوا۔ یہ غار خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا اندر جانے کے بجائے میں نے اس کے دہانے پر ٹھہرنے کا ارادہ کیا اور مجھے وہاں پانی کے گرنے کی آواز آئی۔ پانی کی بوسنگھ کر مجھ سے وہاں رکنا نہ گیا۔ میں اندر تک چلا گیا۔ اندر دیواریں پانی سے گیلی تھیں میں نے اپنی زبان ان دیواروں سے لگا دی اور بمشکل تمام اس ٹھنڈے پانی سے اپنا ذہن سیراب کیا۔ پانی پی کر مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی اور میں نے غار کے دہانے پر آ کر ایک پتھر سے اپنا سر ٹکا دیا۔ مجھے گہری نیند آ گئی۔ شاید دیوتاؤں کو میری غفلت پسند نہیں تھی۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ لقمہ ووق صحرا میں اس غار کے اندر صحرائی درندے بھی موجود ہوں گے۔ وہ ایک قذآر جانور تھا جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتا اور نہ ہی لفظوں کے ذریعے اس کی شکل کا کوئی خاکہ کھینچ سکتا ہوں۔ غار کے اندر سے جب اس کی ہولناک گرج سنائی دی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ چیخیں چنگھاڑتا ہوا غار کے دہانے کی طرف آ رہا تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ایسے نازک لمحے میں میرے ذہن میں ایک ترکیب اُجاگر ہوئی۔ بھوک انسانوں کی عقل تیز کر دیتی ہے۔ میں باہر آ کر غار کی اوٹ میں ہو گیا۔ خوں خوار درندہ طوفانوں کی طرح دہانے پر آیا اور ناک کی سیدھ میں بھاگتا ہوا چلا گیا۔ دور جا کر وہ برق رفتاری سے واپس ہوا۔ اس عرصے میں ایک ٹیلے پر چڑھ چکا تھا۔ وہاں پتھروں کی بہتات تھی۔ اتنی اونچائی پر وہ کوئی جست نہیں لگا سکتا تھا۔ نشیب میں غار کے دہانے پر وہ غضبناک انداز میں کھڑا اپنے اگلے پنجے زمین پر کھرچ رہا تھا۔ میں اس درندے سے پندرہ فٹ اوپر تھا۔ میں نے اس پر پتھر پھینکنے شروع کر دیئے لیکن یہ طریقہ کچھ زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوا۔ وہ ایک موڑ کاٹ کر کسی بھی لمحے اوپر آ سکتا تھا۔ میں اتنی تیزی سے نیچے نہیں کود سکتا تھا۔ اس نے وہی کیا۔ وہ اوپر کی طرف چڑھنے لگا۔ اب اوپر سے نیچے کودنے کے سوانجات کی کوئی راہ نہ تھی۔ میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ پتھروں پر جب میرا تنومند جسم گرا تو کئی جگہ ٹیس اٹھنے لگی۔ میں جلد ہی اٹھ کر آڑ میں ہو گیا لیکن اس نے مجھے پوری طرح گھیر لیا تھا۔ اس نے ایک دھاڑ کے ساتھ مجھ پر چھلانگ لگانے میں کوئی وقت نہیں لیا۔ میں اس کے جسم کے ساتھ زمین پر آ رہا اور مجھے خود اپنے جسم پر حیرت ہوئی کیونکہ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اسے اوپر اٹھا لیا اور پھر نیچے پھینک دیا۔ اتنا وزنی اتنا خطرناک، اتنا پھرتیلا درندہ میرے قابو میں اس طرح آ جائے گا؟ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ سمورال کی مالا کے دانے بکھر گئے اور جارا کا کاکی کھوپڑی سے بندھی ہوئی مضبوط ڈوری اس دھینگا مشتی میں ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے چشم زدن میں تمام عطیات نوچ کر ایک پتھر پر رکھ دیئے اور چونکہ مجھے پہلے حملے میں اپنی طاقت کا اندازہ ہو چکا تھا اس لیے اس بار میں نے اسے دبوچ لیا۔ ایک بلی انسان سے بہت کمزور ہوتی ہے مگر اس کی پھرتی، اس کے پنجوں سے ایک خاصے معقول آدمی کو خوف آتا ہے۔ میں تفصیل بیان کرنے سے گریز کر رہا ہوں کہ میں نے اسے اٹھا کر کہاں پٹکا اور اس نے مجھے کہاں؟ اس کے پنجے جگہ جگہ میرے جسم میں چبھ کر خراش پیدا کر گئے۔

جابر بن یوسف الباقری پہلے اتنا طاقت ور نہیں تھا۔ میں اپنی طاقت دیکھ کر ششدر رہ گیا اور اس مسرت میں دیوانہ ہو کر میں نے اس بڑے درندے کوئی حصوں میں منقسم کر دیا۔ اس کی دھاڑوں سے صحرا میں گونج پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے خون سے میرا جسم سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی کھال ادھیڑ پھینکی اور اس کا کچا گوشت اپنے دانتوں سے چبانا شروع کر دیا۔ اندر پانی موجود تھا۔ میں اس غذا سے دو تین دن آسانی سے گزار سکتا تھا۔ میں نے اس کا گرم گوشت اس طرح کھایا جس طرح وہ میرا کھاتا۔ اس کے نوکیلے سینگ علیحدہ کر کے میں نے اپنے پاس رکھ لیے۔ یقیناً جب یہ سینگ میرے گلے کا ہار بن جائیں گے تو لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مجھ میں کس قدر طاقت ہے۔ اس کے بعد میں نے سمورال کی مالا کے دانے زمین سے اٹھالے اور انہیں پرو کر دو بارہ اپنی گردن میں ڈال لیا۔ میرے گلے میں اس درندے کے سینگوں کا اور اضافہ ہو چکا تھا۔

اس واقعے کے بعد زارشی کا صحرا میری نظروں میں زیادہ مشکل نہیں رہا۔ میں نے سینہ سپر ہو کر زور آزمائی کی۔ میں اس غار کے دوسرے جانوروں کو زندگی بخش کر آگے بڑھ گیا اور بڑھتا ہی رہا۔ میری آنکھوں نے حیرت انگیز منظر دیکھے۔ میں خود سے لڑتا جھگڑتا دندنا آگے کی زمینیں روندتا ہوا مسلسل بڑھتا رہا۔ دھوپ، جھلکن، جھوک پیاس، میں نے ایک عرصے تک اپنے حال پر قانع رہنے کے لئے تجربے کر لیے تھے۔ میں بظاہر انسان تھا مگر باطن ایک صحرائی درندہ تھا۔ انسان کسی ویرانے میں انسانوں سے دور ہو تو پھر وہ انسان کہاں رہتا ہے؟ انسان انسانوں میں پیچانے جاتے ہیں وہ اعمال و افعال اور اپنی سماجی زندگی سے بحیثیت انسان ممتاز ہوتے ہیں۔ اس ویرانے میں میری سوچیں، میرے عزائم، میرے تصورات سب صحرا کی ریت اڑا کر لے جاتی تھی۔ میں نے سوچنا بند کر دیا تھا۔ میں جس قدر سوچتا، مسائل الجھ جاتے۔ ایک انکشاف سے مسئلوں کا ایک سلسلہ لانیٹل کھڑا ہو جاتا تھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی، خون آلود کھال، گلے میں طوق آراستہ۔ یہ شخص۔ ایک عرب نوجوان تاریک براعظم کے نامعلوم علاقے زارشی میں نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ وہ غاروں میں بے دریغ گھس جاتا اور اندر چیتختے ہوئے جانوروں کو پکڑ لاتا۔ انہیں صحرا کی تپتی ریت پر لا کر بھونٹا اور کبھی کچھایا چبا جاتا، کبھی اسے پانی نصیب نہ ہوتا تو وہ ان کا خون پی لیتا۔ لیکن جہاں جانور ملتے وہاں پانی کسی نہ کسی نشیب میں مل ہی جاتا تھا۔ اس کے ارادے فولاد کے اور اس کا دماغ دنیا کی ہر فکر سے مبرا تھا۔

زارشی کے صحرا میں مجھے بھٹکتے ہوئے کئی ماہ گزر گئے۔ مشقتوں، اذیتوں، آزمائشوں کا یہ سلسلہ ہر قدم پر جاری رہتا۔ میں اپنے کسی تحفے سے مدد نہیں لیتا تھا۔ میرا کام چلتا تھا اور اس دوران انوکھے واقعات سے نمٹتا تھا۔ زارشی میں مجھے اس کے بعد کئی بلاؤں سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے میرے صبر و ضبط کا ہر طرح امتحان لیا۔ راتوں کو میرے قریب بلاؤں نے گھیرا ڈالا۔ عجیب و غریب چہروں اور حلیوں کے لوگوں نے مجھے آکر ستایا لیکن میں راز کی بات سمجھ چکا تھا۔ میں نے انہیں ہر بار خود سے دور کر دیا۔ آخر کئی ماہ گزرنے کے بعد مجھے ایک کارواں نظر آیا۔ وہ اشالا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بار میں اس کی طرف نہیں بھاگا بلکہ اپنی جگہ ٹھہر کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ نظروں کی زد میں آیا تو میں نے دیکھا، ان کی تعداد کم ہو چکی تھی، وہ بہت تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کا جسم گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا، چہروں پر اُداسی چھائی ہوئی تھی، اشالا کی گردن اپنے جسم پر نہ ٹھہرتی تھی۔ قریب آنے پر اس نے مجھے پہچانا تو مسرت سے اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

”اشالا۔ جزیرہ باگمان کے عظیم فرزند!“ میں نے مسرت سے کہا۔ ”یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ تمہارا قافلہ بھی مختصر ہو گیا؟“

”اے معزز سردار جابر بن یوسف! تمہیں دوبارہ دیکھ کر مجھے عرصے بعد خوشی ملی ہے۔“ اس کے پشمرہ چہرے پر تازگی سی پیدا ہوئی پھر وہ تانسف سے بولا۔ ”میں نے اپنی گم شدہ عظمت کے حصول کے لئے اپنی راتیں اپنے دن قربان کر دیئے مگر انہیں اپنا ہم نوا بنانے میں ابھی تک کامیاب نہ ہو سکا۔ میں اب بھی معتب ہوں اور اس صحرا میں اپنی غفلتوں کی سزائیں بھگت رہا ہوں۔ شاید یہیں میری موت لکھی ہے لیکن تم۔ تم جابر بن یوسف! یہ صحرا تمہیں راس آگیا ہے، برکتیں تمہارے کاندھوں پر ہیں عظمتیں تمہاری جلو میں ہیں۔ تم کب جزیرہ باگمان واپس جا رہے ہو؟“

”اسالا۔ آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ ایک عرصے سے میں انسانی گداز کو ترس رہا ہوں۔ یہ تم ہی تھے جس نے مجھے بوڑھوں کی خانقاہ میں آگ کے گرد بیٹھنے کا مشورہ دیا تھا اور یہ میں ہی ہوں جس کے دل میں یہ مذموم خیال آیا تھا کہ مجھے تمہارا سر لوکا سا کی خدمت میں پیش کر دینا چاہئے۔ اپنی ریاضت سے فارغ ہو کر میں نے خود پر لعن طعن کی۔ کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا۔“

”تم نے جو سوچا تھا، وہ صحیح تھا۔ میرا سر اب بہت ارزاں ہے تم میرے لیے دیوتاؤں سے سفارش کرو۔ میں اب باگمان میں اقتدار کا خواہش مند نہیں۔ میں وہاں ایک باشندے کی طرح رہنا چاہتا ہوں۔“ اسالا نے رقت انگیز لہجے میں کہا۔

”آہ اسالا! میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں اور تمہارے پاؤں میں استقلال نہیں۔ تم اتنے دل برداشتہ کیوں ہو گئے؟“

”معزز سردار! اب مجھے ہر سواند ہیرا نظر آتا ہے۔ میرا یہ جسم میرے ان چند وفادار ساتھیوں پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ میں صحرا صحرا گھوم آیا۔ میں نے ایک زندگی خود کو ایک معزز اور سر بلند شخص بنانے میں گزار دی۔ جب میں اپنے ہم عصروں کو شکست دیتا ہوں مستند اقتدار تک پہنچا تو میرے ایک وفادار نائب لوکا سا کی ریشہ و انیاں مجھے جلد ہی کھا گئیں۔ اس کے بعد سے میں یہاں بھٹک رہا ہوں۔ تم مہذب دنیا کے ایک شخص ہو۔ شاید تمہاری دنیا میں عفو و درگزر، رحم اور رعایت کی مدیں زیادہ ہیں۔ تم مجھ سے اتنی ہمدردی کا اظہار کر کے مجھے اور ناتواں کیے دیتے ہو۔“ اسالا کے لہجے سے شکست خوردگی کے آثار نمایاں تھے۔

”اسالا۔ میرے عزیز اسالا! میرے دل میں اُس بد کردار اور ظالم شخص لوکا سا کے لئے کبھی کسی اُنس کا جذبہ بیدار نہیں ہوا۔ تم وہ دوسرے یا تیسرے آدمی ہو جس نے شگفتگی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے بوڑھوں کی خانقاہ میں کتنا عرصہ گزارا ہے؟“

”تم سے میری ملاقات ہوئے چھ سال سے زائد ہو گئے۔ کیا تمہیں مقدس بوڑھوں نے حکم دیا تھا کہ تم ان کا حلقہ توڑ دو۔“ اسالا نے جواب دیا۔

”ہاں۔“ میں نے اس علاقے کے برسوں اور اپنے برسوں کا حساب لگاتے ہوئے کہا۔ اسالا کی بتائی ہوئی مدت ہمارے ہاں کے دو برسوں سے کچھ اوپر ہوتی تھی۔ وقت کا احساس ہوا تو مجھے جزیرہ توری میں رہنے والے بہت سے چہرے یاد آ گئے۔ سرنگا، سرتا اور دوسرے لوگ میں نے اسالا سے پوچھا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں جزیرہ باگمان کب واپس جاؤں گا؟ کیا میری آزمائش کے تمام مرحلے ختم ہو گئے؟“

”یہ سوال خود میں نے تم سے کیا تھا۔ میرے درد مند سردار! اس علاقے میں ہر قدم پر ایک آزمائش ہے۔ جزیرہ باگمان ہی کیا۔ سلطنت اقبال میں قدم قدم تمہیں آزمائشوں سے گزرنا ہوگا۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں۔ تمہارے گلے میں تابندہ شہابی موجود ہے جو عظمتوں کی نشانی ہے اور میں ڈبگی کے سینک دیکھ رہا ہوں جو تمہاری شجاعت کا مظہر ہیں۔ میں تمہارے گلے میں انسانی ہڈیاں سجی ہوئی دیکھ رہا ہوں جو تمہاری قوت فیصلہ اور دیوتاؤں کی خوشنودی کی علامت ہے۔ تمہارے گلے میں مقدس لوریمیا کی دو مالائیں، جارا کا کا کی کھوپڑی اور کوئی بہت متبرک کالا پڑی ہوئی ہے۔ اتنی چیزیں بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ اصولاً تمہیں اب واپس جانا چاہئے لیکن یہ سب ان بزرگ و برتر روجوں پر منحصر ہے۔ تم چلتے رہو۔ چلتے رہو۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد تم باگمان پہنچ جاؤ گے اور تمہاری نظر سے باگمان کا وہ طلسمی اندھیرا چھٹ جائے گا جو وہاں کے باشندوں پر دیوتاؤں نے مسلط کیا ہے۔ میں تمہیں زارشی کی سرحدوں تک چھوڑ سکتا ہوں۔ مگر تم اس وقت تک وہاں داخل نہیں ہو سکتے جب تک انہیں منظور نہ ہو۔“

”اساللا۔“ میں نے اس کے طویل بیان سے متاثر ہو کر کہا میں کچھ اہم باتیں جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت ہے۔ یہ شہابی کیا چیز ہے؟ اس سے کیا کرشمے رونما ہوتے ہیں؟“

”شہابی تمہاری غیر معمولی طاقت اور عظمت کی امین ہے۔ کاش تم میرے ساتھ رہتے اور کاش دیوتاؤں کا عندیہ ہوتا تو میں تمہیں بہت کچھ سکھاتا۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”میں اس سے کیا کام لے سکتا ہوں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”یہ صرف تمہارے حریف کو خبردار کرنے کی نشانی ہے کہ تم نے زارشی کی خانقاہ میں ریاضت کر کے اپنا باطن منور کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شجاعت میں تمہارا درجہ بلند ہے۔ اس کی موجودگی خیر ہے۔ اس کی بے حرمتی باعث ابتلا ہے۔“

”میں سوچتا ہوں اساللا۔“ میں نے اسے ٹولا۔ ”میں سوچتا ہوں کہ میں نے بہت سے تحائف حاصل کر لیے ہیں لیکن میں جزیرہ توری کے کاہن اعظم سورال اور اپنے دوست سرنگا جیسے بلند مقام پر نہیں پہنچ سکا جو دل کی باتیں سونگھ لیتے ہیں اور جن کی آنکھیں ان کی عقب میں بھی موجود رہتی ہیں، جن کی سماعت وسیع اور جن کی بصارت لامحدود ہے۔“

”وہ ایک مشکل اور پیچیدہ عمل ہے تم نے سوچ بوجھ بدور اور سیکھنے کا عمل جاری رکھا تو تمہارے جسم پر کئی آنکھیں پیدا ہو جائیں گی۔ یہ آنکھیں اور یہ کان اپنے باطن کو جلادینے سے اُگتے ہیں۔“ اساللا نے کہا۔

”مگر یہ کس طرح ہوگا؟ کیا جزیرہ باگمان اور زارشی آنے کا مقصد میرے باطن کی تطہیر نہیں تھا؟“ میں نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

”کوئی شبہ نہیں کہ تم نے اپنے کردار و اطوار سے فاصلے گھٹا دیئے ہیں، لیکن معزز سردار! یہ تمہاری روحانی بالیدگی کا آغاز ہے۔ تمہارے ساتھ یہ دلچسپ حادثہ ہوا ہے کہ تمہیں سری علوم سے آگاہی بتدریج نہیں ہوئی۔ تم نے یہاں کے عبادت گزاروں کی طرح اپنی زندگی کا بڑا حصہ ارتکاز و استغراق میں نہیں گزارا، کسی بلند مرتبت اتالیق نے تمہاری باقاعدگی نگرانی نہیں کی اور ہوا یہ کہ تمہیں اپنی خوش قسمتی کے سبب سے بعض فضیلتیں لازمی مراحل گزارنے سے پہلے مل گئیں۔ اب تم ایک ایسے آدمی ہو جس نے اپنی دوسری غیر معمولی صفات کے بل پر بڑا منصب حاصل کر لیا ہے لیکن یہ

مناسب حاصل کرنے کے لئے تم نے یہاں کے مروجہ اور مسلمہ مراحل عبور نہیں کیے۔ یہی ایک خلا رہ گیا ہے۔ درمیان کی کڑیاں غائب ہیں جو تمہاری پریشانی کا سبب بن سکتی ہیں۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں اسلذا لیکن میں خلا پُر کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ میں اپنے تحائف سے پوری طرح فائدہ اٹھاؤں گا۔ تم سچ کہتے ہو۔ میرے سامنے اس وقت جزیرہ توری کے کاہن اعظم سمورال کے لڑکے جمرال کا چہرہ ہے۔ اس کی بہن ترام سے میری شادی ہوئی تھی۔ میں نے ان دونوں کو علوم باطنی کی باقاعدہ تربیت حاصل کرتے دیکھا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ جمرال کو ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد یہ تحائف نصیب ہوں گے جو میرے پاس ہیں لیکن وہ اُس وقت کتنا مکمل اور جامع شخص ہوگا۔“ میں نے کہا۔

میرے اور اسلذا کے درمیان گفتگو ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ جہاں انکشاف کا کوئی موقع آتا اور میں اس سے پردے اٹھانے کے لئے کہتا وہ بڑی خوبصورتی سے گفتگو کا رخ کہیں اور موڑ دیتا۔ وہ قبل از وقت مجھے کوئی بات بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ اس لیے کہ وہ ایک معتب و معزول آدمی تھا اور کوئی کمزور بات کہہ کر اپنے مصائب میں اور اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس شخص کی خوش سلیقگی، خوش اطواری اور اس کی حالت زار دیکھ کر میرے دل میں اس کے لئے محبت کے جذبات ابھرے۔ پہلی اور دوسری ملاقات میں اسلذا میں ایک واضح فرق نظر آتا تھا۔ وہ مجھ سے گفتگو کرتا ہوا پھر صحرا میں کہیں گم ہو گیا اور میں آنے والے مشکل دنوں کے استقبال کے لئے تنہا ایک سمت چل پڑا۔ میرے دل میں جزیرہ باگمان اور پھر جزیرہ توری واپس جانے کی خواہش ابھری اور میں نے صحرا کی فضاؤں کو بلند آواز میں مخاطب کیا۔ ”دیوتاؤں کے مسکن۔ اے عظیم صحرا! تو نے دیکھ لیا جابر بن یوسف الباقرنے تجھے ہر مرحلے پر شاد کام کیا۔ اور تو دیکھ رہا ہے کہ اس کے ہاتھوں میں پہاڑوں کا سینہ کاٹنے کی جرات پیدا ہو گئی ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کس کا طلب گار ہے اور کون اس کی زندگی کا مطلوب و مقصود ہے۔ پس اب اسے اجازت دے اس کے قدم باگمان جانے والے راستوں پر ڈال دے اور یقین کر تیری یہ رعایت رائیگاں نہیں جائے گی۔“

صحرا میں میری پکار کا کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ مجھے خود پر ہنسی آ گئی اور میں دیوتاؤں کی طرح خود کلامی کرتا ہوا غاروں ٹیلوں، ریت کے تودوں میں دن گزارتا رہا۔ پھر کئی دن گزر گئے۔ غیر اہم حادثوں اور چھوٹے واقعوں کا ذکر بے معنی ہے۔ صحرائے زارشی کے روزنامے میں بہت سے دن یکساں اہمیت کے حامل تھے۔ تمام دنوں کا احوال کیا لکھا جائے۔ وہی تپش وہی کڑی دھوپ، وہی ریت اور وہی میں۔ مجھے یقین تھا کہ میں ایک دن جزیرہ باگمان کے راستے پر گامزن ہو جاؤں گا، چنانچہ وہاں جانے کے بعد میرے ذہن میں بڑے معرکے اور دلکش منصوبے تھے۔ آخر وہ دن بہت جلد آ گیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں باگمان کا راستہ خود تلاش کروں گا اور کسی ایک سمت دور تک جانے اور واپس آنے یا مڑنے کے بجائے اسی سمت چلتا ہوں گا۔ یقیناً وہ راستہ کسی نہ کسی جگہ ختم ہوگا۔ یہ ایک تھکا دینے والا فیصلہ تھا لیکن مجھے اس میں پہلی ہی بار کامیابی نصیب ہو گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں میرے ارادے سے زیادہ ان طاقتوں کا دخل ہوگا جو اب زارشی میں میری موجودگی کی ضرورت نہیں سمجھتی تھیں۔ جب پہلی بار میں نے ایک اونچے ٹیلے سے درختوں کے جھنڈ دیکھے اور وہاں کی لطیف اور خشک ہواؤں نے میرے جسم و جاں کا احاطہ کیا تو میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اتنے عرصے بعد زندگی کے آثار دیکھ کر میرے منہ سے خوشی کی ایک چیخ نکل گئی اور میں نے زارشی پر ایک الوداعی نظر ڈال کر اس کی خاک سے اپنے بدن کو

غسل دیا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ اس وقت میری ٹانگوں میں فولاد کی توانائی آگئی تھی زمین پر پاؤں پڑتے ہی نہیں تھے۔ مجھے شبہ گزرا کہ یہ زارشی ہی کا کوئی حصہ نہ ہو مگر زارشی تو خود جزیرہ باگمان کا ایک ویران حصہ تھا۔ اسٹالانے مجھے بتایا تھا کہ باگمان کی تاریکی کا طلسم میری ریاضت کی وجہ سے ٹوٹ چکا ہے۔ اب وہاں دھوپ نظر آرہی تھی۔ میں نیچے اترتا چلا گیا اور ایک لمبی مسافت کے بعد میں نے درختوں کے جھنڈ میں اپنا سر ٹکا دیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں اپنے وطن واپس آ گیا ہوں۔ میں نے درختوں کی شاخیں چھو کر اور پتے توڑ کر اس امر کا یقین کر لیا کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں مستی میں ایک عربی نغمہ گنگنا تا اندر کی طرف بڑھتا گیا۔ یہ نخلستان شاداب درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں جزیرہ توری جیسا گھنا جنگل تو نہیں تھا لیکن درختوں کا درمیانی فاصلہ کچھ زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ ایک جگہ پانی دیکھ کر میں نے اپنے جسم سے لپٹی ہوئی دھول اور خاک گھنٹوں میں صاف کی۔ میرے بال جکڑے ہوئے تھے، انہیں صاف کیا اور آگے بڑھنے سے پہلے ایک گھنے درخت کے سائے میں پتے بچھا کر دراز ہو گیا۔ میں بہت گہری نیند سویا۔ جس وقت میں اٹھا، رات ہو چکی تھی۔

میرا ارادہ تھا کہ سب سے پہلے لوکا سا کو حیرت زدہ کروں گا کہ اس کی امیدوں کے برخلاف میں باگمان واپس آ گیا ہوں۔ ابھی میں فاصلے طے کر رہا تھا کہ مجھے انسانی سرگوشیوں کی گونج سنائی دی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ چند تنگ دھڑنگ سیاہ فام لوگ نیزے اور مشعلیں تانے میری سمت بڑھ رہے تھے۔ ان میں لوکا سا کا نائب کا بالو بھی موجود تھا۔ کا بالو کو دیکھ کر میرے دل میں نفرت کا احساس بھڑک اٹھا لیکن میں نے ایک ضدی شرارتی نیچے کی طرح اپنے گال پر ایک چپٹ لگائی۔ اس وقت میری سرخوشی کا عالم عجیب تھا۔ میں خود سے داد وصول کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ لوگ جلد ہی میرے قریب آجائیں۔ میں ان کی نظریں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے شپالی نمایاں کر لی۔ میں اپنی جگہ رک گیا۔ یہ خود نمائی اور انا نیت، یہ محبوبیت اور یہ ناز وادا۔ میری حالت کسی ایسی حسین عورت کی سی تھی جو اپنے عاشقوں کی نظروں سے اپنے حسن و جمال کا تخمینہ لگا رہی ہو۔

کا بالو میرے قریب آیا تو اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں وہ مجھے یوں حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا جیسے اسے میرے وجود پر شبہ ہو۔ کا بالو کے ساتھی بھی محو حیرت تھے۔ چند لمحوں تک وہ مجھے متحس نگاہوں سے تولتے رہے۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر کا بالو نے میرے سینے پر سجے ہوئے عطیات حرص کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مقدس جابر بن یوسف! مجھے مقدس لوکا سا نے تمہاری پذیرائی کے لئے بھیجا ہے۔ میں تمہیں جزیرہ باگمان میں واپسی پر خوش آمدید کہتا ہوں۔“

”اوہ“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”تو اسے علم ہو گیا ہے؟“

”اسے باگمان میں ہونے والی ہرجمنش کا علم رہتا ہے، وہ جاننا چاہے تو پتوں کی حرکت کا بھی پتہ چلا سکتا ہے۔“ کا بالو نے اپنے سردار کے بارے میں مبالغے سے کام لیا۔

”میں اسے دیکھنا پسند کروں گا۔“ میں نے دانستہ اپنے لہجے میں تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ ”میرے لیے مقدس لوکا سا کا کیا حکم ہے؟“

”وہ تمہیں کسی وقت بھی طلب کر سکتا ہے۔ فی الحال تمہیں ہستی میں منتقل کر دیا جائے گا اور تمہیں موقع دیا جائے گا کہ تم کچھ دن اطمینان و آرام سے گزارو۔“ کا بالو نے کہا۔

”اور اگر میں معزز کا بالو سے یہ درخواست کروں کہ وہ مجھے ابھی لوکا سا کی خدمت میں پیش کر دے تو اس کا کیا جواب ہوگا؟“

”اس کا جواب نفی میں ہوگا۔“ کا بالو نے کہا۔

”شاید معزز کا بالو اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ میں زارشی سے واپس آ رہا ہوں۔ صورتحال میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔“ میں نے ممکنات

سے کہا۔

”کا بالو اپنے سردار کا تابع دار ہے۔ سردار کے احکام بجالانا اس کے فرائض میں داخل ہے۔“ کا بالو نے کسی جذبے کے بغیر کہا۔

”یوں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں معزز کا بالو کی مجبوریوں سے واقف ہوں۔“ میں نے اسے اپنے قالب میں ڈھالنے کے لئے کہا۔

کا بالو نے کوئی جواب نہیں دیا اور تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”بستی تک مجھے تمہاری آنکھوں پر اندھیرا طاری رکھنا ہوگا۔“

”کا بالو“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”کیا اس بات کی بھی ضرورت ہے؟ جب کہ باگمان کا طلسمی اندھیرا بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔“

”یہ میرے سردار کا حکم ہے وہ اس جزیرے کا حاکم اعلیٰ ہے اور تمہاری حیثیت ابھی تک ایک طالب علم کی ہے۔“

”کا بالو۔ یہ باتیں تو بین اور دل آزاری کے ذیل میں آتی ہیں تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ میں مقدس اقبال کا فرستادہ ہوں۔“

میں کا بالو اور اس کے تمام ساتھیوں کو بیک وقت اٹھا کر زمین پر پٹخ سکتا تھا لیکن یہ بات مصلحت کے خلاف تھی۔ میں نے لوریماس سے ملنے

کی خواہش کا اظہار کیا تو کا بالو نے معذوری ظاہر کر دی۔ زارشی میں میں نے بہت سے فیصلے کئے تھے۔ ان فیصلوں کے مطابق یہ ضروری تھا کہ میں

اپنے لیے نفرت کے بجائے محبت کے جذبات پیدا کروں۔ میں نے اکراہ کے ساتھ کا بالو کا ناپسندیدہ حکم مان لیا۔ چلتے چلتے یہ ضرور اس سے کہا کہ

کا بالو میں تمہیں منع کرنے کی قوت رکھتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں منقلب ہو کر آیا ہوں۔“

میری آنکھوں پر کا بالو کے ایک ہی عمل سے اندھیرا چھا گیا۔ راستے میں خاموشی رہی لیکن میں بولتا رہا اور دانستہ کا بالو کو صحرائے زارشی کے

ہر اسرار واقعات سناتا رہا۔ وہ میری باتوں کے جواب میں خاموش رہا۔ میں ایک دوستانہ فضا چاہتا تھا۔ پھر میں نے کہا۔ ”کا بالو! تمہاری فرماں

برداری دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے کہ کاش جزیرہ توری میں پیدا ہوتے اور میرے نائب ہوتے۔ کیا تم نے جزیرہ توری کے باشندوں میں میری

اصلاحات کا واقعہ نہیں سنا؟“

”سنا ہے معزز سردار! اس نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔ ”لیکن یہاں کیا نہیں ہے؟ یہ جزیرہ ہر اعتبار سے روحانی نعمتوں سے آسودہ ہے۔“

”میں نے تمہارا نام اپنے دل پر نقش کر لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ بستی آگئی تھی۔ چاروں طرف مشعلیں ایستادہ تھیں۔ میں ایک شان بے نیازی

و قلندری سے بستی میں داخل ہوا۔ مجھے بھی وہ منظر رات کا محسوس ہوتا تھا اس لیے کہ وہ وقت رات کا تھا لیکن جزیرے کے عام باشندوں کے ہاں ہمیشہ

مشعلیں جلتی رہتی تھیں کیونکہ انہیں ہر وقت اندھیرا نظر آتا تھا۔ صرف جشن لوریماس پر ایک دن کے لئے ایک مخصوص مقام سے یہ اندھیرا چھٹ جاتا تھا اور

پھر ایک نہ ختم ہونے والا اندھیرا طاری ہو جاتا تھا۔ جب میں آبادی میں جھونپڑیوں کے قریب سے گزرا تو لوگوں نے روشنی کے جھماکوں میں مجھے دیکھا

وہ کا بالو کی موجودگی کے باوجود میرے قریب آئے۔ شپالی کسی ہیرے کے مانند میرے سینے پر چمک رہی تھی۔ میں ان کی نظریں پچھانتا تھا۔ ان میں تیر

تجسس اور خوف تھا۔ اپنی شخصیت سے دوسروں کے خوف زدہ ہونے کا احساس کتنا طمانیت بخش ہے۔ میرا خیال ہے محترم المقام لوگوں کی پہچان یہی ہے کہ لوگ ان سے خوف زدہ رہیں۔ میں خندہ پیشانی سے مسکراتا، ہاتھ ہلاتا بستی سے نزدیک ہی ایک بڑی جھونپڑی میں پہنچا دیا گیا۔ اس جھونپڑی کے باہر کئی نیزہ بردار سیاہ فام موجود تھے۔ کابلو مجھے وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ میرے سامنے لذیذ ترین غذاؤں کے خوان اور مشروبات پیش کر دیئے گئے۔ بہت دنوں بعد میں نے سیر ہو کر کھایا اور کھانا کھا کر ٹھیلنے کے لئے بستی میں نکل گیا۔ میں نے بستی کے بہت سے لوگوں سے بات کی۔ اگر میں کسی ایک کو منتخب کرتا تو تکرری کی طرح دوسرے دن بستی کے باہر اس بدنصیب کا سر کٹا ہوا ملتا۔ اس لیے میں نے کسی ایک شخص سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ جزیرہ توری کے لوگوں کی عادات، ان کے اطوار سے میں واقف تھا۔ مجھے تجربہ تھا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتے ہیں۔ میں لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے نفسیاتی نکات سے آگاہ تھا مجھے ہجوم کی نفسیات بھی معلوم تھی اور ہجوم میں ایک قائد کے کردار بھی توڑا بہت جانتا تھا۔ صدحیف کہ میں آکسفورڈ کا ایک ذہین طالب علم ان جشیوں کے درمیان گھر گیا تھا۔ اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہی اس کی دنیا تھی اور یہی لوگ اس کے ہم وطن تھے۔

اُس رات جزیرہ باگمان کی پہلی پرسکون شب میں معدے کی سیری کے بعد کچھ قربتوں کو جی چاہنے لگا۔ عرصے بعد ترشے ہوئے بدن، جوان بدن دیکھے تھے۔ اسی مقام پر میں نے جشن لوریمہ کے دن اپنی برتری منوائی تھی۔ ان کے لئے میں کوئی اجنبی شخص نہیں تھا۔ میرا ایک اشارہ باگمان کی کئی دوشیزاؤں کو گردن کٹانے پر مجبور کر سکتا تھا۔ مگر یہ خون ناحق تھا۔ اس رات میں تشنہ لب، تشنہ بدن، تشنہ جذبہ سو گیا۔

دودن تک لوکا سانا نے مجھے طلب نہیں کیا لیکن یہ دودن میرے لیے بڑے کام کے ثابت ہوئے۔ میں بستی کے لوگوں کے درمیان ایک عام آدمی کی حیثیت میں ان سے ربط ضبط پیدا کرتا رہا۔ میرے پاس زارشی کے اور اپنی دنیا کے اتنے واقعات انہیں سننے کے لئے تھے کہ وہ تھک جاتے اور میرا بیان ختم نہ ہوتا۔ یہ دودن بڑے اطمینان سے گزر گئے۔ دودن بعد کابلو نے آکر اطلاع دی کہ مجھے اسی وقت لوکا سانا نے اپنی خدمت میں طلب کیا ہے۔ میں اسی لمحے کا منتظر تھا۔ میری تیاری میں کیا دیر تھی۔ وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے بستی سے باہر آئے اور حسب دستور کابلو نے میری بیٹائی چھین لی۔ میں نے اس بار کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میری آنکھیں دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں ایک اندھیری سرنگ سے تنہا گزر رہا تھا۔ جلد ہی میں لوکا سانا کے مخصوص کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے آج اپنا جسم خوب رنگ رکھا تھا۔ مختلف قسم کے کڑے اور ہار اس کی گردن میں جھول رہے تھے۔ اس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور اپنی حیرت مجھ سے چھپانے میں ناکام رہا۔ مجھے جلد بازی کے کسی مظاہرے سے پرہیز لازم تھا لیکن وہ اعتماد جو میری ذات کا ایک حصہ بن گیا تھا، اس کا اظہار ہو ہی جاتا تھا۔ لوکا سانا نے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اٹھایا، فوراً ایک نوجوان لڑکی اندر داخل ہو گئی، لوکا سانا نے اسے پھر اشارہ کیا۔ اس بار وہ ایک طشت کے ساتھ آئی تھی جس میں ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ قریب آنے پر لوکا سانا نے اس لڑکی کے سینے پر انگلی رکھ دی۔ وہ تکلیف سے چیخ اٹھی۔ اس کے سینے سے خون ایلنے لگا۔ خون لوکا سانا نے گلاس میں انڈیل لیا اور دوبارہ سینے پر انگلی رکھ دی۔ میں یہ منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ خون بند ہو گیا تھا لیکن لڑکی بری طرح مضطرب نظر آتی تھی۔ لوکا سانا نے اُسے جانے کا اشارہ کیا اور ایک گھونٹ پی کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”زارشی سے تمہاری کامیاب واپسی پر جزیرہ باگمان کا ناظم اعلیٰ اپنی محبوب کنیز کے تازہ خون کا جام پیش کرتا ہے، یہ جام کئی اور مشروبات کا مرکب ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ لوکا سارنے یہ بے وقت مظاہرہ کس احساس کے تحت کیا ہے۔ میں نے بڑھ کر وہ گلاس لے لیا اور آنکھ بند کر کے ایک ہی گھونٹ میں اسے ختم کر گیا۔ ایسے واقعات پہلے بھی میرے ساتھ پیش آچکے تھے اس لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ”مقدس لوکا سا کی مسرت میرے لیے باعث عزت ہے۔ شکر ہے لوکا سارنے ایک سردار کے ساتھ سرداروں کا سارویہ اختیار کیا۔“ میں نے ادب سے کہا۔

”اُف۔ یہ زبان کے فتنے۔ میں ان سے بیزار ہوں۔“ اچانک لوکا سا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے سفاکی جھلکنے لگی۔ ”تمہیں پہلے ہی یہ باور کر دیا گیا تھا کہ جب تک تم اس علاقے میں ہو، تمہاری حیثیت ایک زیر تربیت شخص کی رہے گی۔“

”مجھے یہ فرمان ازبر ہے۔ کیا مجھ سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہوئی ہے جو میرے خلاف فرد جرم کے طور پر استعمال کی جاسکے؟“

”نافرمانیوں سے یہاں خون بہتا اور آگ لگتی ہے۔ ہر طالب علم کے لئے ناظم اعلیٰ کی اطاعت لازمی ہے جن کے دل میں کینہ ہے ان کے لئے یہ زمین قہر ہے جن کے ارادوں میں خباثت ہے ان کی روحیں جسم سے بے وفائی کرنے میں عجلت کر رہی ہیں۔“ لوکا سار نے سرد مہری سے کہا، پھر اس کا لہجہ رفتہ رفتہ اشتعال انگیز ہوتا گیا۔ میں اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتا لیکن مسکرا کر بڑے اعتماد سے اس ناہنجاری کی ہر بیانی برداشت کرتا رہا۔

”دیوتاؤں کا واسطہ میں جانتا ہوں کہ تم سے غلطیاں ہو سکتی ہیں، زارشی سے واپسی کے بعد بھی ایک طالب علم کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک مکمل انسان بن کر لوٹا ہے اور خشک ہوائیں اور سبزے اور لوگوں کے جھوم اور غذائیں اور مشروبات اس کی تربیت میں کوئی رخسہ نہیں ڈالتے۔ اس میں وہی خوبیاں موجود رہتی ہیں جن کا ثبوت اس نے زارشی میں دیا ہے۔“ لوکا سا کی گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس نے میری واپسی کس طرح محسوس کی ہے۔

”میں لوکا سا کی ہدایت اپنے دل میں منتقل کر رہا ہوں۔ کیا مقدس ناظم اعلیٰ کو اس میں کوئی شبہ ہے؟“ میں نے جرات سے کہا۔

”شبہ؟“ وہ کسمسا کر بولا۔ ”کیا لوکا سا کو حقیقتوں کا علم نہیں۔“ شبہ؟ کیا یہ لفظ تو بین اور گستاخی کے زمرے میں نہیں آتا؟ کیا لوکا سا اتنا بے پروا اور جاہل شخص ہے۔ میں کہتا ہوں جابر بن یوسف۔ تمہاری زبان بہک جاتی ہے، اسے ایک خامی کہا جاسکتا ہے۔ سنو! اگر تم نے غلط اندازے قائم کئے اور تمہاری روش سے نافرمانی کی بو آئی تو تمہاری تربیت کو اس وقت تک طول دیا جاسکتا ہے جب تک تم اطاعت اور برداشت کی تمام خوبیاں نہ پیدا کر لو۔ تمہیں جزیہ توری واپس جانے اور ایک مکمل مرد ثابت کرنے کے لئے جزیہ باگمان میں محتاط رہنا ہوگا۔“

لوکا سار نے بہت تحقیر آمیز انداز اختیار کر لیا تھا میری خاموشی پر اس نے کہا۔ ”پھر میں جزیہ توری پر تمہاری واپسی کے احکام جلد صادر کر سکتا ہوں۔“ ”مجھے یہاں سے جلدی جانے کی آرزو نہیں ہے۔ میں اپنی تربیت مکمل کر کے ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے دبے ہوئے لفظوں میں کہا۔ ”میں ابھی مقدس لوریمیا کی قدم بوسی کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ اسے اطلاع دی جائے کہ اس کا غلام سعادتیں سمیٹنا چاہتا ہے۔ اس سے کہا جائے کہ زارشی میں ہر جگہ میں نے اس کے عطیات دل و جان سے سنبھال کر رکھے ہیں۔ مقدس لوکا سا! میں اس سے کب مل سکتا ہوں؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

میں نے دیکھا کہ لوکا سا کی پیشانی پر بل پڑ گئے، اس نے بے تابی سے اپنا سر جھکا اور اپنا خنجر نکال کر سامنے کی دیوار پر زور سے پھینک

دیا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو یہ خنجر میرے جسم میں بیوست ہوتا۔ پھر اس نے اپنا انگوٹھا گھمایا، نو جوان لڑکیوں کا ایک طائفہ اندر آ گیا اور وہ اس کا بدن دبانے لگیں۔ ”تم جاسکتے ہو۔ تمہیں مطلع کر دیا جائے گا کہ تم کب مقدس لور یما سے مل سکتے ہو۔ اس کی آمادگی شرط ہے لیکن ایک بار تمہیں ضرور موقع دیا جائے گا۔“ اس نے نفرت سے کہا۔ میں واپس جانے کے لئے مڑا تو وہ کسی قدر نرم لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”جابر بن یوسف! ہوش مندی سب فضیلت ہے۔“ پھر ٹھہر کر کہنے لگا۔ ”ان میں کوئی لڑکی تمہیں پسند ہو تو عطا کی جاسکتی ہے۔“

میں نے ایک طائرانہ نظر سے ان کا جائزہ لیا۔ وہ سب نشلی آنکھوں اور کسے ہوئے بدن کی شگفتہ لڑکیاں تھیں۔ میں انتخاب مشکل سے کر پاتا لیکن لوکا سا کی سخت باتوں سے بد دل سا ہو گیا تھا۔ ”میں ان کی ضرورت نہیں سمجھتا، یوں اس کرم کا جابر بن یوسف تہہ دل سے شکر گزار ہے۔“

لوکا سا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مجھے جانے کی پہلے ہی اجازت مل گئی تھی۔ اس لیے میں وہاں سے فوراً چل دیا۔ طبیعت میں سخت تکدر تھا۔ ہر چند لوکا سا کی ملاقات سے کوئی خوش آئندہ توقع مجھے وہاں جانے سے پہلے نہ تھی لیکن یہ شخص طبعاً ایک بدخوار ظالم شخص تھا۔ وہ میری تربیت کا زمانہ طویل کر سکتا تھا اور مجھے ہر وقت پریشان کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ میں اس کے علاقے میں مقیم تھا۔ اپنی جھوپڑی میں واپس پہنچنے کے بعد میں نے تمام پہلوؤں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ لور یما سے ملے بغیر میری پناہ محال تھی۔ اس سے جلد از جلد ملاقات ضروری تھی اور لور یما کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئی تھیں۔ میں آئندہ چند دنوں میں بہت محتاط رہا لیکن میں نے بستی والوں سے اپنا رابطہ قائم رکھا۔ ایک مہینہ گزر گیا لیکن لوکا سا یا اس کے کسی نائب نے میری خبر نہ لی۔ البتہ وہ میری نگرانی ضرور کر رہے ہوں گے۔ جب دل بہت گھبراتا میں بستی سے دور نکل جاتا۔ آخر ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں خود ہی لور یما سے ملنے کی کوشش کیوں نہ کروں؟ یقیناً لوکا سا کو پتہ چل جائے گا لیکن مقدس لور یما کو اس پر ہر طرح برتری حاصل ہے۔ مجھے کسی صورت اس کے پاس پہنچنا چاہئے۔ پھر اس سے بڑی آسانی سے تحفظ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بہت غور و فکر کے بعد جب میں ایک دن بستی سے بہت دور چلا گیا تو میں نے سمورال کی مالا سے لور یما کی اقامت گاہ کی سمت رہنمائی طلب کی۔ جارا کا کا کی کھوپڑی ہاتھ میں لے کر میں مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔ دُور تک راستے میں مجھے کوئی نہیں ملا۔ وہ گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا کوئی حصہ تھا۔ میں ہر غار میں سمورال کی مالا سے مدد لیتا مگر اس کے دانے کہیں نہ چمکے۔ غار تلاش کرتا ہوا، آخر ایک جگہ سمورال کی مالا کے دانے روشن ہو گئے۔ میں اس غار میں جانا چاہتا تھا کہ ایک نیزہ بردار شخص نے کہیں سے میری طرف آ کر میرا راستہ روک لیا۔ اس نے مجھے اندر جانے سے منع کیا۔ میں نے مقدس لور یما سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس نے لوکا سا کا حوالہ دیا۔ کوئی کب تک برداشت کرتا؟ سلسلہ پھر نہ جانے کب ختم ہوتا۔ جب اس نے مجھے اجازت دینے سے انکار کر دیا تو میں نے ضد کی، مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ مجھ سے نبرد آزما ہونے میں پہلو تہی کر رہا ہے۔ میں اسے دھکیلتا ہوا اندر بڑھ گیا۔ اس نے اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا، میں نے اپنا سیدھا ہاتھ پھر پور قوت سے اس کے جڑوں پر مارا، وہ دور جا کر امیں نے مڑ کر اسے دیکھنا ضروری نہیں سمجھا اور تیزی سے غار میں داخل ہو گیا۔ کچھ ہی دور اندر جا کر مجھے محسوس ہوا کہ آگے سارے راستے پر آگ لگی ہوئی ہے۔ تصدیق کے لئے میں نے پھر اپنی مالا سے مدد لی یہ وہی غار تھا۔ جس کے راستے پر لوکا سا نے آگ بجھا دی تھی۔ اسی وقت مجھے بوڑھوں کی خانقاہ کا عمل یاد آیا۔ میں یہ عمل دہراتا ہوا دراندہ آگ میں گھس گیا۔ جس جگہ سے میں گزرتا تھا آگ سرد ہوتی جاتی تھی پھر یہ آگ خود بخود دماند پڑ گئی اور نیزہ برداروں کا ایک غول وحشیانہ چیخ پکار مچاتا غار میں داخل ہوا۔ وہ غار میں باہر

کی طرف سے آرہے تھے۔ میں نے آگے کی سمت دوڑنا شروع کر دیا۔ کاش میں آگ بجھانے کے بجائے آگ جلانے پر بھی قادر ہوتا۔ اندھیرے میں دوڑتے ہوئے میں ایک بڑے پتھر سے ٹکرایا۔ آگے راستہ بند تھا ایک بڑا پتھر درمیان میں حائل تھا۔ میری آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ سر سے خون بہنے لگا۔ پیچھے وہ جشی آرہے تھے۔ پتھر کی جسامت کا اندازہ لگا کر میں نے کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر سمجھ کر اس پر زور لگایا۔ مجھے خود کو داد دینے کا موقع نہ مل سکا۔ میرے بدن کی غیر معمولی طاقت سے پتھر کا وہ بڑا پاٹ پیچھے کھسکے لگا جو ایک دروازے کی شکل میں تھا، یہ انسانی طاقت سے ماورا کوئی طاقت تھی پھرتی سے میں اندر داخل ہو گیا اور اندر جا کر میں نے اسے دوبارہ بند کر دیا۔ اس بار میں آگے کی طرف سے چوکنہ ہو کر قدم بڑھا رہا تھا۔ میں نے آواز لگائی۔ ”مقدس اور یماما میں تیرے پاس آنا چاہتا ہوں۔ مجھے امان دے۔“

میری آواز کے ساتھ ہی دور کہیں مجھے روشنی کی ایک کرن نظر آئی اور میں جلد ہی ان راہداریوں سے گزرنے لگا جو قصر اور یماما کے درمیان پڑتی تھیں۔ اندر مجھے کسی نے نہیں روکا۔ چند سیاہ فام دوشیزائیں مجھے ایک بڑے سجے ہوئے کمرے میں لے گئیں۔ کمرے میں جل ترنگ بج رہے تھے۔ ایک سیاہ فام دوشیزہ نے مجھے اور یماما کی آمد سے مطلع کیا۔ میری آنکھیں کمرے کا طواف کرنے لگیں۔ اس سرپا جمال، سراپا تمننت کی آمد کا غلغلہ تھا۔ وہ آرہی تھی۔ وہ آنے والی تھی۔ وہ اقبال کے حسین طائفے کی خوبصورت بلا۔ وہ اشار کی طرح حسین تھی۔ وہ اقبال کے حسن و جمال کا پرتو تھی۔ اور یماما ایک پھول تھی۔ جزیرہ باگمان کا واحد خوبصورت پھول۔ اسے سینے سے لگانے کو جی چاہتا تھا۔ میں اڑھائی سال کے عرصے کے بعد اس کے جلوے سے منور ہو رہا تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے میری رگوں میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے مجھے زیادہ پریشان نہیں کیا۔ وہ دوسیاہ فام دوشیزاؤں کی معیت میں سُرخ پھولوں سے ڈھکی ہوئی وہاں نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی، لبوں پر تبسم اور انداز میں اظہار شوق تھا۔ پتوں اور پھولوں کی چادر سے اس کا جسم جھانک رہا تھا۔ اس کے بال سینے پر لہرائے ہوئے تھے۔ اسے وہاں میرے روبرو چھوڑ کر دونوں خادما میں رخصت ہو گئیں میں اور وہ اس شبستان رنگ و نور میں تنہا رہ گئے۔ اب میری باری تھی۔ مجھے اس بے مثال حسن کی داد دینی تھی اور اپنی دیوانگی کا اظہار کرنا تھا۔ یہ دونوں کام مجھے خوب آتے تھے۔ میں ایک ہنرمند حسن پرست، میرے دل کی طرح میری زبان بھی بڑی تھی۔ زارشی کے صحرا میں، میں نے جو منصوبہ بنایا تھا، اس پر عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ مگر تاب جمال کس میں تھی؟ اور پھر وہ شخص جو ایک عرصے تک رعنائی و نکہت سے دور رہا ہو، اس کا کیا عالم ہوگا؟ تمام آداب بالائے طاق رکھ کر اس کے بدن کے پھول نوچنے کی وحشت طاری تھی۔ میں نے بولنے کی کوشش کی، لفظ زبان پر اٹک گئے۔ پھر میں احتراماً جھکا اور میں نے کہا۔ ”میری وحشتیں درگزر کی جائیں کیونکہ میں عالم ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ جابر بن یوسف اور یماما کی عظمتوں کے سائے میں پھر پنہا گزیں ہے۔“

اس نے ایک ادائے دلبرانہ سے مجھے دیکھا تو میری ہمت دوچند ہو گئی۔ میں نے دوبارہ کہا۔ ”زارشی کی فضا میں گواہ ہیں کہ میں نے کہاں کہاں اُس کے قرب کی تمنا کی ہے۔ میرے سینے کے یہ اعزازات اس کے سوا کیا ہیں کہ مجھے دوبارہ اس کی بارگاہ میں واپس آنے اور اس کے جمال دل افروز سے سیر ہونے کی آرزو تھی۔ میرے دل میں ایک اضطراب برپا ہے۔ اے مقدس اور یماما۔ تجھ سے میرا حال مخفی نہ ہوگا میں اپنا سینہ چاک کروں؟“ اس کے لب سے پھول جھڑے۔ ”تمہیں دوبارہ باگمان میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ ایک بڑا اعزاز ہے جو اس سرزمین میں کم ہی لوگوں نے حاصل کیا ہے۔“

مجھے اپنی بلاغت پر ناز ہے۔ چند ہی لمحوں میں میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ لوریمہا کے تیوروں میں میرے لیے اثبات کی جھلک ہے اور جہاں یہ ذرا سی رعایت بھی مجھے مل جائے تو میری زبان نہیں رکتی۔ میری آنکھیں میری زبان کا ساتھ دیتی ہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ کر دیا۔ اس کے تیوروں میں گداز آ گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جہاں مجھے آگے بڑھنا تھا۔ بڑے اعتماد سے میں نے اس کا نرم و لطیف ہاتھ اپنے کٹیف ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے ایک بو سے پر اکتفا نہ کیا۔ میں انہیں چومتا ہی رہا۔ ”تم نے لوریمہا کو مایوس نہیں کیا۔“ اس کی آواز میں تاثر تھا۔ ”مجھے تمہاری شجاعت اور ذہانت سے یہی امید تھی۔“

”میں نے سوچا تھا میری گردن اعزازات سے جھک جائے کہ میں اس کے روبرو اعتماد سے اپنے دل کا احوال کہنے کی جسارت کر سکوں، لیکن..... لیکن..... میں کہتے کہتے رک گیا۔“

”لیکن کیا.....؟“ اس نے فوراً شوق سے پوچھا۔ وہ میری گفتگو میں تحلیل ہوئی جا رہی تھی۔

”لیکن جب میں جزیرہ باگمان کے ناظم اعلیٰ کے بارے میں سوچتا تھا تو میری ہمتیں پست ہو جاتی تھیں۔ میں نے اپنی سرفرازی کا عہد کر لیا تھا۔ پھر جب میں یہاں آیا تو ناظم اعلیٰ نے مجھے ملنے سے منع کر دیا۔ اس نے میرے راستے میں دیواریں حائل کر دیں۔ اس نے اس راستے پر آگ لگا دی جس سے گزر کر ایک طالب کو اپنے مطلوب کے پاس پہنچنا تھا۔“

وہ خاموش رہی۔ میں نے لوکا سا کے زہریلے رویے کے متعلق تمام باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر بیزار کی علامتیں ظاہر ہوئی ہیں۔ ”مقدس اقبال کے ایک فرستادے، زارشی کے زائر، جزیرہ توری کے ایک قبیلے کے سردار جابر بن یوسف کی اس جزیرہ پر جو پذیرائی ہوئی ہے وہ انصاف کی رو سے جائز تھی؟“ میں نے جواب طلب نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”لوکا سا۔“ اس نے زیر لب کہا۔ ”وہ یہاں کا ناظم، اعلیٰ اور یہاں کا سب سے طاقتور شخص ہے۔ اسی لئے لوریمہا نے اسے فضیلت کی سند دی ہے لیکن اس کے تمام احکام لوریمہا کی منظوری کے دست نگر ہیں۔ اس کی کوئی فضیلت لوریمہا کے تقدس سے ماورا نہیں ہے۔“

”بلاشبہ وہ سب پر قادر ہے لیکن اسے کسی طور محترم و مقدس لوریمہا پر بالادستی حاصل نہیں ہے۔ اگر وہ کسی کو اس قسم کا تاثر دیتا ہے تو وہ ان مروجہ اصولوں کی نفی کرتا ہے جو اس جزیرے کے نظام کی بنیاد ہیں۔ میں سمجھتا ہوں میرے ساتھ لوکا سا کا رویہ میرے مفادات کے حق میں نہیں ہے۔ مجھے مقدس لوریمہا کی امان چاہئے اور میں اسی بنا پر اس سے ملنے کے لئے بے تاب تھا۔“ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”تم لوریمہا کی امان میں ہو کیونکہ تم مقدس اقبال کی طرف سے بھیجے گئے ہو۔“ اس نے والہانہ طرز میں کہا۔ میں اس کے ہاتھوں پر بو سے خست کر رہا تھا۔

”کیا مجھے مقدس لوریمہا کو پوجنے کی اجازت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یقیناً، وہ بھی تم سے متاثر ہوئی ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”تم ایک آتش بیان اور آتش خصال مرد ہو۔“

”اے مقدس دیوی! میرے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میرے ہاتھ تیرے جسم اطہر سے مس ہونے کی سعادت کے لئے تڑپ رہے

ہیں۔ میرا روالاں لرز رہا ہے مجھے اجازت دے کہ میں تجھ سے اپنی بے پایاں محبتوں اور عقیدتوں کا اظہار کر سکوں۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں سرخی دیکھی اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کے بالوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ وہ خاموش رہی۔ یہ اعتماد کبھی اقبال کی بارگاہ میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کے بدن سے پھول توڑنے شروع کر دیئے۔

اس کی از خود رفتگی نے رفتہ رفتہ احترام و تقدس کے وہ بُت ڈھانے شروع کر دیئے جو اسے ایک دیوی اور مجھے ایک خادم کی حیثیت دیتے تھے۔ مگر لور یما اچانک چل کر میرے پہلو سے نکل گئی۔ اس نے جلتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور حاکمانہ انداز سے بولی۔ ”جابر بن یوسف! تمہاری قربت میں بڑی آسودگی ہے لیکن یہ میرے اور تمہارے دونوں کے لئے مضر ہو سکتی ہے۔ تم ایک سحر کار مرد ہو لیکن تم مجھ سے کبھی وابستہ نہیں ہو سکتے۔ میں مقدس اقبال کے حکم کے تحت صرف لوکا سا کو اپنے تصرف میں رکھ سکتی ہوں۔“

اس منہائے شدت میں ہوش کی یہ باتیں آدمی کو پاگل کر دیتی ہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ آخر یہی ہو گا لیکن میں اسے یہاں تک لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہی بات کافی تھی۔ میں حواس باختہ سا ہو گیا لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا اور اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا۔ ”مجھے اس کا احساس ہے۔ ہاں میں اس کا اہل نہیں ہوں۔“ میں نے اُسی سے کہا۔ ”میں مقدس لور یما سے معذرت خواہ ہوں کہ مقدس دیوی کی ساری نوازشیں لوکا سا کے لئے محفوظ ہیں..... مگر اے عظیم المرتبت دیوی! کیا مجھے یہ پوچھنے کی اجازت ہے کہ ایک ناظم اعلیٰ، دوسرے ناظم اعلیٰ کو اقتدار کس طرح منتقل کرتا ہے؟“

لور یما اسی طرح پُر وقار نظر آرہی تھی جیسے وہ پہلے تھی۔ اس نے میرے سوال پر حیرت سے مجھے دیکھا اور کہنے لگی۔ ”جب ایک ناظم اعلیٰ کے اعصاب جواب دینے لگیں اور وہ خود کسی کو نامزد کر دے یا اسے کوئی زیر کرنے کا دعویٰ کرے اور زیر کر بھی دے یا اس کی موت واقع ہو جائے اور اقتدار کے طالب لوگوں میں جو بھی مقابلے میں کامیاب ہو جائے، وہی اس کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔“

”مگر اسٹالا کے ساتھ تو یہ نہیں ہوا۔“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”اسٹالا.....“ لور یما نے کچھ دیر توقف کیا۔ پھر بولی۔ ”اسٹالا اقتدار چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا نائب ہی اقتدار کا اہل تھا کہ اس سے مقابلے پر کوئی آمادہ نہیں تھا۔“

”مقدس لور یما غیر معمولی روحانی قوتوں کی امین ہے۔ اسٹالا اچانک کیوں چلا گیا تھا، اس کے علم میں ہو گا۔“ میں نے جرات سے کہا۔

میرے سوال پر لور یما نے کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تو میں نے جو شیلے لہجے میں کہا۔ ”میں مقدس لور یما کے قرب کے لئے فنا ہونا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے اس کی اجازت مل جائے گی کہ میں لوکا سا سے اقتدار حاصل کرنے کے لئے اسے مبارزت کی دعوت دوں؟“

لور یما نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم۔ تم۔ نہیں..... نہیں تم جابر بن یوسف الباقر۔ جزیرہ توری کے شریف سردار۔ تمہیں مقدس اقبال نے بھیجا ہے۔ بہتر ہے تم اپنی تربیت مکمل کر کے یہاں سے چلے جاؤ اور اپنے لوگوں کی خبر لو۔“

لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں نے اسے لوکا سا کے ظالمانہ اور جارحانہ سلوک کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ میں نے کہا کہ جزیرہ باگمان

کے لوگ اس سے ناخوش ہیں۔ میں نے مصلحتاً اسٹالا سے ملاقات کا واقع اسے نہیں بتایا۔ وہ بے چارہ زارشی کی گرم دھوپ میں آوارہ پھر رہا تھا۔ لوکا سا سے مجھے جتنی نفرت ہوگئی تھی میں نے وہ سب لور یما کے گوش گزار کر دی۔ میرے طویل بیان پر اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ کوئی بھی لوکا سا کو کسی وقت چیچک کر سکتا تھا۔ میرا مطالبہ ناجائز نہیں تھا۔ لور یما اسے رد کر سکتی تھی۔ اس نے مجھے لوکا سا کی طاقت اور اس کے ساحرانہ اوصاف کے بارے میں خبردار کیا لیکن میں جمار ہا۔ پھر اس نے مجھے سوچنے کا موقع دیا۔ میں نے اس غنیمت لمحے سے فائدہ اٹھا کر اس کی بارگاہ میں کسی رکاوٹ کے بغیر گاہے گاہے حاضری کی اجازت حاصل کر لی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گی کیونکہ میں ان تمام لوگوں سے مختلف تھا جو اس جزیرے پر بستے تھے۔ میں ان کے لئے ایک عجوبہ تھا۔ میرے نقش و نگار ترشے ہوئے اور میری زبان سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

میں نے لور یما کے سامنے ایک بہت بڑا دعویٰ کر دیا۔ میں جو پہلے سے ایک جزیرے کا سردار تھا اب دوسرے جزیرے پر حکمرانی کا جال بچھا رہا تھا۔ مجھے اپنی اس جرات میں ناکامی کی سزا موت کی صورت میں ملنی تھی۔ جمہور پڑی میں واپس آنے کے بعد میں نے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سرنگ کو یاد کیا اور کاہوکی روح کو طلب کیا۔ وہ روح جب اپنے بوڑھے جسم کے تخیل میں نمودار ہوئی تو میں نے اسے سارا منسوبہ بتا دیا۔ کاہو کے خدشوں اور وسوسوں کے باوجود میں نے اصرار کیا کہ وہ میری مدد پر کمر بستہ رہے اور باقی کام مجھ پر چھوڑ دے۔ پھر اس رات میں نے اقبال کے حضور بھی اپنی کامیابی کے لئے فریاد کی۔ دوسرے دن صبح مجھے پھر لوکا سا کے دربار میں طلب کیا گیا اور لوکا سا نے سخت نفرت اور اشتعال کے عالم میں میری رواں دواکی کے احکام صادر کر دیئے۔ میں نے چلتے وقت لور یما سے ملنے کی درخواست کی جسے جبراً قہراً منظور کر لیا گیا۔ اس بار مجھے رسمی طور پر لور یما سے ملوایا گیا۔ اس آخری ملاقات کے لئے جب جزیرہ باگمان سے کوئی طالب علم کامیاب ہو کر جزیرے میں جاتا ہے۔ اس مرتبہ لور یما سے میری کوئی بات نہیں ہو سکی۔ میں نے رقت کے ساتھ اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اس وقت لوکا سا ہم دونوں کے درمیان موجود تھا۔ لور یما تخت پر متمکن تھی۔ اس کے ارد گرد کنیزوں کا ہجوم تھا۔ لوکا سا اس کے پہلو میں پورے طنطنے سے کھڑا ہوا تھا۔ رخصت ہونے سے کچھ دیر قبل میں نے لور یما کے دربار میں اس کی کنیزوں ناہین اور لوکا سا کی موجودگی میں یہ اعلان کیا کہ سلطنت اقبال کا ایک فرد، جابر بن یوسف الباقر جزیرہ باگمان کے اقتدار کے لئے لوکا سا سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔

میرے اس ڈرامائی اعلان پر لور یما کے سوا تمام افراد حیرت زدہ رہ گئے۔ لوکا سا نے مجھے قہراً آلود نظروں سے دیکھا۔ میں ان تمام افراد کے رد عمل سے بے نیاز لور یما کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ لور یما نے اپنے کاہن کی طرف اشارہ کیا جس نے اپنی سپاٹ آواز میں مجھ سے کہا۔ ”جابر بن یوسف! مقدس لور یما ازراہ ہمدردی تمہیں اپنے دعویٰ پر نظر ثانی کا حکم دیتی ہے۔“

”اس کا حکم میرے لیے باعث فخر ہے۔“ میں نے تمام تر احترام سے کہا۔ ”لیکن میں نے یہ دعویٰ پورے ہوش و حواس میں کیا ہے۔“

باگمان کے کاہن نے لور یما کا عندیہ پا کر دربار میں رسمی طور پر اعلان کیا۔ ”جزیرہ طوری کے سردار جابر بن یوسف الباقر کو باگمان کے ناظم اعلیٰ لوکا سا سے مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ مقابلہ باگمان کے تمام باشندوں کے سامنے حسب دستور پانچ یوم بعد منعقد ہوگا۔ دونوں حریفوں کے مقابلے سے دست بردار ہونے کے لئے ایک دن دیا جاتا ہے۔“

اس اعلان کے ساتھ ہی لوریما چلی گئی۔ اور میں اس کے خصوصی دستے کی امان میں اپنی جھونپڑی میں واپس پہنچا دیا گیا۔ لوکا سا کے گمراہ اٹھالیے گئے۔ میں اس بات سے بے خبر نہیں تھا کہ لوکا سا بہت فتنہ جو حیلے باز اور کمینہ شخص ہے۔ مقابلے سے قبل وہ مجھے خوف زدہ کرنے، ڈرانے، دھمکانے کی کسی کوشش سے باز نہیں رہے گا۔ مجھے وہ بد بخت کم ہی نقصان پہنچا سکتا تھا، اس لیے کہ میرے گلے میں خاصی چیزیں دفاع کے لئے موجود تھیں۔ ادھر میں نے کاہوکو اپنی گمرانی کے لئے مقرر کر دیا۔ میں اس مقابلے میں اپنے تمام اسلحہ سے کام لینا چاہتا تھا۔ لوکا سا سے محض جسمانی طاقت کا مقابلہ نہیں تھا۔ میرے پاس کاہو موجود تھا۔ میرے گلے میں شپالی، جارا کا کاکی کھوپڑی اور سمورال کی مالا تھی۔ وہ ہڈ اسرار علوم کا تربیت یافتہ تھا۔ اگلے چار دن مجھ پر بہت بھاری گزرے۔ میں اس دوران غیر معمولی خطرات میں گھرا رہا۔ میری جھونپڑی میں زہریلے سانپ بلوں سے اُبلنے لگے اور حشرات الاراض کا ایک اژدہام جمع ہو گیا۔ میرے لیے پیال کے بستر پر سونا محال ہو گیا مجھے ہر وقت خوفناک آوازیں سنائی دیتیں۔ میرے کھانے میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ میں زہریلی چیونٹیوں اور بچھوؤں کے بستر پر سو گیا۔ کاہوک کی روح وہاں منڈلا رہی تھی۔ وہ بھول رہا تھا کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں اس دوران شدید طور پر مصروف رہا۔ مجھے بستی میں آنے جانے کی آزادی تھی۔ ان لوگوں کے چہرے میرے اعلان سے دمک رہے تھے لیکن اب وہ میرے قریب آتے ہوئے ڈرتے تھے میں انہیں اپنا ہم نوا بنا کر اور مقابلے کے موقع پر اپنے حق میں ان سے نعرے لگوا کر لوکا سا پر نفسیاتی اثر ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ میرے قریب نہیں آتے تو میں خود ان کے پاس پہنچ جاتا۔ میں نے اپنا کھانا چھوڑ دیا۔ میں ان لوگوں کا لقمہ ہاتھوں سے چھین لیتا۔ اس بات سے وہ خوش ہوتے۔ وہ سب دلی طور پر دیوتاؤں سے میری کامیابی کے لئے دُعا کر رہے ہوں گے اور دیوتاؤں کو لوکا سا کی ناپسندیدگی کا اندازہ ہوگا۔ نکری، اس کی بوڑھی ماں، اسالا اور نہ جانے کتنے لوگ لوکا سا کے قہر و غضب کا ہدف بن چکے تھے۔ اس کی موت کوئی اسے چیلنج کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صرف میں ایک اجنبی تھا جس نے ایک دھماکہ کر دیا تھا۔ وہ انگلیاں اٹھا کر میری طرف اشارہ کرتے تھے۔ ”یہ ہے وہ۔“

اور یہ شخص جو آپ سے مخاطب ہے، اسے اپنے حال پر بعض اوقات بڑی ہنسی آتی تھی۔ وہ تاریک براعظم میں آکر کتنا بدل گیا تھا وہ یہاں ایک اجنبی کی حیثیت سے وارد ہوا تھا۔ اس میں کتنی انقلاب انگیز تبدیلیاں آئی تھیں۔ زندگی بھی عجیب چیز ہے۔ اسے باقی رکھنے کے لئے آدی کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ ایک ذرا کہیں زندگی کی اُمید پیدا ہوتی ہے تو وہ ایک نقطے سے کتنی پھیل جاتی ہے۔ حرص و ہوس کا کیسا لامتناہی سلسلہ ہے جو کہیں ختم نہیں ہوتا۔ پانچویں روز حسب اعلان اسی جگہ جہاں جشن لوریما منعقد ہوا تھا، ساری بستی موجود تھی۔ کیا اس مقابلے کی روداد تفصیل سے لکھی جائے..... نہیں، یہ مقابلہ کسی طرح بھی اقبال کے دیدنی ناگفتنی جلوے کے رُوبرُو ہونے والے مقابلے سے زیادہ تہلکہ خیز نہیں تھا۔ مگر اس کی نوعیت بڑی سنگین تھی۔ میں نے خود کو دواؤ پر لگا دیا تھا۔ لوریما نے میرا یہ مطالبہ مسترد کر دیا کہ یہ رزم آرائی محض جسمانی طاقتوں تک محدود ہے۔ اس درخواست سے میرا مقصد اپنے حریف لوکا سا کو اپنی جسمانی طاقت سے متاثر کرنا تھا۔ شوالا سے مقابلے اور جشن لوکا سا کو اپنی جسمانی طاقت سے متاثر کرنا تھا۔ شوالا سے مقابلہ اور جشن لوریما پر ہونے والے مقابلوں کا ذکر میں تفصیل سے کر چکا ہوں۔ مگر یہ بے حد سنسنی خیز تھا۔ اس سے جزیرہ باگمان کے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہو سکتا تھا۔ لوریما اپنے خاص تخت پر مشتاق نظروں سے ہم دونوں کو میدان میں دیکھ رہی تھی۔ اس معرکے کا اعلان ہوا تو میں

نے کا ہو کو مستعد رہنے کا اشارہ کیا۔ کاہو تمام مقابلے میں میرے ساتھ رہا۔ تفصیل کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ رنگے ہوئے جسم کا لوکا سا کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ اس نے اپنی حیرت انگیز پُر اسرار طاقتوں کا مظاہرہ جس شان اور جس اعتماد سے کیا، میں اس میں کسی طرح کا میاب نہیں ہو سکتا تھا لیکن میرے پاس درخشاں شپالی تھی اور میرے پہلو میں کاہو تھا جو کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا، آگ کے شعبدے، درندوں کی یلغار ایک ساتھ کئی خنجروں کے بھرپور وار، بینائی ختم کر دیتا۔ رسیوں سے مکمل طور پر جکڑ دینا۔ غرضیکہ ان پُر اسرار کرشموں کی تعداد بیان کرنے کے لئے ایک وقت چاہئے۔ میں جو چھوٹے موٹے عمل جانتا تھا۔ وہ لوکا سا کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے خود کو مشق ستم کے لئے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ کاہو نے مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔ صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا جہاں مجھے اُسے دُوبد و جنگ کا موقع ملا۔ وہ طاقت میں میرا ہم سر نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کہ زارشی میں میرا بدن جیسے فولاد میں ڈھال دیا گیا تھا۔ میں خانقاہ کی بھٹی میں تپ کر آیا تھا۔ اسی ایک موقع پر میں نے اسے ہوش نہیں لینے دیا اور سارے مجمع پر اپنی جسمانی برتری کی دھاک بٹھادی۔ لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے بہت سے حملے ناکام ہو چکے ہیں۔ میں نے خود کوئی حملہ نہیں کیا لیکن وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکا تھا۔ اس جنگ نے خاصا طول کھینچا جزیرہ باگمان کا مضبوط ناظم اعلیٰ جس سے باگمان کا ہر باشندہ لرزتا تھا۔ وہ ایک اجنبی شخص کو زیر کرنے کی ہر ممکن کوشش میں تمللاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ہم دونوں کے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ کاش، میں پہلے مقابلوں کی روداد بیان نہ کرتا اور اس لرزہ خیز معرکے کا نقشہ کھینچتا۔ اب تک میں اپنا دفاع کر رہا تھا، سہ پہر کے قریب جب لوکا سا اپنے مسلسل حملوں کی ناکامی سے زچ ہونے لگا تو میں اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور میں نے اس کے سینے پر ایک زبردست لات رسید کی۔ وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھا۔ گر گیا اور گر کر فوراً اُٹھ گیا۔ اس نے مجھ پر چھینٹنے کی کوشش کی۔ میری دوسری لات سے اس کی کوئی پہلی ٹوٹ گئی اور وہ بلبلا کر زمین پر ڈھیر ہونے لگا۔ لیکن جب وہ شدید درد اور نفاحت کے عالم میں دوبارہ زمین سے اُبھرا تو مجھے احساس ہوا وہ شوالا نہیں ہے، اس کی پھرتی اور طاقت یقیناً شوالا سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے مجھے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا دبوھر کر دیا۔ مجھ سے تخمینے کی غلطی ہو گئی۔ میں نے جزیرہ توری کی سرداری بھی کھوئی اور اقبالہ کے حصول کا ارمان میرے دل میں ہی رہ گیا۔ یہ میں نے کیا کیا۔ یقیناً یہ میری خود اعتمادی کی سزا ہے۔ اب اُس کی باری تھی۔ وہ مجھے سنہلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا، جیسے اس پر کوئی شیطان سوار ہو گیا ہو۔ میں اس رزم گاہ کا احوال اختصار سے بیان کرنے کی زیادتی کر رہا ہوں۔ جزیرہ باگمان کے مقتدر شخص لوکا سا نے کئی بار مجھے یہ احساس دلایا کہ ایک ناظم اعلیٰ کو کتنی قوت اور دوسروں پر کتنی فوقیت کا حامل ہونا چاہئے۔ اس نے ایسے بھرپور وار کیے کہ کاہو اگر میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں خوف و دہشت سے حوصلہ کھو بیٹھتا۔

لیکن یہ مقابلہ حیرت انگیز طور پر اتنی جلد اور اچانک ختم ہو گیا جس کی توقع کسی کو نہ ہوگی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے خود کو ہزیمت کے لئے تیار کر لیا تھا لیکن میں ایک مرد آدمی کی طرح آخر دم تک اپنا دفاع کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس وقت دوبارہ ایک ایسا لمحہ آیا جب مجھے دُوبد و لوکا سا سے جسمانی قوت آزمائی کا موقع ملا اور میں نے غصے کے عالم میں اُسے اٹھا کر زمین پر پٹنچ دیا۔ اُسی لمحے کاہو نے مجھے اشارہ کیا۔ ”جابر بن یوسف! تم حوصلہ کھو رہے ہو۔ جلد از جلد اپنے گلے سے شپالی اتار کر اس کے بدن پر پھینک دو۔ اور یہ عمل مسلسل دہراؤ۔ چنانچہ اس کے اُٹھنے سے پہلے میں نے شپالی اس کی طرف اُچھال دی۔ نہ جانے اس چھوٹے سے ہیرے میں کون سی حدت تھی کہ لوکا سا تڑپنے لگا۔ اس کے جسم پر داغ پڑ گیا۔ میں نے دوبارہ

شپالی اٹھا کر اس پر دے ماری اپنے داغ داغ جسم کے باوجود ایک دفعہ اس نے شپالی اپنے ہاتھ میں پکڑ لی لیکن دوسرے ہی لمحے بلبلاتا کر چھوڑ دی۔ کاہو نے بھی مجھے نصیحت کی کہ میں اسے ہر حال میں ختم کر دوں۔

میں اس پر ٹوٹنے کے لئے جست لگا ہی رہا تھا کہ میرے قدم ایک خاص جگہ آ کر رُک گئے۔ جیسے انہیں کسی نے جکڑ لیا ہو۔ لوکا سا نے اپنا آخری وار یہی کیا تھا۔ میں آگے بڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک دیوار میرے آڑے آگئی تھی۔ کاہو نے ان خجروں، اُن پتھروں اور نیزوں کی طرف میری توجہ مبذول کرائی جو لوکا سا نے میری طرف پھینکے تھے۔ میں نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ان سے لوکا سا کا جسم چھید دیا اور لوکا سا، جزیرہ باگمان کے ناظم اعلاء، ایک شیطان ایک فرعون اور ایک سنگ دل شخص نے وہیں دم توڑ دیا۔ اس نے خوب مقابلہ کیا۔

دوسری طرف کاہن نے اعلان کیا۔ ”دیوتا اس کے گواہ ہیں۔ جزیرہ باگمان پر لوکا سا کا تسلط ختم ہوا۔ اب جزیرہ توری کا سردار جابن بن یوسف الباقر جزیرہ باگمان کا ناظم اعلیٰ ہے۔ کاہن اعظم کا آخری جملہ بجوم کے شورغل میں کہیں گم ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ انہوں نے اس اعلان کے ساتھ ہی دیوانگی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ وہ زمین پر قلابازیاں کھانے لگے۔

ان کے باجے کا شور ایک دم بڑھا اور وہ مستانہ وار جہاں کھڑے تھے وہیں اچھلنے لگے میں نے ان کی سمت دیکھ کر ان کے نعرہ ہائے تحسین کے جواب میں اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے زور زور سے ہلانے شروع کر دیئے۔ میرے اس طرز عمل سے وہ اپنا دائرہ توڑ کر میری طرف بھاگے اور انہوں نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا اس لیے کاہن نے پھر انہیں اپنی اپنی جگہ واپس جانے کا حکم دے دیا تھا۔ باگمان کے انتظامی معاملوں سے متعلق لوگ بڑھتے ہوئے بجوم کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔ بجوم کا رخ لوکا سا کی لاش کی سمت تھا۔ جب مجمع میرے گرد سے چھٹ گیا تو میں نے ایک نظر لوکا سا کے جسم پر ڈالی۔ اس کا جسم نیزوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور خون سے اس کا سارا جسم سرخ ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی یہ عبرت انگیز حالت دیکھ کر ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ میں اس کے جسم پر ٹھوکریں مارنا اور اُسے نکلے نکلے کر کے درندوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ یہ مقابلہ صحرائے زارشی کے عظیم تختے شپالی کی وجہ سے اچانک ختم ہو گیا تھا۔ اس کی گردن مروڑنے اور اپنے ہاتھوں سے اس پر ضربیں لگانے کا موقع مجھے نہیں مل سکا تھا۔

کاہو مجھے مبارک باد دے کر آسمان کی طرف کوچ کر گیا تھا اور اب میری نظریں لوریمیا کی طرف مرکوز تھیں۔ لوریمیا پھولوں کی ملکہ، اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی وہ حسین ترین پری پیکر لڑکی اب میری تھی جب میں اس کے نزدیک پہنچا تو کاہن نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے ایک طرف کھڑا کر دیا۔ اس نے ایک دیوار کے سامنے ہاتھ اٹھائے۔ اس کے ہاتھ اٹھاتے ہی سفید دیوار سیاہ ہو گئی اور کاہن کے مسلسل عمل پڑھنے اور اس پر تو اتر کے ساتھ کچھ پھینکنے کے بعد ایک مبہم سا ہیولا نمودار ہوا اور مجھے حیرت ہوئی کہ اس میں حرکت سی پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی جگہ بدلی اور پھر وہ ایک جگہ ٹھہر گیا۔ میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ مگر وہ کسی جانور سے مشابہ تھا۔ یہ غالباً ایک شگون تھا۔ اس دلچسپ کام سے فارغ ہو کر کاہن نے پتھر کی ایک رکابی میرے سامنے کی۔ رکابی پر عقاب کی شکل کا ایک پرندہ گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اسے ہاتھ میں لے کر بوسہ دوں مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ میں نے اسے جھپٹ کر اٹھا لیا، وہ میرے ہاتھوں میں آ کر شدت سے پھڑ پھڑانے اور

مچنے لگا۔ لیکن میں نے اسے اپنی گرفت سے نہیں چھوڑا۔ میں اس کے دو ٹکڑے کر دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ بہت کریہہ صورت پرندہ تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کے مانند تھیں۔ چارونا چار میں نے اس کے پروں کو بوسہ دیا۔ کاہن نے اسے میرے ہاتھ سے جھین کر ہوا میں اچھال دیا۔ وہ پھرتی کے ساتھ لوریمہ کے بت کے شانے پر بیٹھ گیا اور کاہن نے ایک طشت میں جلتی ہوئی آگ سے لوہے کی سلاخ نکال کر میری بائیں ران میں گھسیڑ دی۔ درد کی شدت سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے اپنی کراہ حلق میں قید کر لی تھی۔ میری ران پر ایک سرخ نشان پڑ گیا تھا لیکن میں مضبوطی سے اپنے قدموں پر کھڑا رہا پھر کاہن نے میرا چہرہ اوپر اٹھایا اور کچھ پڑھ کر پھونکا اور میری آنکھیں کھول کر ان میں کوئی سفوف جھونک دیا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں میں مرچیں جھونک دی گئی ہوں۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کاہن اسی طرح عمل دہراتا اور میرے ضرب و ضبط کا امتحان لیتا رہا۔ میں یہ تمام ستم خاموشی سے سہتا رہا۔ اس وقت میں خود اپنی نظروں میں تماشا بنا ہوا تھا۔ وہ باگمان کی مسند سنبھالنے سے پہلے مقدس رسمیں ادا کر رہا تھا اور میری تطہیر ہو رہی تھی۔ آخر میں اس نے ایک بڑا اژدہا مروڑ کر میرے گلے میں ڈال دیا جو اس کی انگلی کے ایک اشارے سے میرے گلے میں آتے ہی ٹھوس لکڑی کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ ان حیرت انگیز اور صبر آزما مراحل سے گزر کر مجھے لوریمہ کے سامنے آنے کا موقع ملا۔ میں نے احتراماً اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے لوریمہ کی آنکھوں میں خون تھا۔ ایسی سرخی اور ایسی وحشت جو میں نے آج تک کسی انسانی آنکھ میں نہیں دیکھی تھی۔ میری نظریں خود بخود جھک گئیں اور میں نے اس کے مرمریں پاؤں کا بوسہ لے لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اپنے ہونٹ آگ پر رکھ دیئے ہوں۔

”جابر بن یوسف!“ کاہن کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ میں نے سر اٹھایا۔ جزیہ باگمان کے ناظم اعلیٰ!“ اس نے کہا۔ ”تمہیں مقدس لوریمہ کی سرپرستی حاصل رہے۔ تم اس وقت تک اس جزیہ کے حکمران ہو جب تک باگمان میں تمہارا ہم سر کوئی دوسرا فرد نہیں ابھرتا۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور حسرت و یاس سے ایک بار پھر لوریمہ کو دیکھا۔ اب تک سارا مجمع خاموشی سے کاہن کے عجیب و غریب ٹوٹے ٹوٹے دیکھ رہا تھا۔ جب لوریمہ نے کھڑے ہو کر اپنے گلے سے ایک ہار اتار کر میرے گلے میں ڈال دیا تو مجمع میں پھر شور مچا اٹھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کاہن کے اشارے پر لوریمہ کی سواری، بادبہاری، اس بت سمیت اٹھالی گئی جس کے پہلو میں وہ قاتل بیٹھی ہوئی تھی چلتے چلتے وقت میں نے مسکرا کر اسے مشتاق نظروں سے دیکھا۔

وہ رخصت ہوئی تو شراب کے برتن کھل گئے اور ہجوم سرمستیاں کرنے لگا۔ پھر کوئی نظم نہیں رہا۔ پھر آدمی کی پہچان مشکل ہو گئی۔ ان کے لئے یہ سارا منظر اندھیرے کا تھا، ہر طرف مشعلیں جل رہی تھیں مگر میری آنکھوں سے باگمان کا طلسمی اندھیرا دور ہو چکا تھا۔ ان کے لئے ہر ساعت رات تھی۔ میری آنکھیں شب و روز کے طلوع و غروب دیکھنے پر قادر تھیں۔ وہ بے قابو ہو کر عجیب عجیب قسم کی چیخیں منہ سے نکال رہے تھے۔ لوکا سا کی لاش کے گرد اب ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ وہ نیزوں سے اس کے جسم کے ٹکڑے کر رہے تھے اور اسے پیروں سے روند رہے تھے جس کے ہاتھ میں گوشت کا ٹکڑا آجاتا وہ ایک نعرہ لگا کر اسے گیند کی طرح ہجوم میں کسی شخص کی طرف پھینک دیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس کی آنکھیں نکال لیں اور انہیں مشعلوں کی نذر کر دیا۔ میدان میں لوکا سا کی لاش کی جگہ اب کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اس کے جسم کے چیتھڑے اڑا کر نہ جانے کہاں کہاں بکھیر دیئے تھے۔ جب میں ان کے درمیان سے گزرا تو باگمان کی عورتیں مردوں کی آغوش سے نکل کر میری طرف لپکیں اور انہوں نے میرے جسم کے ہر

حصے پر بوسے نچھاور کرنے شروع کر دیئے۔ میرے لیے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا، میں انہیں چھیڑتا اور مسکراتا ہوا کابالو کے ساتھ آگے آ گیا۔ میرے پیچھے لوکا سا کے تمام ناٹین تھے۔ میں اس وقت ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں بری طرح تھکا ہوا تھا اور سکون سے سوچنے کے لئے کچھ وقت درکار تھا میں نے کابالو کو آواز دی۔ وہ میرے سامنے زمین پر گر گیا۔ ”معزز جابر! تمہارا غلام تمہارے حکم کا منتظر ہے۔“ اس کے بدلے ہوئے لہجے سے میرے چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی۔ ”معزز کابالو! مجھے میری قیام گاہ لے چلو مگر کیا تم اب بھی میری بینائی معدوم کر دو گے؟“

”آہ معزز جابر! تم نے ہم پر اپنی برتری ثابت کر دی ہے۔ کابالو اس گستاخی کی جرات نہیں کر سکتا۔ میں تمہارا غلام ہوں۔ وہ لوکا سا کا حکم تھا اور ناظم اعلیٰ کا حکم ماننا میرے فرائض میں داخل ہے۔“ کابالو نے پشیمانی سے کہا۔

”ہاں کابالو! میں نے سرد لہجے میں کہا۔“ جس کے پاس طاقت ہے، تمام چیزیں اس کی محکوم ہیں۔ زندگی طاقت کا کھیل ہے۔ موت طاقت کا زوال ہے۔ میں تم سے کوئی جواب طلبی نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم اپنے نئے آقا کو اپنا دوست سمجھ سکتے ہو۔ میں نے اس جزیرے پر ظلم و ستم اور خوف و ہراس ختم کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا ہے، حالانکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں پہلے ہی ایک قبیلے کا سردار ہوں لیکن لوکا سا جیسے بدطیبت اور ظالم شخص کو زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہنا چاہئے تھا۔“

”کابالو معزز جابر کے لیے ہر قربانی کو تیار رہے گا۔“ کابالو نے نیاز مندی سے کہا۔

یہی طاقت و اقتدار کی فوقیت، اس کا نشہ ہے کہ لوگ اس کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ آنکھیں اور انداز بدل جاتے ہیں۔ طاقت کی سرخوشی خوشامد میں ہے، جس کی سب سے زیادہ خوشامد کی جائے وہ طاقت ور ہے۔ مجھے جلد ہی ناظم اعلیٰ کی اقامت گاہ پر پہنچا دیا گیا۔ ایک غار کے اندر کمروں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ عمارتی اعتبار سے یہ مکانات اتنے شان دار تو نہیں تھے مگر جزیرہ توری کے سرداروں کی جمہورپیڑیوں سے نسبتاً بہتر تھے۔ میں اندر داخل ہوا تو یکایک میں نے اپنے پیچھے آنے والوں کی طرف مرکز دیکھا اور پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ کے بعد انہیں رخصت کر دیا۔ مختلف کمروں میں جگہ جگہ پتھر کی مورتیاں اور عجیب شکل کے جانوروں کی شمشیں دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔ میں اس وسیع مکان کا ایک چکر لگا کر اس کمرے میں آ گیا جہاں لوکا سا آرام کرتا تھا۔ اس سے ملحق ہی وہ کمرہ تھا جہاں لوکا سا ظلم کرتا تھا اور پھر ایک عبادت گاہ تھی۔ اس مکان میں دن ہونے کے باوجود اندھیرا تھا۔ سارا مکان خالی تھا اس لیے کہ ہر شخص بستی میں نئے سردار کے جشن میں شریک تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ مجھے سکون کی ضرورت تھی۔ اقتدار کا بوجھ میرا سر بوجھل کیے ہوئے تھا۔ میں زمین کے اس حصے پر لیٹ گیا جسے لوکا سا نے اپنے بستر کے طور پر استعمال کیا ہوگا۔ سر زمین پر رکھتے ہی میرے جسم میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا اور ذہن عجیب عجیب خیالوں سے گھر گیا۔

لیکن ابھی میری آنکھیں بند ہی ہوئی تھیں کہ مجھے کمرے میں مختلف جانوروں کی چیخ و پکار سنائی دی اور یہ دیکھ کر میرا دماغ پھٹنے لگا کہ دیواروں پر ایستادہ جانوروں کی پتھر اور لکڑی کی مورتیاں متحرک ہو گئی ہیں۔ دیواروں پر بنی ہوئی شبیہوں نے حرکت شروع کر دی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا، مشعل کی لود ہم پڑ گئی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کئی سائے میری طرف بڑھ رہے ہوں۔ ان کے ہذیانی قہقہے لہجہ بلحہ میرے قریب ہو

رہے تھے۔ دیوار پر ایستادہ ناگوں کے مجسمے اب اصل سانپوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ لنگور خوف ناک نظروں سے مجھے گھور رہا تھا اور کئی نیولے بیک وقت میری طرف بڑھ رہے تھے۔ چاروں طرف میرے گرد دائرہ تنگ ہو رہا تھا۔ لوکا سا کے اس مخصوص کمرے میں ہر طرف اس کے طلسمی حلیف اپنے مردہ آقا یا اس کی روح کی ایما پر میری ہلاکت کے درپے تھے۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اگر ان کی تعداد کم ہوتی تو میں انہیں یکے بعد دیگرے ختم کر سکتا تھا میری قوت فیصلہ ختم کیے دے رہے تھے۔ میں نے مضبوطی سے جارا کا کاکی کھوپڑی اور اپنے گلے میں پڑے ہوئے تمام مالاؤں کو پکڑ لیا، پھر میں نے انہیں اپنی تمام قوت مجتمع کر کے للکارا۔ ”اے لوکا سا کے شیطانی فتو! خبیث رُوح! تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بہتر ہے کہ تم اپنی جگہ واپس چلے جاؤ۔ اب وہ مرچکا ہے اور یہ مکان میرا ہے اور میں یہاں کا ناظم اعلیٰ ہوں۔“

میری آواز پر ان کی چیخ و پکار میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ جب وہ میرے بہت قریب آ گئے تو مجھ پر حملہ کرنے سے جھجکنے لگے۔ شپالی تیزی سے چمک رہی تھی اور میرے گلے میں پڑا ہوا سانپ کا چوٹی ڈھانچا اب ایک بڑے اثر دھم کی صورت پھن اٹھائے میرے سینے پر لہر رہا تھا۔ یہ سانپ آج ہی باگمان کے کاہن نے میرے گلے میں ڈالا تھا۔ اس کی پھنکار سے میری ہمت بڑھی اور میں نے بڑھ کر ایک نیولے کو پکڑ لیا اور اس کے سرے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پوری طاقت سے مروڑ دیئے اسے ایک مڑی ہوئی لکڑی کی صورت میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگی۔ اسی لمحے میں نے انہیں پھر مخاطب کیا۔ ”اب تم میری امان میں آ جاؤ ورنہ لوکا سا کی طرح تمہارا حشر بھی خراب ہوگا۔ اپنی اپنی جگہوں پر واپس جاؤ اور نئے سردار کی اطاعت قبول کر لو۔ میری فضیلت اور لوکا سا کی ہزیمت کی علامت ہے اور اگر یہاں لوکا سا کی شکست خوردہ روح موجود ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ برگزیدہ کاہن کی رُوح کسی وقت بھی طلب کی جاسکتی ہے کیا آسمان میں بھی وہ سکون سے رہنا نہیں چاہتا۔ جابر بن یوسف الباقر پر مقدس جارا کا کاکی رُوح کا سایہ ہے اور مقدس اقبال کی برکتیں اس کے ساتھ ہیں۔ میں چند لمحوں کے اندر کمرے کے پُر سکون دیکھنا چاہتا ہوں۔ ورنہ میں شپالی کے کام لوں گا اور میرے سینے پر یہ لہراتا ہوا اثر دھاسب کو غارت کر دے گا۔“

لیکن ان کے قہقہوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ نتیجتاً میں نے اثر دھاز میں پرچھوڑ دیا اور شپالی چاروں طرف گھمانی شروع کر دی۔ میرے اس عمل سے وہ پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے جھک کر مشعل اپنے ہاتھ میں لے لی اور اسے ان کے جسموں پر مارنے کے ارادے سے ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ ادھر جس سمت اثر دھارینگ رہا تھا وہ وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ لمحوں میں میرے ان پے درپے حملوں سے وہ اپنی جگہوں پر واپس ہونے لگے۔ ان کے شور میں اسی رفتار سے کمی آتی گئی اور کمرہ دفعتاً پُر سکون ہو گیا۔ میں نے ایک گردے کر شپالی اپنے گلے میں ڈال لی اور کسی خوف کے بغیر اثر دھاسے کو پکڑ کر اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ ”اب تمہارا کام ختم ہوا۔“ میں نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ”تم کاہن باگمان کے اشارے کی طرح اپنے جسم تبدیل کر لو۔“ میرے یہ کہتے ہی اثر دھالکڑی کی شکل میں تبدیل ہو گیا جس میں وہ تھوڑی دیر پہلے تھا۔ یہ میرے توانا اعصاب کی فتح تھی۔ باگمان کی سرداری کی اہمیت میری نظروں میں دوچند ہو گئی۔ یہ کھلونے جو دیوار پر اب مجسموں کی صورت میں لٹکے ہوئے تھے، انہیں دیکھ کر میرا سینہ فخر سے تن گیا اور مجھے یہ سب بہت دلچسپ بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ یہ طلسمی کھلونے کسی سردار کی فوج ہیں، انہیں کسی وقت بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس طلسم خانے کی کسی بات پر حیرت کا اظہار بے معنی تھا۔ میں نے یہ سب مظاہرے جیسے وہ نظر آتے تھے، جوں کے توں قبول کر لیے تھے۔ میں ہر لمحے

کسی بھی عجیب و غریب کرشمے کی توقع کرتا تھا اور اپنی سرسراہٹ اور پتوں کی جنبش سے محتاط رہنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ کیوں، کیا اور کیسے کا کیا سوال تھا؟ سرنگا نے مجھے ایک بار مشورہ دیا تھا کہ جو کچھ نظر آئے اُسے قبول کر لو اور یہ سوچنے کی کوشش چھوڑ دو کہ وہ کیوں ہے؟ اس لامحدود کائنات میں کیوں کا جواب انسانی ذہن کے لئے موزوں نہیں ہے۔ انسان اس جواب کا متحمل نہیں ہو پاتا، اس کا دماغ پھٹ جاتا۔

اس ہول ناک واقعے پر زیادہ کچھ سوچنے کی بجائے میں نے دوبارہ آنکھیں موند لیں اور اطمینان سے اپنے پیر پھیلا دیئے۔ میرے ذہن پر اس کا غلبہ تھا اور میں خود سے سوال کر رہا تھا۔ جابر بن یوسف الباقری عزمین، کیا تو نے سوچا کہ وہ تیری اس جرات اور فتح یابی سے خوش ہوگی؟ کیا اس بلند اقبالی کے بعد اس تک رسائی آسان ہو جائے گی؟ کیا اس تنگ دل فتنے کے دل میں کوئی گوشہ تیری سمائی کے لئے ابھرائے گا؟ وہ جانتی تو ہوگی کہ تو نے خود کو اس کی نظروں میں ممتاز کرنے اور اس کے گرد و پیش لوگوں کے درمیان خود کو ہر اعتبار سے برتر قرار دینے کے لئے ہی یہ قدم اٹھایا تھا۔ اسے طاقت اور مردانگی کے کھیل پسند ہیں۔ یہ مبارزت اس کی نظر میں قابل تحسین تو ہوگی۔ اسے احساس تو ہوگا کہ جہاں میری آسودگی کا امکان تھا۔ وہاں میں نے اس کی خاطر ترک خواہش اور ضبط نفس کا تیرہ اختیار کیا۔ میں نے قناعت کے بجائے جدوجہد کو اپنا مقصد بنایا۔ یہ میں نے کیوں کیا؟ اسے مردانہ روش اور میرے عاشقانہ اوصاف کا پتہ ہوگا؟ یا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی؟ بہر حال اب مجھے جلد سے جلد اپنے جزیرے کے لیے روانہ ہو جانا چاہئے۔ نہ جانے اس ہندی بوڑھے سرنگا کا کیا حال ہو اور سریتا پر کیا گزر رہی ہو اور میرے جزیرے کے لوگ کیسے ہوں؟ انہی یادوں میں فلور ابھی ذہن کے پردے پر نمودار ہوئی، وہ، میری محبوبہ، جو ابھی تک شوالا کے قبضے میں تھی۔ یہ سوچ کر میری طبیعت بے چین ہوگئی، مگر ایک خاص مدت تک میرا یہاں ٹھہرنا ضروری تھا کیوں کہ میں نے لوکا سا کے خلاف ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ اس میں میری تسکین کے کئی پہلو موجود تھے، اپنے ماضی و حال پر سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی اور میری آنکھ اُس وقت کھلی جب ایک سراپا شباب سیاہ فام دو شیرہ میری گردن سہلا رہی تھی۔

وہ لوکا سا کی سب سے محبوب کنیر رہی ہوگی۔ اسے لوکا سا کے کمرہ خاص میں آنے کی اجازت تھی۔ اس کا نام دارڑی تھا۔ میں دارڑی کے بدن کے سہارے اٹھا۔ اس نے سب سے پہلے ایک آتشیں مشروب مجھے اپنے ہاتھ سے پلایا جسے حلق میں انڈیل کر میرے جسم و جان میں پھرتی آگئی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے میرے جسم کے گرد آلود حصے دھوئے۔ انہیں جگہ جگہ سے رنگا، پھر اس نے میرے بال دھوئے اور اپنی انگلیوں سے ان میں کنگھی کی۔ میں جزیرہ باگمان کی سرداری کے لطف کا آغاز اس رسیلی لڑکی کی دل نشیں صحت سے کر سکتا تھا لیکن یہ لوریمیا کی توہین ہوتی، چنانچہ میں ضبط کیے پڑا رہا۔

میں انہیں سرسری نظروں سے دیکھتا ہوا اس کمرے میں آگیا جہاں لوکا سا فیصلے صادر کیا کرتا تھا۔ اس کی مخصوص جگہ بیٹھ کر میں نے بے اختیار لوکا سا کی طرح اپنی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔ ایک لمحے کی مدت میں ایک لڑکی میرے سامنے حاضر ہوگئی۔ میں نے اس کی اچانک آمد پر حیرت کا اظہار کیے بغیر کہا۔ ”کا بالو کو حاضر کیا جائے۔“

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے دیوار پر لگی ہوئی مختلف اشکال کی اشیاء دیکھیں جو کسی وقت بھی متحرک ہو سکتی تھی اور جادو ٹونے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں نے مسکرا کر ایک عصا پر ہاتھ پھیرا۔ ”تم میرے کام آؤ گے۔“ میں نے زیر لب کہا۔ تھوڑی دیر میں کا بالو حاضر ہو گیا۔ میں نے

اپنی جگہ بیٹھ کر اس سے پوچھا۔ ”قصر لوریمیا میں اطلاع دی جائے کہ جابر بن یوسف الباقرباریابی کا خواہاں ہے۔“

”ناظم اعلیٰ کے لیے قصر لوریمیا کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ البتہ یہ امر مقدس لوریمیا پر منحصر ہے کہ وہ کس وقت ناظم اعلیٰ سے ملنا پسند کرے۔“ کابالو نے مودبانہ جواب دیا۔

”عزیز کابالو!“ یکا یک میں نے اپنا لہجہ بدل کر کہا۔ ”میں تم سے چند باتیں پوچھنی چاہتا ہوں۔ قصر لوریمیا کے آداب سے مجھے کچھ زیادہ آگاہی حاصل نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اور معلومات میرے لیے مفید ہوں گی۔“

”میں اپنے آقا کے سوالات کا منتظر ہوں۔“

”کابالو۔ کیا یہ ضروری ہے کہ باگمان کا ہر سردار مقدس لوریمیا کے متبرک بدن سے حظ اٹھائے۔ فرض کرو اگر وہ نہیں چاہتا تو کیا اس میں مقدس لوریمیا کی توہین کا کوئی پہلو نکلتا ہے؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو سردار؟ اس کا بدن ایک سعادت ہے۔۔۔۔۔ اس کا قرب راحت جاں ہے۔ وہ دیوتاؤں کی نمائندہ اور برتر طاقتوں کی امین ہے۔ کیا تم اس کے متبرک بدن سے فیض حاصل کرنا نہیں چاہتے؟ کیا تم اس مقدس اختلاط سے بہرہ یاب ہونا نہیں چاہتے؟ جارا کا کا کی روح تم پر رحم کرے۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں؟“ کابالو نے حیرت سے کہا۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔ ”تم اپنا بیان جاری رکھو۔“

”معزز جابر۔ سنو یہ مقدس لوریمیا پر منحصر ہے کہ وہ تمہیں کس وقت اس امر کی اجازت دیتی ہے اور کب انکار کر دیتی ہے۔ دیوی کے رُوبہ زو ایک سردار کی حیثیت ماتحت کی سی ہوتی ہے، ایک کنیر کی سی ہوتی ہے وہ جس طرح چاہے اسے استعمال کر سکتی ہے۔ ہر سردار اس کے اشاروں کا تابع ہے۔ اگر دیوی تمہارے جسم سے اپنا جسم اطہر مس کرنے پر آمادگی کا اظہار کرے تو تم کیسے انکار کر سکتے ہو؟“ کابالو نے سراپیمگی سے کہا۔

”میں تمہیں کیا بتاؤں کابالو۔ ایک طویل داستان میرے پس منظر میں ہے لیکن میں۔۔۔۔۔“ الفاظ میرے حلق میں انک گئے۔ ”مگر میں واقعی مقدس لوریمیا کے سامنے کسی گستاخی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔“

”معزز جابر۔ تمہاری دانش بلاشبہ سب سے بالا ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ باگمان کا ہر شخص جس کے حصول کا آرزو مند ہے تم اس سے دور ہنا چاہتے ہو۔ تم اپنے لیے مصیبتیں پیدا کر لو گے۔ دیوی کے سامنے اس کی اطاعت لازم ہے۔ اطاعت ایک ایسا جوہر ہے جس میں کبھی نقصان نہیں ہوتا۔ دیوی اپنے سردار کو عزیز رکھتی ہے کیوں کہ وہ سب پر فوقیت رکھتا ہے لیکن دیوی سب سے مقدم و محترم ہے۔“

”آہ کابالو۔ کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ میرا مطلوب۔۔۔۔۔ کون ہے میں نے جس کی طلب میں اپنا ماضی دفن دیا ہے۔ کون ہے جو مجھے اس شدت سے سرگرم اور سرگرداں رکھے ہوئے ہے۔ وہ کون ہے جس نے ایک اجنبی کا سکون لوٹ لیا ہے۔“ میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

کابالو نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ وہ کون عارت گر ہے۔ میں ایک آہ بھر کاٹھا اور میں نے تھکے ہوئے انداز میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر میری صورت دیکھنے لگا۔ آج تک کسی سردار نے یقیناً یہ اعزاز اپنے نائب کو نہیں بخشا ہوگا۔ وہ بے چین ہو کر بولا۔ ”معزز

جابر! تمہارا دل بہت وسیع ہے۔ تم انسانوں کو اپنے قابو میں کرنا جانتے ہو۔ میں اپنی زندگی میں چوتھے سردار کی نیابت کے فرائض انجام دے رہا ہوں، تم ان سب میں منفرد ہو۔“

”آہ مجھے قصر لور یا مالو چلو۔“

☆=====☆=====☆

رات ہو چکی تھی۔

میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کابالو مجھے میرے غار سے نکال کر ایک تنگ راستے پر لے گیا۔ میرے دل کا عالم عجیب تھا۔ ناظم اعلیٰ کے مکان سے لور یا کا قصر زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے ایک غار کے دہانے پر چھوڑ کر کابالو مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔ راستے میں کسی نے مزاحمت نہیں کی۔ وہاں کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ جب میں ایک بڑے دروازے کے نزدیک پہنچا تو وہ میرے قدموں کی آہٹ سے کھل گیا اور پری چہرہ نازنیوں کے ایک طائفے نے میرے جسم پر عطریات اور پھولوں کی بارش کر دی۔ آج یہاں پذیرائی کا انداز ہی اور تھا۔ جس نازنین کو دیکھو، وہ پلک کو دہری ہوئی جاتی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ عورتیں اتنے آگے بڑھ کر اظہار کر سکتی ہیں۔ لور یا تک پہنچتے پہنچتے جیسے آتش مزاج شخص کے جذبات میں بھونچال اچکا تھا۔ میں سب کچھ بھول رہا تھا۔ میں بھول رہا تھا کہ میں نے ابھی کابالو سے کیا گفتگو کی تھی۔ میرے اندر بیٹھے ہوئے ایک ایسے شخص نے بیدار ہونا شروع کر دیا تھا۔ جو بینائی سے محروم ہوتا ہے، جو سوچنا اور سنتنا نہیں جانتا، جو صرف محسوس کرتا ہے، جس کی سرشت میں اشتعال ہے اور جس کے افعال میں جارحیت جو سامنے نظر آنے والے شخص سے بہت مختلف ہے۔ دروازے پر وہ سراپا نازکھڑی ہوئی تھی..... ”میں اپنی مقدس دیوی لور یا کے حضور جزیرہ باگمان کے ناظم اعلیٰ کے طور پر حاضر ہوں۔“ میں نے کہا۔

”جابر بن یوسف۔“ وہ ایک اداسے بولی۔ ”تم نے لور یا کو مایوس نہیں کیا۔ تمہاری شجاعت اور ذہانت نے لور یا کو خوش کیا ہے۔“

میں اسے ہاتھوں سے اٹھائے پتھر کی نشست گاہ پر لے آیا۔ آسمان پر تارے جھلما رہے تھے۔ خوبصورت درخت اور پھول ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ مشعلیں درختوں کے درمیان خالی زمین پر اس طرح ایستادہ تھیں جیسے زمین سے روشنیاں پھوٹ رہی ہوں۔ یہ باغ، یہ دل کش منظر، یہ رات، یہ گداز، کوئی اور ہوتا تو پاگل ہو جاتا، میں نے اسے پہلو میں بٹھالیا۔ میرے دل و دماغ میں زبردست کش مکش جاری تھی۔

جابر بن یوسف دو اشخاص میں منقسم تھا اور دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ کیا میں خود کو اس کے سپرد کر دوں؟ اس کی تحویل میں جانے کے بعد میرے مقدر میں کیا لکھا ہے؟ کیا اس سے آلودگی کے بعد اقبال سے میرے ربط میں کوئی رخنہ پڑ جائے گا؟ مگر اس علاقے کی اقدار مختلف ہیں۔ یہ تو طلسم کا کارخانہ ہے۔ یہاں جنس کی وہ قدریں نہیں ہے جو میرے معاشرے میں موجود ہیں۔ میں ابھی تک انہی پیمانوں سے خود کو ناپتا ہوں۔ میرے احساسات وہی ہیں۔ لور یا پر میرا قانونی حق ہے لیکن میرا قیام یہاں عارضی ہے۔ مجھے بہر حال اگلی منزلوں کی طرف سفر کرتا ہے۔ ہاں مجھے اس کا بدن تاراج کر دینا چاہئے۔ مجھے اسے فتح کر لینا چاہئے۔ ایک دیوی میرے ہاتھوں میں ہے اور میں بہت مضطرب ہوں۔ مجھے مقدس لور یا کی توہین نہیں کرنی چاہئے۔ مگر یہاں جنس کی کوئی قدر موجود نہیں ہے تو عشق کا وہ تیور بھی نظر نہیں آتا جو میرے دل

میں اپنے مقصود کے لئے ہے۔ عشق کا تقاضا ہے کہ صرف اُس کی تمنا کی جائے۔ عشق کی انصاف ایک ذات سے وابستہ رہنے میں ہے۔ عشق مصلحت میں نہیں ہوتا۔

مگر خود اس نے اشار کو میری آسودگی کے لئے بھیجا تھا۔ اور یہاں بھی اشار کی طرح حسین ہے۔ میں اپنی کامیابی پر اسے اقبال کی طرف سے کوئی دوسرا تحفہ جمال کیوں نہ سمجھوں۔ ممکن ہے یہ صحرائے زار کی گرم فضاؤں میں بے شمار اذیت ناک دن گزارنے کا کوئی انعام ہو۔ اشار کے ساغر کی طرح اور یہاں کے جام سے بھی یہاں کا شربت پیا جاسکتا ہے۔ اور یہاں ایک ضرورت ہے۔ اور یہاں ایک بھوکے شخص کی غذا ہے۔ عشق تو جنس سے ماورا ہے۔ پیٹ کی اشہا بھی دوران عشق بجھائی جاتی ہے کیا عجب کہ اور یہاں کے وصال کے بعد اس ستم گر کی طلب میں اور تڑپ ہو۔ میں نے اس کے لبوں پر انگلیاں رکھ دیں اور کوئی فیصلہ کرنے کے لئے اسے دلکش باتوں میں الجھائے رکھا۔ میں نے اشتیاق سے کہا۔ ”اے مقدس اور یہاں! یہ حقیقت کتنی عجیب اور ناقابل یقین ہے کہ تو میرے آغوش میں ہے۔ جزیرہ باگمان پر آنے والا ایک نیم جان اجنبی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ تیرا حسن و جمال تھا جو پہاڑ میرے قدموں سے لرز گئے۔“

”جابر بن یوسف! تمہاری فتح اور یہاں کے لئے باعث سکون ہے تمہاری شکست سے اور یہاں کو دکھ ہوگا۔ اور یہاں کا ایک زمانے سے مختلف سرداروں کے ساتھ رابطہ رہا ہے۔ اعزاز یہ ہے کہ پہلی بار اور یہاں کسی کی آغوش میں اس کے اختیار سے بیٹھی ہے۔“ اور یہاں نے شوخی سے کہا۔

”میں اس اعزاز کے لئے مقدس اور یہاں کا شکر گزار ہوں۔“ مقدس اور یہاں کو علم ہوگا کہ اس کے قرب میں میرے جذبے پرستش کے سوا بھی کچھ ہیں۔ یہ سوچ کر میں اداس ہو جاتا ہوں کہ مجھے ایک دن یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ جزیرہ باگمان پر میرے قیام کی مدت بڑی مختصر ہے۔

”کیا تم جلد واپس جاؤ گے؟ مگر جزیرہ توری پوری طرح محفوظ ہے۔ اور یہاں نے تمکنت سے کہا۔

”ہاں۔“ میں اس کی بارگاہ میں حاضری دینا چاہتا ہوں جس نے ایک اجنبی کو یہ مقام عطا کیا ہے جس نے مجھے اس مبارک سفر کے لئے روانہ کیا ہے۔ میری منزل کہاں جا کر ختم ہو؟ یہ مجھے خود نہیں معلوم۔ ممکن ہے اس کے احکام میری آمد کے منتظر ہوں۔ میں اس وقت تک سکون سے نہیں رہ سکتا۔ جب تک اس کے پاس واپس نہ پہنچ جاؤں۔“ میں نے بے تابی سے کہا۔

”مقدس اقبال! اس نے عقیدت سے کہا۔ ”تم جس طرح اس کا تذکرہ کر رہے ہو، وہ تمہاری مزید کامیابیوں کی نشانی ہے،۔ وقت اس کے ہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں تمہیں اپنے حصے سے مشروب حیات کے چند قطرے پلاؤں گی۔ اس کی تاثیر تمہارے ذہن سے گزرتے ہوئے وقت کا احساس ختم کر دے گی۔ وقت مقدس اقبال کے سامنے ٹھہر گیا ہے۔ وہ مرنے اور پیدا ہونے والے انسانوں کے لئے ماہ و سال کا حساب رکھتی ہے اور شاید وہ اس بات پر شاد ماں رہتی ہوگی کہ اس کے سامنے وقت گزر رہا ہے مگر اس کے پہلو سے بچ بچ کر..... اور ابھی ابھی تو تم نے جزیرہ باگمان کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے یہاں کے اقتدار کا لطف بھی نہیں اٹھایا ہے۔ تم اتنی جلدی کیوں واپس جانا چاہتے ہو؟“

میں اسے کیا بتاتا کہ جس کے لئے وقت کوئی حیثیت نہیں رکھتا وہ وقت کی قدر کیا جانیں؟ میں لحوں کا عذاب بھگت رہا ہوں۔ میں اسے یہ کیسے باور کراتا کہ میرے سینے میں اس کے نام کے ساتھ ایک ہوا ٹھتی ہے۔ میں اُسے کس طرح سمجھاتا کہ اقدار، طاقت، سیاہ علوم، گلے میں آویزاں

یہ تحائف، میرے لیے اس کی طلب کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ میں نے اس کی زلفیں چوم کر کہا۔ ”میں اپنے مختصر وقت میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دینا چاہتا ہوں کیونکہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا یہی ایک ذریعہ مجھے نظر آتا ہے۔ میں پھر واپس آؤں گا۔ جزیرہ توری کی طرح باگمان بھی اب میرا علاقہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں اپنا نائب مقرر کر کے کچھ مدت کے لئے یہاں سے روانہ ہو سکتا ہوں۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے؟“

”تمہیں اس کی اجازت ہے۔“ لورینا نے مضطرب لہجے میں کہا۔

”اور جب میں واپس آؤں گا تو تاریک براعظم کے بہت سے اسرار مجھ پر وا ہو چکے ہوں گے اور میرے متجسس ذہن کو شاید بہت سے سوالوں کا جواب مل چکا ہوگا۔ پھر یہ سحرگاہ شاید میرے لیے اتنی پُر اسرار نہ ہوگی۔ جتنی کہ اب ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ جابر!“ لورینا تیزی سے بولی۔ ”یہاں کے باشندے یہ نہیں سوچتے کہ یہ سحرگاہ کیا ہے؟ یہ فسوں گری، یہ افسوں بنی ان کی عادت ہے اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم زمانوں پر پھیلے ہوئے اس علاقے کے اسرار سے آگاہ ہو جاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے یہ امر صرف مقدس اقبال پر منحصر ہے کہ وہ تمہیں بعض جوابات سے نوازے یا تمہارا اشارتاریک براعظم کے عام ناواقف باشندوں میں کرے۔“

”اور مجھے اس کے قرب ہی کے لئے اس کے پاس اس کے قریب رہنا ضروری ہے۔ اسی لئے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”یہ جسمانی بعد اس کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ وہ کہیں بھی قیام کر سکتی ہے اور کہیں بھی تمہیں اپنی بارگاہ میں طلب کر سکتی ہے۔“ لورینا نے چل کر کہا۔

”میری تربیت کا کام ختم ہو چکا ہے۔ اب مجھے اس کے احکام کے مطابق اپنی منزل کی طرف لوٹ جانا چاہئے۔ میں جزیرہ توری میں جا کر میں اسے باریابی کی زحمت دے سکتا ہوں۔“

اس گفتگو کے بعد بھی میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کس حد تک اپنے مشتعل حواس پر قابو پانا چاہئے۔ میں ابھی تک یہ سوال حل نہیں کر سکا تھا کہ کیا مجھے خود کو اس کے سپرد کر دینا چاہئے؟ وہ ہر لمحے ایک دعوت تھی اس کے دیکتے ہوئے رخسار۔ اس کی شعلہ نفسی، میں اس کی طرف سے نظریں چراچرا کر اسے اپنی ماضی کی داستانیں سنانے لگا اور میں نے صبر و ضبط کے بے شمار حسین لمحے گزار دیئے، ہم دونوں اپنی حدیں بڑھاتے رہے، ہمارے جسم پٹنک رہے تھے۔

ہم ساحل کے کنارے بیٹھے رہے۔ کئی طوفان آئے، مگر میں نے ان کا رخ موڑ دیا۔ کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی شخص بھی لورینا کے آتشیں تیور سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا لیکن جابر بن یوسف الباقرقویہ اعزاز حاصل ہے کہ اپنی تشنہ فنی اپنے حق اور بے خود کردینے والے اس فسوں کا منظر کے باوجود وہ مقدس اقبال کی ایما کا منتظر رہا۔ اس کی منشا کا ایک خفیف سا اشارہ بھی مجھے مل جاتا تو میں لورینا کی ہڈیاں تک کھا لیتا۔ میری زبان خشک ہو گئی تھی اور میری آنکھیں جلنے لگی تھیں ایک قیامت خیز رات و دشتوں میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو میں نے خوف زدہ انداز میں اس سے اجازت چاہی۔ میں نے اپنی دانست میں اسے یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ میرے ذہن میں کیسا آتش فشاں کھول رہا ہے؟ اس رات میں نے اسے اپنی فصاحت سے اپنی ماضی کے قصوں اور باگمان کے ناظم اعلیٰ کے فرائض کے متعلق گفتگو میں مصروف رکھا۔ میں اسے دنیا بھر کے واقعات سناتا رہا۔ صبح کے وقت اس

کے چہرے پر ایک اضطراب سا تھا۔ شاید اس نے میرے اجتناب پر میرے گریز کا اندازہ لگایا تھا۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ میری جھجک اور دوری میں کون سا خوف شامل ہے۔ یوں بھی اسے ایک دیوی کی حیثیت حاصل تھی اور اقبال کے حسین خانوادے سے اس کا تعلق تھا۔

علی الصباح جو جھل قدموں کے ساتھ میں وہاں سے واپس آ گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اس کرب سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ میں جلد از جلد باگمان سے روانہ ہو جاؤں۔ نہیں تو لوریمیا کے علاقے میں اس سے دور رہنے میں ایک عذاب ساز ذہن پر مسلط رہے گا۔ مگر میں اتنی آسانی سے کیسے جاسکتا تھا؟ اپنے مکان پر واپس آ کر میں نے اپنے تمام ناہنیں کو طلب کیا اور ان سے باگمان کے متعلق ایک غیر رسمی بات کی۔ کم از کم ہفتہ میں باگمان میں خود کو مقبول بنانے کے لئے صرف کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ہفتہ جشن کا اعلان کر دیا۔ میں نے اپنے ناہنیں کو لوکا سا کے حرم کی بعض نادر روزگار لڑکیاں تجھے کے طور پر پیش کر دیں۔ میں نے کالو کو اعتماد میں لے کر لوکا سا کے خصوصی مقربین اور پسندیدہ مصاحبوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور انہیں برطرف کر دیا میں آبادی میں جا کر عام لوگوں کے ساتھ جشن میں شریک ہوا اور جزیرہ توری کی طرح میں باگمان میں بھی عام لوگوں کے درمیان بیٹھا اور میں نے اُن کی چھوٹی لڑکیوں کے درمیان گلیوں کی تنگی اور غلاظت دور کرنے کے لئے نئے سرے سے فاصلہ رکھ کر چھوٹی لڑکیاں بنانے کا منصوبہ پیش کیا۔ وہ بہت معمولی عیوب تھے جو ذرا سی توجہ سے سدھر سکتے تھے لیکن انہیں ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ میں نے انہیں یہ باتیں بتائیں۔ اس ایک ہفتے میں ایک بار بھی لوریمیا سے نہیں ملا میں باگمان کے لوگوں میں گھر رہا۔ حالانکہ دل لوریمیا سے ملنے کے لئے سخت بے تاب تھا۔ میرے سامنے جشن کے زمانے میں بازاروں اور گلیوں میں کھیل تماشے ہوتے رہے۔ وہ ناچتے گاتے، شراب پیتے اور نئے سردار کے لئے درازی عمر کی دعائیں مانگتے رہیں، ایک ہفتہ گزر گیا تو میں نے اپنے بارے میں ہر طرح کا اطمینان کر لینے کے بعد کالو کی روح کو طلب کیا تا کہ وہ زارشی کے صحراؤں میں جا کر اسٹالا کو باگمان واپس آنے کی دعوت دے۔

تین بعد ایک شام میری حرم سرا کی لڑکیاں مجھے گھرے ہوئے تھیں اور میرا جسم دبا رہی تھیں۔ ان کے لئے یہ نیا سردار یقیناً عجیب طبیعت کا تھا جو انہیں کبھی دعوت عمل نہیں دیتا تھا اور کبھی ان کے ساتھ درندگی کا سلوک نہیں کرتا تھا، اس وقت مجھے وارثی نے آکر اطلاع دی کہ کالو ملاقات کا طالب ہے۔ میں نے مسکرا کر سر مست لڑکیوں کو علیحدہ کیا اور کالو کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ کالو تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے سر جھکائے ناتو ان ونیم جاں جزیرہ باگمان کا سابق ناظم اعلیٰ اسٹالا بھی تھا۔ ”اوہ اسٹالا!“ میں اس کی طرف تپاک سے بڑھا۔ ”تم آگئے؟ مجھے تمہارا انتظار تھا۔“ کالو نے میرا تپاک حیرت سے دیکھا۔

”معزز جابر بن یوسف!“ اسٹالا زمین پر گر گیا۔ ”تمہارا پیغام جیسے ہی مجھے ملا۔ میں نے دیوتاؤں کی خوشنودی چھوڑ دی اور کشاں کشاں تمہارے پاس چلا آیا۔ تم نے لوکا سا کو ختم کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔“

”اسٹالا۔ اسٹالا۔“ میں نے اسے اشتیاق آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ زارشی میں تمہارے حسن سلوک اور تمہاری بے بسی دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں باگمان واپس جا کر لوکا سا سے مقابلہ کرنے کے بارے میں غور کروں گا اٹھو۔ اٹھو اسٹالا۔ زمین سے اٹھو۔ تم میرے دوست ہو اور جسے مہذب دنیا کے لوگ ایک بار دوست کہہ دیتے ہیں، اس سے دوستی نبھاتے بھی ہیں۔“

جابر بن یوسف! تم عظیم ہو۔ تمہارے اندر دیوتاؤں کی صفات ہیں۔ میرا چہرہ دیکھ رہے ہو؟ کا بالواس بات کا گواہ ہے کہ میرے جسم نے میرے ساتھ کس قدر بے وفائی کی ہے۔ میں بری طرح تھک گیا ہوں، معزز جابر! باگمان واپس بلا کر تم نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔“

”میں جلد یہاں سے جانا چاہتا ہوں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ معزز جابر بن یوسف نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔“ اسالا نے شستہ لہجے میں کہا۔

”سنو اسالا اور کا بالو تم بھی۔ اب مجھے یہاں آئے خاصا عرصہ گزر چکا ہے، مجھے جلد از جلد توری پر پہنچ کر وہاں کی ذمے داریاں سنبھالنی ہیں۔ میں نے اسالا کو اس لیے طلب کیا ہے کہ میں اُسے اپنی عدم موجودگی میں باگمان میں اپنا نمائندہ مقرر کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“..... اسالا تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ ”نہیں نہیں، میں تم سے تمہارا اعزاز چھیننا نہیں چاہتا۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ارے تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ تمہارے استقبال کو کیا ہوا؟ میں نے تو تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔“

”معزز جابر۔ کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟“ اسالا نے مذامت سے کہا۔

”نہیں میں وہ اقتدار تمہیں سونپنا چاہتا ہوں جو تمہارا حق ہے اور تم جس کے اہل ہو مگر اصولاً یہ اقتدار میرے نام پر ہوگا۔ میرے باگمان واپس آنے تک تم میرے نمائندے کی حیثیت سے کام کرتے رہو گے۔ تمہارے اختیارات ایک ناظم اعلیٰ کے اختیارات ہوں گے۔ میں باگمان کا اقتدار ایک امانت سمجھتا تھا جو تمہیں لوٹنا رہا ہوں۔“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم تاریک براعظم میں کوئی بڑا منصب پاؤ گے میں خود کو باگمان کا ناظم اعلیٰ نہیں سمجھتا، تم نے لوکا سے بہ قوت یہ اقتدار حاصل کیا ہے، میں تمہارے حکم پر اپنا سر جھکا تا ہوں، لیکن میں تمہارا غلام ہوں، یہ تمہاری امانت ہے۔“ اسالا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”تم میرے دوست ہو، دوست غلام نہیں ہوتے، مجھے تمہارے تجربے اور مشوروں کی ضرورت ہے۔ جزیرہ توری واپس جانے سے پہلے تم مجھے پراسرار علوم سے آگاہ کرو گے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ زارشی میں تم نے مجھ سے خود اس خواہش کا اظہار کیا تھا، میں یہ اشیاء جو دیواروں پر منقش ہیں، ان کا استعمال جانا چاہتا ہوں۔ اسالا آج سے تم یہیں رہو اور میں خود کو تمہاری شاگردی میں دیتا ہوں۔ اب آؤ میرے گلے لگ کر تجدید دوستی کرو۔“

”معزز جابر!“ اسالا رقت انگیز انداز میں مجھ سے لپٹ گیا حیرت زدہ کا بالو خاموش کھڑا ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ ”تم نے سب کچھ سن لیا کا بالو؟“ میں نے پوچھا۔

”کا بالو تمہاری عظمت کا معترف ہے، میں نے جو کچھ سنا ہے۔ اس سے میرے کان پہلی بار آشنا ہوئے ہیں۔ اسالا ایک نیک شخص ہے۔ میں حسب سابق اسے اپنی وفاداری کا یقین دلاتا ہوں۔“

”میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ اسالا نے تعریفی انداز میں کا بالو سے کہا۔

آؤ اس خوشی میں رقص کا اہتمام کرتے ہیں۔ ارے کا بالو ذرا انہیں آواز دینا، اسالا بہت تھکا ہوا ہے۔ اسے گداز کی ضرورت ہے۔ ان

سے کہو کہ وہ اس کے گرد جمع ہو جائیں اور اسے شراب میں نہلا دیں۔“ میں نے جوش مسرت سے کہا۔

شام کو میں لور یما سے ملا۔ اس دن لور یما کے ہاں وہ اضطراب نہیں تھا جس کا میں نے پہلی ملاقات میں مشاہدہ کیا تھا۔ شاید یہ میرا گمان ہے کہ اس کی آنکھوں میں، میں نے ایک حسرت سی محسوس کی۔ اس کے حسن کا وہی عالم تھا۔ آج اس کے بدن پر پھول نکلے ہوئے تھے، میں نے اُسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اس نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا، اسے پہلے ہی علم ہو گیا تھا کہ اسٹالا میری جلی پر آج صبح باگمان آچکا ہے۔ اس نے میرے فیصلے کی توثیق کر دی۔

آبادی میں میرا اعلان حیرت سے سنا گیا۔ اسٹالا پہلے ہی اس علاقے میں مقبول تھا، لیکن گزشتہ دس گیارہ دن میں، میں نے جو مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ وہ اسٹالا کا سکہ دوبارہ ہمانے میں خارج ہو رہی تھی۔ اسی روز سے میں نے اپنے مکان پر اسٹالا سے پُر اسرار علوم کی تربیت حاصل کرنی شروع کر دی۔ اسٹالا تاریک بر اعظم کی تاریخ کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا، اسے صرف ایک بات معلوم تھی کہ جو کچھ اب ہے وہ ہمیشہ سے ہے۔ چند برگزیدہ ہستیاں لافانی ہیں۔ انہیں دیوتاؤں کا درجہ حاصل ہے۔ اگر کوئی برگزیدہ ہستی اس دُنیا کو خیر باد کہہ دیتی ہے تو وہ روح کی شکل میں کسی وقت بھی آکر اپنے لوگوں کی رہنمائی یا تادیب و تہدید کرتی ہے۔ وہ بحث کرنا نہیں جانتا تھا۔ وہاں کوئی دورا کم نہیں ہوتیں۔ میں نے ابتدائی ٹوٹے ٹوٹے اشارے سیکھ لیے تھے، لیکن اسٹالا نے ایک ماہ کی مدت میں صبح و شام کی محنت سے مجھے ایسے عمل سکھائے کہ اگر میں انہیں نہ سیکھتا تو ان علاقوں میں مجھے قدم قدم پر مشکلیں پیش آتیں۔ دور بینی اور پیش بینی ایک مشکل عمل تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ ریاضت اور وقت کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسٹالا مجھے وہ تو نہ سمجھا سکا لیکن لوکا سا کے کمرے میں سچے ہوئے مختلف مجسمے متحرک کرنا اور انہیں اپنے اشاروں پر چلانا مجھے آگیا۔ جادو کی دنیا بڑی حیرت انگیز ہے۔ کئی مرکبات سے کوئی جادوئی عمل وجود میں آتا ہے اور یہ ایک پیچیدہ سلسلہ ہے۔ کسی پروار کرنے کے لئے اور اسے مستقل پریشان کرنے کے لئے اسٹالا نے مجھے ایسا عمل سکھایا جس میں غلیظ ترین مرحلوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ جادو میں نفاست، خوش طبعی، باطنی سلیقہ، نرمی اور حلم کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ خون، گندگی، سڑی ہوئی چیزیں، شقاوت، ارادہ اور یک سوئی جادو کے مرکبات ہیں۔ جب کوئی شخص مسلسل انہی اعمال میں مصروف رہتا ہے تو اس کے اندر ایک عجیب و غریب قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ کے اشارے نا دیدہ چیزوں کو وجود میں لے آتے ہیں۔ اسٹالا نے مجھے سمورال کی مالا اور جارا کا کا کی کھوپڑی کے نئے استعمالات بتائے اور ڈبگی کے سینگوں کا سحر، لور یما کی مالاؤں کی قوت اور اس اثر دھسے کے متعلق تفصیل سے باتیں کیں۔ جو عمل یاد نہیں رہے۔ میں نے سیاہی بنا کر اور خشک ٹہنیوں سے قلم تراش کر انہیں لکھ لیا۔ میرے لکھنے کا عمل اسٹالا حیرت سے دیکھتا رہا۔ میں نے ایک ماہ کے دوران میں اپنے ہاتھوں کی خفیف سی جنبش سے کئی شعبے کرنے سیکھ لیے اور جادو کے توڑ کے کئی عمل بھی جان لیے۔ میری انگلی کے اشارے پر اب اندر کی کوئی کنیز حاضر ہو جاتی تھی۔ اسٹالا کے کہنے کے مطابق میرے پاس ایسے تحائف تھے جن سے مجھے کام لینا ہی نہیں آتا تھا، شپالی ان سب میں حیران کن تحفہ تھا، ایک ماہ کی مدت میں نہ لور یما نے مجھے طلب کیا اور نہ میں نے اس سے ملنے کی کوشش کی۔ جب میں اسٹالا کی مدد سے بنیادی جادوئی چیزوں کے بارے میں خوب طاق ہو گیا تو میں نے اپنی واپسی کا اعلان کر دیا۔

دوسرے دن اشک بار اسٹالا، کاہن، کابالو، دوسرے ناہین اور جزیرہ باگمان کے تمام لوگوں نے ڈھول تاشوں، باجوں، گاجوں، رقص اور

ہاؤ ہو کے ساتھ میری کشتی سمندر میں اتاری، انہوں نے اس پر اتنا سامان لاد دیا تھا جو کئی آدمیوں کے لئے بہت تھا کئی لڑکیوں نے میرے ساتھ جانے کے لئے خود کو پیش کیا۔ وارڈی نے کشتی میں آکر میرا ہوسہ لیا اور کاہن نے میری سلامتی کے لئے دیوتاؤں کے حضور ایک طویل دعا مانگی۔ میری کشتی ایک سمت لگا دی گئی۔ اس پر نہ کوئی باد بان تھا اور نہ وہ اتنی بڑی تھی کہ سمندر کی تیز لہروں کا مقابلہ کر سکتی۔ لیکن اس میں مختلف طلسماتی چیزیں رکھ دی گئی تھیں۔ لوریمہ کی طرف سے میرے گلے میں پھولوں کا ایک بھاری ہار ڈالا گیا اور میں اپنے ایک ملک جزیرہ باگمان سے اپنے دوسرے ملک جزیرہ توری کے سفر پر لہروں کے دوش پر روانہ ہو گیا۔

میں آنے والے دنوں کے تصور میں گم سمندر کی موجوں میں آگے بڑھنے لگا۔ میری کشتی اپنی سمت میں تیزی سے گامزن تھی۔ میں ایک مدت بعد جزیرہ توری واپس جا رہا تھا۔ میرے دل پر ایسے احساسات غالب تھے جیسے میں اپنے وطن، اپنے والدین کے پاس جا رہا ہوں۔ دور تک جزیرہ باگمان کا کنارہ نظر آتا تھا اور پھر وہ سب میری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور میں کشتی میں لیٹ گیا۔

تیسرے دن رات کو میری کشتی اچانک ڈولنے لگی، چاروں طرف گہری تاریکی تھی اور سمندر کی طوفانی لہریں شور مچاتی ہوئی کشتی سے کھیل رہی تھیں۔ لہریں اتنی شدید تھیں کہ کشتی ایک دم اوپر اٹھ جاتی تھی اور جب موجوں کے ساتھ واپس نیچے آتی تو اس کا توازن بگڑ جاتا تھا۔ اس بلائے ناگہانی سے نمٹنے کے لئے میں نے اپنے چند جادوئی عمل آزمائے اور ایک متبرک عصا اٹھا کر سمندر کی نذر کر دیا۔ عصا پھینکتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں تنہا نہیں ہوں بلکہ کچھ اور لوگ بھی میرے ساتھ ہیں۔ میں ان کی آوازیں نہیں پہچان سکا لیکن رفتہ رفتہ وہ بلند ہوتی جا رہی تھیں سمندر کے اس طوفان میں میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روشنی کے جھماکے ٹکرائے ہیں اور کچھ ایسی چنگاریاں آپس میں الجھ رہی ہیں جو کسی چیز کی رگڑ سے عموماً پیدا ہوتی ہیں اور ایک شور مچا رہے ہیں، ایک مبہم سا شور یقیناً سمندر کے ہولناک طوفان سے ہٹ کر کوئی مظہر تھا۔ کچھ سمجھنے کے لئے میں نے جارا کا کا کی کھوپڑی اٹھائی اور اسے ایک خاص عمل سے گزارا۔ کشتی کے گرد اڑنے والی چنگاریاں دور ہو گئیں لیکن اس قیامت خیز شور میں اضافہ ہو گیا جو سمندر کی لہروں سے زیادہ طاقت ور تھا۔ میری ناک ایک عجیب قسم کی بو سے پھٹی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ لیکن اس طرح میں کسی وقت بھی چھپاتی ہوئی کشتی سے سمندر میں گر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے دوبارہ کشتی مضبوطی سے پکڑ لی۔ میرا تمام سامان سمندر کی نذر ہو چکا تھا۔ تمام متبرک چیزیں سمندر نے ہڑپ کر لی تھیں۔ اب میں ایک ہاتھ سے اپنے گلے کے تحائف سنبھالے اور دوسرے ہاتھ سے کشتی تھا سے طوفانی لہروں میں اپنے سر پر منڈلاتے ہوئے ہیولوں اور چنگاریوں کی زد پر تھا۔ ایک بارگی میرے ذہن میں ایک ناقص خیال آیا کہ یہ مصیبت کہیں لوریمہ کی توہین کی سزا تو نہیں ہے؟ چنانچہ میں نے چیخ کر فضاؤں سے کہا۔ ”وہ میرے سامنے ہے وہ جو اس سارے علاقے کی حکمران ہے۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جابر بن یوسف کی موت میں ابھی بہت دن ہیں۔ میں اس کی دید سے پہلے نہیں مر سکتا۔ تم اپنے لیے تباہیاں مول لے رہے ہو۔“

میری آواز شور میں دب گئی جیسے کسی کو اس کی پروانہ ہو چنگاریوں کا قاص اور تیز ہو گیا۔ پھر مجھے اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ میں حواس مجتمع کر کے اپنے بچاؤ کے لئے کسی اور چیز کے بارے میں سوچتا۔ وہ شور متعدد آوازوں کا تھا اور اس کی کوئی ایک سمت متعین نہیں تھی۔ یہ اتنا ڈراؤنا اور لرزا دینے والا منظر تھا کہ میں خاصا دہشت زدہ ہو گیا۔ حالانکہ میں نے طلسمی معرکوں میں

حوصلہ برقرار رکھا تھا۔ قریب تھا کہ میری کشتی سمندر میں اُلٹ جاتی اور میں اس کی پہنائیوں میں گم ہو جاتا اور پھر کبھی کوئی میری کہانی۔ میری الم انگیز رو داد نہ جان پاتا کہ رفتہ رفتہ یہ نادیہ فساد کم ہوتا گیا۔ ساتھ ہی سمندر بھی پرسکون ہو گیا۔ میں نے کشتی سے پانی اُلچٹنا شروع کر دیا اور نیند اور تھکن سے ہار کر سپر ڈال دی۔ میں سو گیا۔ صبح صادق کے وقت مجھے اپنے سر پر پرندے اڑتے نظر آئے میں نے حیران نظروں سے سمندر کی تمام سمتوں پر نظر ڈالی۔ خشک قریب آ رہی تھی اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔

جلد ہی میری کشتی کنارے لگ گئی۔ سامنے درختوں کی قطاریں تھیں۔ یہ جزیرہ توری نہیں تھا، کوئی اور جگہ معلوم ہوتی تھی۔ کشتی اندر تک خشکی پر کھڑی کر کے میں نے اسے درختوں میں چھپا دیا اور اس جگہ پر ایک دائرہ کھینچ کر اسے طلسمی طور پر محفوظ کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ میرے سوا کسی کو نظر نہیں آئے گی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ ایک گھنا جنگل میرے سامنے تھا۔ میں کچھ ہی دور آگے گیا ہوں گا کہ تنگ دھڑنگ حبشیوں کی ایک جماعت نے مجھے گھیرے میں لے لیا لیکن وہ مجھ سے دور ہی رہے۔

”تم کون لوگ ہو؟“ میں نے جرات سے کہا۔

”انگرو ما کے لوگ تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔“ اُن میں سے ایک آگے بڑھ کر بولا۔

”انگرو ما۔ مگر میری منزل جزیرہ توری تھی۔ شاید میری کشتی غلط راستے پر آ گئی۔“ میں نے جھلا کر کہا۔

”تمہاری کشتی صحیح راستے پر آئی ہے۔ انہوں نے تمہیں آزاد کرادیا ہے۔“ اس نے اعتماد سے جواب دیا۔

”آزاد کرادیا؟ مگر میں کس کا غلام تھا؟“ اور مجھے کس نے آزاد کرادیا؟“

”ہم تمہیں گروٹا کے پاس لیے چلتے ہیں۔“ انہوں نے جواب میں کہا۔

”گروٹا؟ یہ کون شخص ہے؟“

”گروٹا انگرو ما کا محافظ ہے۔“

”مگر میری منزل انگرو ما نہیں ہے۔ میں جزیرہ توری واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں کسی گروٹا سے ملنا نہیں چاہتا۔“ میں نے انہیں ٹٹولنے کے لئے کہا۔

”ہم تمہیں زبردستی لے جائیں گے۔“ انہوں نے بیک زبان کہا۔

”کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ کیا تم میرا سین نہیں دیکھ رہے ہو؟ بہتر ہے مجھے واپس جانے دو۔“

”گروٹا کے حکم کے بغیر تم واپس نہیں جاسکتے۔“

”مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔“ میں نے سمندر کی طرف اپنے قدم بڑھا دیئے۔ جب میں نے گھیرا تو رُٹا چاہا تو وہ

مجھ سے لپٹ گئے۔ وہ تعداد میں دس تھے۔ میں نے اپنی ٹانگوں، ہاتھوں اور سر کی ضرب سے دو تین کو وہیں گرا دیا اور ان میں سے ایک کو اٹھا کر زمین پر پٹنڈیا۔ میں نے شپالی ان کے جسموں سے مَس کرنی شروع کر دی۔ وہ چیختے ہوئے مجھ سے دُور ہو گئے۔ دوبارہ جب میں ساحل کی سمت بڑھا تو میں

نے حبشیوں کا ایک ہجوم اپنی طرف آتے دیکھا۔ میرے قدم رُک گئے اور میں ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ ایک فاصلے پر آ کر ٹھہر گئے تو ان کے درمیان سے ایک خمیدہ کمر لیکن نومند شخص آگے آیا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اور چہرے پر لاتعداد جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ ”جابر بن یوسف الباقرا! گرونا، انگروما میں تمہارا منتظر تھا۔ باگمان جاتے ہوئے بھی تمہیں اس جزیرے پر روکا جاسکتا تھا مگر ہمیں لائق لوگوں کی ضرورت ہے۔ صحرائے زارشی میں تربیت کے بعد تم ہمارے بہت کام آؤ گے۔“

”تم گرونا ہو؟“ میں نے جرات سے کہا۔ ”کیا تم نہیں جانتے کہ تم تاریک براعظم کی سب سے محترم ہستی مقدس اقبالہ کے فرستادہ کو روک رہے ہو جو جزیرہ باگمان اور جزیرہ توری کا سردار بھی ہے۔“

اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ”اقبالہ..... مجھے سب کچھ معلوم ہے تم کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے تھے۔ ہم نے اس بلا سے تمہیں محفوظ کر لیا ہے۔ اقبالہ۔“ اس نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ ”اقبالہ کا ساحر یہاں کارگر نہیں ہوتا۔ دیوتاؤں نے یہ علاقہ اس بلا سے محفوظ قرار دے دیا ہے۔ یہاں وہ برگزیدہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے اس سے تنگ آ کر اس علاقے میں پناہ لی ہے۔“

شاید یہ بھی میرا امتحان ہے اور اس سے میرا ربط خاص آزمانے کا کوئی حربہ ہے۔ میں نے سوچا اور گرونا سے کہا۔ ”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ان برگزیدہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں گا جنہوں نے اس سے تنگ آ کر یہاں پناہ لی ہے تو تمہارا خیال غلط ہے اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مجھے زبردستی یہاں روک لو گے تو میں تمہیں بتاؤں کہ تمہیں ناکامی ہوگی۔“

اس کا قہقہہ ابل پڑا۔ ”ہم نے تمہیں سمندر سے کھینچ لیا ہے۔ ہم تمہیں یہاں بھی روک سکتے ہیں۔ تمہیں انگروما، گرونا اور یہاں کے بڑے لوگوں کے متعلق کچھ جانے بغیر زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ تم ہمارے مہمان ہو، میرے ساتھ آبادی میں چلو۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہم کتنے زمانوں سے اس کے قہر کا نشانہ بن رہے ہیں۔“

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ گرونا کے بیان کے مطابق انہوں نے میری کشتی کا راستہ بدل دیا تھا۔ مجھے محتاط ہونے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا۔ ”تمہاری باتیں دلچسپ ہیں اور مجھے یہ پاگلوں کی ہستی نظر آتی ہے لیکن میں تمہاری باتیں سنوں گا۔“

”اور جب تم ان لوگوں سے ملو گے جن کے گلے میں تمہارے تحائف سے زیادہ تحائف لٹک رہے ہیں اور جو اس کے معتبوب ہیں تو تم فیصلہ بدل دو گے۔ ایک یہی راستہ تمہیں اپنی دنیا میں لے جانے کا بھی ہے، اگر تم نے ہمارا ساتھ دیا تو نقصان میں نہیں رہو گے۔“ گرونا نے سنجیدگی سے کہا۔

گرونا کا انداز معنی خیز تھا۔ انگروما ایک سرسبز و شاداب جزیرہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ گھنے درختوں کے درمیان ایک میدانی علاقہ تھا، جہاں جگہ جگہ پتھر کے انسان نصب تھے اور جھونپڑیوں کا ایک طویل سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ آبادی میں مجھے ایسے لوگوں کی کثیر تعداد نظر آئی جن کے گلے میں بے شمار ہار اور مالائیں جھول رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی تھی اور تذبذب اور ایک اضطراب پایا جاتا تھا مجھے ایک جھونپڑی میں ٹھہرا کر میرے سامنے عمدہ مشروبات اور لذیذ غذائیں پیش کی گئیں۔ رات کو مجھے ایک میدان میں لایا گیا جہاں مشعلوں کی روشنی میں ایسے لوگوں کا اجتماع تھا جو گرونا کے قول کے مطابق غیر معمولی صفات کے حامل تھے۔ ان کے چہروں پر تندہ اور عزم تھا۔ مجھے ان کے درمیان کھڑا کر کے گرونا ان سے مخاطب ہوا۔

”اے بزرگ و برتر لوگو! ہم نے جابر بن یوسف الباقرا کو حاصل کر لیا ہے اور یہ ہمارے برگزیدہ لوگوں میں ایک اضافہ ہے۔ جابر بن یوسف، شجاعت، ذہانت، برداشت اور علم میں یکتا ہے، مگر وہ اقبال کے عتاب و عذاب، اس کے ظلم و ستم، اس کے سحر و افسوں، اس کی فتنہ گری و غارت گری سے ناواقف ہے۔ جابر بن یوسف، ہم میں بہت سوں کی طرح اس کا طلب گار ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ ایک سراب ہے۔ ہم میں سے کتنے اس کی فسون خیزی کے شکار ہوئے ہیں اور ہم میں سے کتنے اس کی زد سے بچ آئے ہیں۔ میں نے اسے اس جزیرے کے فضائل و خصوصیات کے متعلق بتا دیا ہے۔ وہ ایک نئے آنے والے کی طرح گریز کر رہا ہے مگر اسے نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کاہنوں، سرداروں اور تاریک براعظم کے جلیل القدر لوگوں کے درمیان موجود ہے۔“

گروٹا اپنی بات کہہ کر بیٹھا تو ایک بوڑھا شخص اٹھا۔ ”کتنے زمانے گزر گئے۔“ وہ بولا۔ ”اب ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ اب اس کا زوال قریب ہے۔ جابر بن یوسف کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسے مزید تربیت کے لئے یہاں بلایا گیا ہے اور اس نے دیکھ لیا ہے کہ ہمیں راستہ بدلنا آتا ہے۔ ہم نے جب اس جزیرے پر قدم رکھا تھا، اس وقت یہاں کچھ نہیں تھا لیکن قرونوں میں ہم نے اپنی تعداد بڑھائی۔ افسوس کہ جابر بن یوسف نے مشروب حیات نہیں پیا لیکن ہم اس کے زوال اعصاب سے پہلے اور اس کی تربیت کے بعد اسے پتھر میں محفوظ کر لیں گے اور جس وقت مناسب ہو اسے متحرک کر لیں گے۔“

میرے جسم پر لرزہ طاری ہوا۔ یہ سب معمولی لوگ نظر نہیں آتے تھے۔ ان کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا اور آنکھوں سے یقین جھلکتا تھا۔ میں ہمت کر کے کھڑا ہوا اور میں نے کہا۔ ”کیا ان صاحب عرفان لوگوں کے سامنے مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟“

”ہاں ہاں کہو۔ یہاں اشتراک ہے۔ یہ اقبال کی سلطنت نہیں ہے، جہاں اس کے جاہ جلال اور عظمت و شوکت سے خوف و ہراس پھیلا یا جاتا ہو۔ یہاں زبانیں کافی نہیں جاتیں۔ یہاں ہر شخص کی بات سنی جاتی ہے اور ہر شخص کو ایک مکمل شخص بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔“ گروٹا نے کہا۔

میں نے شائستگی سے کہا۔ ”اے اہل علم، اے ستم رسیدہ بزرگو! میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتی۔ میں ایک سیدھا سادہ شخص ہوں جہاں تک میرا تعلق ہے اس مقدس ذات سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ سنا ہے اجنبیوں کو اس کا علاقہ راس نہیں آتا لیکن مجھے ہر نوازش سے سرفراز کیا گیا۔ میں کس بنیاد پر اس سے اختلاف کروں؟ اگر تم لوگ میری بات سننا چاہتے ہوں تو سنو۔ تم یہ خیال چھوڑ دو کہ تم اُس پر کسی طور غالب آ سکتے ہو۔ تا حد خیال اس کی سلطنت پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ناخن لمبے اور اس کے دانت نوکیلے ہیں۔ اس کے پاس ایسی طاقتیں ہیں جو تمہارے ارادوں کو کبھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچنے دیں گی۔“ میری بات ختم ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ ہنس رہے ہیں اور میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کی ہنسی سے میں جھینپ گیا۔

”عزیز جابر بن یوسف الباقرا! تم بھول رہے ہو کہ تمہارے تمام ساتھی یکے بعد دیگر ختم کر دیئے گئے۔ تمہاری محبوبہ فلورا چھین لی گئی۔ سرتا اغوا کی گئی۔ تمہارا بوڑھا ہندی دوست سرنگاب بھی آبادی سے دُور توری کے جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ ان بزرگوں کے چہروں پر نظر ڈالو۔ ان کے چہروں پر داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ وہ افضل و اشرف لوگ ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ زمانے گزارے ہیں اور اپنے آپ کو بھول کر اس کی طلب میں تمہاری طرح دیوانے ہو گئے تھے۔ انہیں حسب معمول اس کے عتاب سے گزرنا پڑا۔ کیا میں جابر بن یوسف

الباقر سے ہر شخص کا تعارف کراؤں کہ یہاں کون لوگ بیٹھے ہیں؟“

”تم نے غلط قیاس کیا۔ میں اقتدار، بزرگی اور طاقت کا طلب گار نہیں ہوں۔ میں تو اس کا غلام رہنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک حسین۔ کائنات کی سب سے حسین عورت ہے۔ میں اس کا قرب چاہتا ہوں چاہے وہ ایک بار نصیب ہو۔ اس کے بعد میں زندہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔“

وہ بری طرح ہنسنے لگے۔ اندھیرے میں ان کے سفید دانت ایک ساتھ چمکے تو مجھے عجب خوف سا محسوس ہوا۔ وہ بوڑھا کھڑا ہوا جس نے گردن کے بعد مجمع سے خطاب کیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”جابر بن یوسف ایک جذباتی نوجوان ہے۔ اسے بتایا جائے کہ جن لوگوں کو ہم پسند کر لیتے ہیں ہمیں انہیں اپنے سانچے میں ڈھالنا آتا ہے۔ اس جزیرے پر اقبال کی نہیں، ہماری حکمرانی ہے۔ ہم نے جابر بن یوسف کی فلاح کے یہ قدم اٹھایا ہے۔ اسے آگاہ کیا جائے گا کہ ہم کون ہیں۔ ہم انسانوں کو پتھروں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ہم سمندر کی دیو زاد لہروں کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ ہم پانی میں آگ لگا دیتے ہیں۔ ہماری آنکھیں اقبال کی سلطنت کے تمام افعال و اشغال میں بیٹھے بیٹھے دیکھ لیتی ہیں۔ اس سے کہہ دیا جائے کہ اس فتنے کی سلطنت عارضی ہے۔ سلطنتیں شب و روز میں نہیں بدلا کرتیں۔ ہمارے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں قرن گزر گئے ہیں۔ اس سے کہہ دیا جائے کہ صرف اقبال ہی جارا کا کا مقدس روح کی نمائندہ نہیں ہے، ہماری نگاہیں بھی اسی طرف ہیں۔“ اس کی آواز میں دھیرے دھیرے جوش پیدا ہوتا گیا۔

”مگر وہ بہت حسین ہے میرے دوستو! اس پر فناء ہونے کو جی چاہتا ہے۔“ میں نے بذلہ سنجی کی۔

”جابر بن یوسف کو ہمارے تجربوں کی ضرورت ہے۔ ہم اسے یہاں ہر طرح خوش رکھیں گے۔ یہاں اعلیٰ درجے کی شراب اور خوبصورت عورتیں موجود ہیں۔ یہاں ملازموں کی کثرت ہے جنہیں ہم نے اس کی سلطنت سے اغوا کیا ہے۔“ بوڑھے نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ”یہاں جابر بن یوسف کے لئے اقبال کے سوا سب کچھ ہے جو کسی کو نہیں ملتی۔ کوئی عجب نہیں کہ کل سرنگا کو ادھر آنے کا راستہ مل جائے اور ہم اس کی لڑکی سرتیا اور فلورا کو بھی یہاں لانے میں کامیاب ہو جائیں۔ ہمارے ہاتھ لمبے ہیں اور ہمارا قد مسلسل بلند ہو رہا ہے۔“ بوڑھے نے یقین کے لہجے میں کہا۔

ان کی گفتگورات گئے تک جاری رہی اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں سے میرے فرار کی ہر کوشش بے سود ہوگی۔ میں نہ جانے کتنے طویل عرصے کے لئے یہاں قید ہو گیا ہوں۔ وہ اپنی بات منوانا جانتے تھے۔ میں پتھر کے ان انسانوں کی قطاریں دیکھ رہا تھا جنہیں انہوں نے محفوظ کر دیا تھا، وہ کسی وقت بھی انہیں متحرک کر سکتے تھے۔ وہ کسی وقت بھی مجھے پتھر میں تبدیل کر سکتے تھے۔ میں اپنی اقامت گاہ میں بے سُدھ ہو کر گر گیا۔ میں نے ان کی طرف سے پیش کی ہوئی نوجوان لڑکی، مشروبات اور غذاؤں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آہ میں نے کیا سوچا تھا، کیا ہو گیا۔ جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ میں اس کے دشمنوں کے علاقے میں ہوں اور وہ مجھے اس کے خلاف ساز باز میں شریک کر رہے ہیں تو اس کا کیا عالم ہوگا؟ ان گدھوں نے میری زندہ لاش کو گھیر لیا ہے میں لامحدود عرصے کے لئے اپنا جسم پتھر میں تبدیل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں جلد مرنا چاہتا تھا۔

☆=====☆

میزبان لڑکی میری بذیاتی حالت دزیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور طرح طرح سے پہلو بدل رہی تھی۔ اس کے سراپا میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی، اس کے سوا کہ وہ جوان تھی۔ رات خاصی ڈھل چکی تھی۔ میں نے اسے سونے کا حکم دیا اور اضطراب کے عالم میں پتھر کے قدح میں رکھا ہوا سارا مشروب حلق میں اندیل لیا۔ اسے پیتے ہی مجھے اپنے سینے میں ایک کاٹ سی محسوس ہوئی۔ آنکھوں میں تپش سی ہونے لگی۔ نزاع و انتشار کی اس کیفیت میں، میں نے پتھر کا وہ خوان الٹ دیا جو غذاؤں، پھل اور شروبات سے پُر تھا اور پتھر کے اس کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر ہر طرف خاموشی تھی۔ رات کی دہی ہوئی خاموشی میں پرندوں کی سسکیاں اور حشرات الارض کی سرسراہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ رات ختم ہونے والی تھی۔ بھیا نک سنا ہر طرف مسلط تھا۔ ہر طرف اندھیرے، درخت اتنے اونچے اور گھنے تھے کہ چاند کی روشنی زمین پر کسی بدست ہوا کے جھونکے کی وساطت ہی سے نیچے اتر سکتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا لگی تو خمار اور بڑھ گیا۔ خمار بڑھا تو انتشار سوا ہو گیا۔

میں اقبال کے بارے میں سوچنے لگا، نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟ جزیرہ انگروما کے سبزہ زار زارشی کے صحرا میں تبدیل ہو جائیں گے، یہ سب برگزیدہ لوگ، یہ ساری آبادی عذابناک تباہی سے دوچار ہوگی، وہ کب تک ان کی سرکشی برداشت کرے گی؟ وہ جو تاریک براعظم میں طاقت کا منبع اور مرجع ہے، جسے اس جلیل منصب پر دیوتاؤں نے فائز کیا ہے، اس کے اسرار بے پناہ ہیں۔ کیا وہ خاموش بیٹھی رہے گی؟ مگر..... مگر شاید مشروب نے میرے ذہن پر نقاب ڈال دی تھی۔ اب میں ایک مجسمے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی سختی سے جب میرے احساس کی آنکھ کھلی تو انگروما کی سرزمین پر مجھے اپنا بوجھ نظر آیا۔ میں ایک بڑے چوہے دان میں قید تھا۔ ساری خوش فہمیاں کا نور ہو گئیں۔ حقیقت کیا تھی؟ حقیقت یہ تھی کہ اب میں انگروما میں تھا اور تاریک براعظم کی مطلق العنان ساحرہ اپنی تمام فسوں کاریوں اور کشمہ سازیوں کے باوجود جزیرہ انگروما کو نیست و نابود نہیں کر سکتی تھی۔ یہ جزیرہ ایک زمانے سے موجود تھا اور وہ ایک زمانے سے اسے بڑھتا اور پھیلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

توری، باگمان، زارشی اور اب انگروما میں..... اپنے وطن سے پھڑنے کے بعد میرے ساتھ تسلسل سے حیرت انگیز واقعات پیش آرہے تھے۔ میں بڑی ایک گیند تھا جو ادھر سے اُدھر لڑھک رہی تھی، جن پر ضربیں پڑ رہی تھیں۔ جو بار بار فضا میں اٹھ کر پھر زمین پر آ جاتی تھیں۔ انہوں نے رات اپنے جلسے میں کہا تھا کہ وہ لامحدود عرصے سے یہاں مقیم ہیں اور ساعت بہ ساعت اپنی تعداد میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے سلطنت اقبال کے جوہر اس سے چھین لیے تھے۔ وقت کا انہیں کوئی خیال نہیں تھا چونکہ وقت ان کے جسموں میں مقید ہو گیا تھا۔ وہ دیوتاؤں اور اقبال کے اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ انہیں مشروب حیات نوش کرنے کی سعادت بخشی گئی تھی۔ ان کی عمر ٹھہر گئی تھی اور جو اس نعمت سے محروم رہے تھے وہ پتھروں میں تبدیل کر دیئے گئے تھے تاکہ انہیں متحرک کر کے بوقت ضرورت ان سے کام لیا جاسکے۔ میں ابھی اس کے قرب کی منازل طے کر رہا تھا اور دیوتاؤں کے اتنے قریب نہیں پہنچا تھا کہ مجھے مشروب حیات سے نوازا جاتا۔ میں اسے پینے کا خواہش مند نہیں تھا۔ میرے لیے اس کا قرب ہی حیات آفریں تھا۔ وہ ایک لمحہ لطیف، وہ ایک ساعت گداز ہی میرے لیے بہت تھی۔ اس کے بعد زندہ رہنے کی آرزو و فضول تھی۔ اس تمام جدوجہد کے باوجود عظمت و فضیلت میں انگروما کے بہت سے بزرگوں کی بہ نسبت میرا مقام پچھلی قطار میں تھا۔ ان میں سے جس کا سینہ دیکھیے نو اور سے آراستہ نظر آتا تھا۔ ان لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر جزیرہ توری واپس جانے کا خیال ایک خواب کی طرح تھا۔ فرار کی کوئی کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آ رہی

تھی۔ ہر طرف پہرے تھے مگر جس شخص نے اپنی آنکھوں سے اقبالہ کے جاہ و جلال کے تصور دیکھتے ہوں، وہ کس طرح یقین کر لیتا کہ کسی دن ان باغیوں کی کوششیں بار آور ہوں گی۔ میں جہاں سے چلا تھا وہیں آ گیا۔ انہوں نے مجھے پیچھے کی طرف لوٹا دیا اب پھر وہی کیفیت موجود تھی جو اس وقت محسوس ہوئی تھی جب جزیرہ توری پر ہم چند بد نصیبوں نے قدم رکھے تھے ہم نے اپنے مقدر پر قناعت کر لی تھی اور سوچ لیا تھا کہ ہمارا ماضی سمندر میں ہمارے لباس کے ساتھ بہہ گیا۔ ہم دوبارہ پیدا ہوئے ہیں۔ عجیب بات تھی کہ مہذب دنیا کو بھلانے میں دیر نہیں لگی تھیں لیکن جزیرہ توری کا ماضی فراموش کرنا مشکل معلوم ہو رہا تھا میں تیسری مرتبہ پیدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اسے بھولنا آسان نہیں تھا۔ ان کے عشق میں کوئی خامی ہوگی جو اسے بھلا بیٹھے، نہ جانے میرے ان رقیبوں میں سے کتنوں نے حالات سے مجبور ہو کر ان سے مفاہمت کر لی ہو۔ ایک میں تھا کہ میں نے اس کے لئے کہاں سے کہاں تک سفر کیا تھا۔ اب مجھ میں اس کے حریفوں کا ہم نوا ہونے کی طاقت نہیں تھی۔ میرے پریشان خیال مجھے کچھ کے لگاتے رہے۔ پتھر کا آدمی خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اسے جھنجھوڑنا شروع کر دیا اور اپنی پوری طاقت سے چنگھاڑ کر کہا۔ ”س اے بد قسمت شخص! کیا تو اس گمان میں ہے کہ تجھے ایک دن متحرک ہو جانا ہے مگر وہ دن..... وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ یہ شکست خوردہ اور اعصاب زدہ لوگ اسے کبھی شکست نہیں دے سکیں گے۔ تو زمین پر اپنے بے شمار ساتھیوں کے ساتھ اسی طرح لیٹا رہے گا۔ تیرے اندر شگاف پڑ جائیں گے اور پرندے تیرے جسم پر غلاظتیں بکھیریں گے، پتھر کا یہ خول زمانے کے حوادث اور اس کے عتاب سے گل جائے گا۔

میری آواز صرف میرے کانوں نے سنی۔ میں چیختے چیختے اس مجسمے کے قدموں میں گر پڑا۔ جس سے مخاطب تھا اور ہوش کھو بیٹھا۔ شور سے میری آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ میرے سر ہانے انگریزوں کا گراں گروٹا کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بازو کے سہارے اٹھایا اور نرمی سے کہنے لگا۔ ”جابر بن یوسف! اٹھو، اٹھو، اے معزز شخص تم نے انگریزوں کی ایک سردرات پریشان خیالی میں گزاردی۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم جتنی جلد، کل، سے رشتہ منقطع کر لو گے، اتنے ہی سکون سے رہو گے۔ تم اپنے قیمتی دن کیوں ضائع کر رہے ہو؟ تمہیں یہاں..... ہم لوگوں میں شامل ہو جانا چاہئے۔ تمہاری عمر مختصر ہے۔ تمہارے باطن کو اور آسودہ کرنے کے بعد ہم تمہیں پتھروں میں تبدیل کر دیں گے اور پھر تم اس وقت جاگو گے جب ہمارے پاس مشروب حیات موجود ہوگا۔“

”گروٹا!“ میں نے نحیف آواز میں اُسے مخاطب کیا۔ ”رات کی باتیں میرے ذہن سے مٹ نہیں ہوئی ہیں۔ جو کچھ میں نے رات کہا تھا۔ میں اب بھی اسی پر قائم ہوں۔“

”یہ گریز نہ ہوتا تو ہمیں تم پر شک ہوتا۔“ گروٹا مسکرانے لگا۔ ”لیکن یقین کرو کہ تمہیں بعد میں پشیمانی ہوگی کہ تم کتنے قابل قبول حقائق جھٹلاتے تھے۔“

”گروٹا! میں تمہارے جذبوں سے واقف ہو گیا ہوں۔ فرض کرو اگر میں تمہارا ساتھ دینے سے انکار کرتا ہوں تو تم کیا کرو گے؟“ میں نے جرات سے پوچھا۔

”ہم تمہیں سمجھاتے رہیں گے، ہمارے پاس وقت کی کمی نہیں ہے۔“

”اور اگر تمہاری باتوں نے پھر بھی مجھے متاثر نہیں کیا۔ تو؟“

”یہ ناممکن ہے۔ تمہاری آنکھیں کچھ عرصے بعد سیاہ و سفید دیکھنے کی عادی ہو جائیں گی اور تم بھی ایک دن اس کے خلاف ایک پر جوش مبلغ بن جاؤ گے اور طاقت بڑھاتے رہو گے تاکہ اس کے زوال کا سبب بن سکو۔“ گروٹا نے عزم سے کہا۔

شاید تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ تم مجھے متقلب کرنے میں ناکامیاب ہو سکو گے یا نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم جابر بن یوسف کو اپنے قالب میں ڈھالنے میں کامیاب ہو گے تو کیا کرو گے؟“

”تم ایک انہونی بات کہہ رہے ہو۔“ گروٹا نے تندہ سے کہا۔

”یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔“

”جابر بن یوسف، مجھے معلوم ہے ایسا وقت نہیں آئے گا لیکن اگر ایسا ہوا تو ہم تمہیں اس زمین سے آسمان پر بھیج دیں گے۔“

”گروٹا!“ میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ”میں یہی بات کہلوانا چاہتا ہوں۔ تو سنو انگریزوں کے نگران معزز گروٹا! یہ خیال دل سے نکال دو کہ جابر بن یوسف اس کی طلب سے دستبردار ہو جائے گا، جس گل بدن کے لئے میں نے اپنے بازوؤں میں سنگ و آہن کی صفات پیدا کی تھیں۔ کیا حالات کی ستم ظریفی مجھے اس کے مخالفین میں محصور کر دینے میں کامیاب ہو جائے گی؟ تم اپنا وقت ضائع مت کرو۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو جبری اطاعت قبول کر لیں اور اپنے محبوب سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اپنا شعار بدل لیں۔ تم ابھی سے یہ فیصلہ کر لو کہ تمہیں ناکامی کی صورت میں جابر بن یوسف کو سزائیں دینی ہیں۔ میرے لیے ابھی فیصلہ کر دو، میں موت پسند کرتا ہوں۔ مجھے موت دے دو۔“

میری بات سن کر گروٹا زور سے ہنسا، اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں اور چہرے کی لاتعداد جھریاں متحرک ہو گئیں۔

”موت کا وقت آئے گا تو فیصلے میں دیر نہیں ہوگی۔ معزز جابر! ذرا انگریزوں کی سیر کرو۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں تمہاری تواضع کے لئے سب کچھ موجود ہے، تم یہاں آزاد ہو، تم ان بزرگ زیدہ لوگوں کی صحبت میں بیٹھو گے تو اپنے علم و فضل میں اضافہ کرو گے۔ رہائی کا خیال دل سے نکال دو۔“

”میں تم سے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔“ میں نے عجز سے کہا۔

”تم مجھ سے انگریزوں کی سرداری طلب کرو۔ دیوتاؤں کی قسم۔ میں تمہاری خواہش کا احترام کروں گا مگر جزیرہ انگریزوں سے تمہاری واپس ناممکن ہے۔ ایک دن تم دیکھو گے کہ اقبال کا کاٹا فٹہ تمہارے قدموں میں ہوگا۔ وہ روشن دن ضرور آئے گا۔ اسے ہزیمت لازماً نصیب ہوگی۔“

”یہ تمہارا خیال ہے۔“

”میرا نہیں۔ جزیرہ انگریزوں کے تمام عبادت گزار بزرگوں کا یہی خیال ہے۔ اس بے وفا سے عاجز آ کر ہی انہوں نے اس کے ستم کے خلاف آواز اٹھانے کا عزم کیا ہے۔“ گروٹا کے لہجے میں کوئی ارتعاش نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری شیریں بیانی اسے اپنے موقف سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائے گی لیکن وہ پتھروں سے زیادہ ٹھوس تھا۔

جزیرہ انگریزوں کے نگران کی حیثیت اعزازی سی تھی۔ وہ ایک طرح کا منتظم تھا اور جزیرے کے سربراہ اور وہ لوگوں کے سامنے اپنے احکام و

اعمال کے سلسلے میں جواب دہ تھا۔ اس کا انتخاب اتفاق رائے سے عمل میں آتا تھا۔ بڑے فیصلے جزیرے کے فاضل لوگ مل بیٹھ کر کرتے تھے۔ تاریک براعظم کے دوسرے مقدمات کی طرح یہاں بھی جنس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ یہاں چہل پہل تھی اور یہ علاقہ باگمان اور توری سے زیادہ مہذب اور سرگرم نظر آتا تھا۔ انہوں نے لاشعوری طور پر کام کی تقسیم بھی کر لی تھی۔ کئی جگہ جزیرے کی تمام آبادی کے لئے کھانا پکایا جاتا تھا اور جس کا جوجی چاہتا جتنا چاہتا کھاتا اور پیتا تھا۔ اس سرسبز علاقے میں فطرت نے فیاضی سے کام لیا تھا۔ شام کو مشعلوں کے ساتھ رقص ہوتا اور صبح تمام آبادی عبادت کے لئے مختلف مقامات پر جمع ہو جاتی۔ یوں ایک پرسکون، خوش گوار اور مثالی علاقہ تھا۔ یہاں ہر جگہ اشتراک نظر آتا تھا۔ عام آدمیوں کے ساتھ ان کا سلوک بے حد اچھا تھا۔ گرونا میرے کاندھے تھپتھپاتا ہوا ایک عجیب طہریہ مسکراہٹ کے ساتھ چلا گیا۔ میں جنون کی کیفیت میں بے ارادہ ایک سمت نکل گیا اور سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ سامنے ساحل پر آتی ہوئی اچھلتی کودتی لہروں کا ایک نہ ختم ہونے والا کھیل جاری تھا۔ میرے زخموں میں ٹیس اٹھنے لگی۔ ایک نیلے پر بیٹھ کر میں نے سمندر میں کود جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن موت کا انتہائی اقدام کرنے سے پہلے میں نے سوچا، مجھے کاہوکی ہمدرد روح کو طلب کرنا چاہیے۔ میری آوازیں پانی کے شور میں کھو گئیں۔ کاہوکی رُوح سامنے نہیں آئی۔ پھر میں نے سمورال کی دی ہوئی مالا سے رہنمائی چاہی لیکن اس کا کوئی دانہ روشن نہیں ہوا۔ میرے تمام تحائف میرے ارادوں کے دشمن ہو گئے تھے۔ شپالی کی چمک دمک مانند نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا سحر کارگر نہیں ہو رہا تھا۔ میں اپنی کشتی ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ سمندر کی اشتعال انگیز لہریں دیکھ کر میرے سینے میں طوفان سا اٹھنے لگا، مجھے اپنے دماغ کی رگیں ٹوٹی پھوٹی محسوس ہونے لگی اور میں نے چار دن تک کوئی تیس بار سمندر کی سمت کوچ کیا اور میلوں تک جزیرے کی سمتوں میں پیدل سفر کرتا اور روزانہ رات کو تھکا ہارا فرار کے ہر منصوبے میں ناکام ہو کر اپنی جھونپڑی میں واپس آ جاتا جہاں روز ایک نئی لڑکی میری منتظر ہوتی۔ غذاؤں اور مشروبات سے بھرا ہوا خوان موجود ہوتا۔ میں جھپٹ کر اس میں سے گوشت کے پارچے اٹھا لیتا اور مشروبات کے ساتھ پی کر سو جاتا۔ لڑکی میری وحشتیں دیکھتی۔ میرے قریب آنے کی کوشش کرتی اور میں اسے دھتکار کر سو جاتا۔ چار پانچ روز میں میری حالت پاگلوں کی سی ہو گئی تھی۔ میں ان کی مشترکہ عبادت میں اب تک شریک نہیں ہوا تھا اور نہ ہی میں نے اس دوران میں کسی سے ملاقات کی تھی۔ انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا ہوگا کہ آخر مجھے ان کے فیصلوں کے آگے جھک جانا ہوگا۔ وہ میرا صبر آزمایہ تھے مگر میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ میں ان کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا تھا۔ ان کے علاقے میں میری حیثیت ایک قیدی کی تھی۔ نہ جانے کب تک میری حالت یہی رہتی کہ ایک رات جب میں طویل سفر سے نڈھال اپنی جھونپڑی میں واپس آیا تو میں نے وہاں اقبالہ کے خاندانے کی ایک حسین لڑکی کو اپنا منتظر دیکھا۔ وہ اشار، ژولین اور لوریمیا کی طرح حسین تھی۔ اس کے خدو خال وہی تھے جو قصر اقبالہ میں جلوہ گن لڑکیوں کے لئے مخصوص تھے۔ اس کی سانسوں میں خوشبو اور بدن میں سحر انگیز کشش تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ سراپا ناز، سراپا التفات اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی، وہ پھولوں اور پتوں کے بستر پر دراز تھی۔ اس کے ہاتھ میں جام تھا اس نے وحشت کے عالم میں گلاس اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور اسے اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ میری سانس بحال ہوئی تو میں نے تشویش کے ساتھ اس سے پوچھا ”تم کون ہو؟“

”میں.....“ اس نے ایک ادا سے کہا۔ ”میں ایک شراب ہوں جو آج رات تمہاری تشنگی بجھانے کے لئے بھیجی گئی ہے۔“

”کیا..... کیا اس علاقے میں خانوادہ اقبالہ کی حسین ترین لڑکیاں موجود ہیں۔ کیا انہوں نے تمہیں بھی اس کے شبستان حسن و جمال سے چھین لیا ہے؟“ میں نے حیرت اور تشویش سے کہا۔

”اقبالا..... اقبالہ“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔ ہاں یہ نام میں نے سنا ہے۔ سنا ہے وہ کوئی بہت جابر اور سنگ دل ملکہ ہے۔ سنا ہے اس کے پہلو میں دل نہیں ہے۔ وہ بہت حسین ہے۔ کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟ اس نے بے نیازی سے پوچھا۔

”تم.....“ میں نے ایک پھیلی مسکراہٹ سے کہا۔ ”بلاشبہ تم ایک حسین لڑکی ہو، اس لیے کہ تمہارا تعلق یقیناً اسی قبیل سے ہے جہاں قدرت نے خصوصی توجہ سے کام لیا ہے۔ تمہارے لہجے کی شگلی اور شیرینی اس کی مرہون منت ہے۔ اس کا نام ادب سے لو۔ اس کے کان بڑے ہیں۔“

وہ ہنسی، گھٹنیاں سی بج انھیں، اس کے سفید دانت موتی کی طرح مشعل کی روشنی میں دکنے لگے۔ ”میں نے اپنی ماں سے اس کا نام سنا ہے۔ وہ اس کا تذکرہ بڑے اشتیاق سے کرتی ہے کیونکہ وہ وہیں سے آئی تھی، میری ماں بھی میری طرح حسین ہے۔ اس نے جاوداں عمر پائی ہے۔ میں اس کی عمر میں بوڑھی ہو جاؤں گی یا ممکن ہے اس سے پہلے ہمیں مشروبات جات کا ذخیرہ مل جائے اور ہم سب دوامی عمر حاصل کر لیں۔“

”یہ ایک خواب ہے، اے حسین لڑکی! انہوں نے کتنے فریب کھائے ہیں۔ تمہارا یہ پھول سا بدن مرجھا جائے گا لیکن وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں گے۔“

”میں کبھی نہیں مرجھاؤں گی۔ انہوں نے میری نوجوانی محفوظ کر لی ہے۔ آج ایک عرصے بعد شاید تمہارے لیے انہوں نے مجھے متحرک کیا ہے۔ میں ایک عرصے سے پتھر میں محفوظ تھی۔ انہیں جب میری ضرورت پڑتی ہے وہ مجھے پتھر کے خول سے باہر لے آتے ہیں اور وصل کے حسین لمحے گزارنے کے بعد مجھے اسی خول میں واپس کر دیتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ مجھے اس کی ذات میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

”کیشا..... میرا نام کیشا ہے۔ کیشا دیوتا کے نام پر۔ جو ہمارے قبیلے پر مہربان ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جابر بن یوسف!“..... اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ ”میں نے آج تک تم جیسا شخص نہیں دیکھا۔ معزز گروٹا نے تمہاری خوشی کے لئے میرا اعادہ کیا ہے۔ تمہارے سینے پر آویزاں تحائف اس بات کی علامت ہیں کہ تم ایک غیر معمولی شخص ہو۔ تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

”میں اس کے پاس واپس جانا چاہتا ہوں کیشا! میں اس سے منحرف نہیں ہو سکتا، میں یہاں سے ضرور واپس جاؤں گا۔“

”تم دیوتاؤں کی مرضی کے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتے۔“

”تو پھر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ میں نے زارشی میں ضبط نفس کے کئی سال گزارے ہیں، وہ مجھے میری موقف سے نہیں ہٹا سکتے جاؤ لڑکی..... کیشا جاؤ۔ گروٹا سے کہہ دو کہ میں نے تمہیں واپس بھیج دیا ہے۔“ میں نے اسے اپنے جسم سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ میرے غیر متوقع رویے پر حیران رہ گئی۔ میں نے اس کا سراپا ایک نظر دیکھا اور اسے چھوڑ کر تیزی کے ساتھ جھونپڑی سے نکل آیا۔

میری وحشت زدگی، اس وقت انتہا کو پہنچ گئی۔ جب مجھے جزیرہ انگر واپر بے سروپا، بے مقصد گھومتے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ گزر گئے۔ وہ

بار بار مجھے اپنے روبرو طلب کرتے اور میں انکار کر دیتا، چھ ماہ میں جزیرے کی مختلف لڑکیاں میری جھونپڑی میں آئیں پھر ان کی آمد بند ہو گئی اور میں ایک تنہائی سی محسوس کرنے لگا۔ اس عرصے میں انہوں نے مجھے کوئی اذیت نہیں پہنچائی تھی۔ وہ نرم لہجے میں ہی مجھے ہدایتیں دیتے رہتے۔ میں ایک آہوئے آوارہ۔ مجسموں کے درمیان، کبھی ساحل سمندر پر، کبھی درختوں میں، کبھی آبشار پر، کبھی پہاڑوں، نہروں اور دریاؤں پر گھومتا رہتا اور جب چھ ماہ گزر گئے تو ایک دن کسی نے میرے اندر سرگوشی کی۔ ”جابر بن یوسف! تم نے دیکھ لیا کہ تم نجات حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے؟ تم اپنے یقین سے ہٹ گئے ہو۔ اب تم کبھی واپس نہیں جاسکو گے۔ بہتر ہے کہ انہی میں شامل ہو جاؤ۔ وہ تمہیں مرنے بھی نہیں دیں گے۔ ہر سمت نا دیدہ لگا ہیں تمہارے ساتھ گھومتی ہیں۔ تمہیں اپنے تحائف سے بھی کوئی مدد نہیں مل رہی ہے۔ چلو ان کی عبادت میں شامل ہو جاؤ۔ اس کا خیال دل سے نکال دو، اس کی یاد دل سے جھٹک دو۔“

جب میں پریشان ہو کر سمندر کی طرف جاتا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انگریزوں کی ساری آبادی مجھ سے کہہ رہی ہو۔ ”وہ ایک فریب ہے وہ ایک سراب ہے۔ جابر بن یوسف! ہماری طرف آ جاؤ۔“

اور میں چارونا چار ایک دن ان کی طرف مڑ گیا۔ اس دن معمول کے مطابق تمام برگزیدہ لوگ ایک جگہ جمع تھے۔ ان کے سر اس نیولے کے گرد جھکے ہوئے تھے جسے گرونانے اپنے سر پر بٹھا رکھا تھا۔ نیولا عظیم جارا کا کا کی علامت ہے، نیولے کی خوں خوار آنکھیں ایک سمت لگی ہوئی تھیں اور وہ بیک زبان کہہ رہے تھے۔

..... ”جارا کا کا ہمیں برتری عطا کر..... ہمیں اس پر فوقیت دے..... ہم تیرے ہر امتحان میں پورے اترے ہیں۔ جارا کا کا۔ ہمیں اور زمین دے تاکہ ہم اور پھیل سکیں۔ ایسی زمینیں، جن میں اچھی نسلیں اور فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے سر آسمانی بلاؤں کے مقابلے میں تیرا تحفظ چاہتے ہیں۔ عظیم جارا کا کا، تیری یہ کھیاں غول کی شکل میں تیرے احسان فراموشوں پر چھٹنے کے لئے برقرار ہیں۔ تو نے اسے بہت وقت دیا، کچھ وقت ہمیں بھی عطا کر کہ ہم یہ خطا راض تیری آگ سے روشن کر سکیں۔“ ان کی دعاؤں کی گونج سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ ان کے سر جنونی انداز میں کسی پھر کی کی طرح متحرک تھے اور دونوں ہاتھ مقدس نیولے کے سامنے اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ میں ان سب کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ یکا یک ان میں انتشار پیدا ہوا اور بیک وقت ان سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بہت سی نگاہیں حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میرے چہرے پر جم گئیں۔ میں نے ان نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے خفت سے سر جھکا لیا۔ میں صرف ان کے چمکتے ہوئے چہرے دیکھ سکا، اسی لمحے گرونا کی مرتعش آواز ابھری۔

”عظیم جارا کا کا! اس کی آمد تیری خوشنودی کی بشارت ہے آخر وہ سچائی کی طرف آ گیا ہے وہ دیکھو، وہ سب سے پیچھے کھڑا ہے مگر اس کی جگہ وہ نہیں ہے۔“

پھر اس نے بلند آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ ”جابر بن یوسف! اے محترم شخص! ادھر آ، جارا کا کا کے پہلو میں، اور برکتیں سمیٹ۔“

اس کا بیان ختم ہوتے ہی لوگوں نے ادھر ادھر بننا شروع کر دیا اور میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا گرونا کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنے سر سے نیولا اتار کر میرے سر پر رکھ دیا اور مجمع میں ایک جھنجھٹا ہٹ سی ہوئی۔

”انگرو ما کے معزز لوگو!“ گرونا حلاوت سے بولا۔ ”ہماری تعداد میں ایک اور شخص کا اضافہ ہوا۔ جابر بن یوسف کوئی ایک آدمی نہیں ہے۔ وہ اپنی اعلیٰ صفات کی وجہ سے کئی آدمیوں کے برابر ہے۔ ایک دن وہ تنہا رہ جائے گی۔ بے دست و پا۔ پھر ہم اس کی روح مقید کر لیں گے اور اس کا بدن جارا کا کی روشن آگ کے سپرد کر دیں گے۔ جابر بن یوسف آج سے ہمارے برگزیدہ لوگوں میں شامل ہے۔ میں اسے تمہاری ایما سے بوڑھے گورے کے حوالے کرتا ہوں۔ وہ جابر بن یوسف میں اپنی فضیلتوں کی روشنی منعکس کرے گا۔ وہ اُسے مسلح کرے گا۔ وہ اسے اسرار سے واقف کرے گا۔“ میں ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ آوارگی کے چھ ماہ گزارنے کا تجربہ میرے لیے بہت تلخ ثابت ہوا تھا۔ میں نے اپنے لب سی لیے تھے اور میں ان کی زبان کا زہر پیتا رہا۔ ایک شخص مر گیا تھا، ایک شخص پیدا ہوا تھا، اس دوسرے شخص کا نام اتفاق سے جابر بن یوسف تھا۔ جابر بن یوسف ایک سرکش، ضدی اور جذباتی نوجوان تھا۔ اس کی اپنی انا تھی۔ میرے ذہن میں اپنے اس نئے اقدام کی تائید میں طرح طرح کے جواز پیدا ہو رہے تھے۔ گورے اگلی صف میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ مجمع سے نکل کر گرونا کے پاس آیا اور اس نے میری دائیں ہتھیلی سرخ شعلے سے داغ دی۔ میں نے کوئی سسکی نہیں بھری، داغ لگ چکا تھا۔ اقبال کے مخالفوں کا ساتھ دینے کا داغ، گورے نے جہاں میں کھڑا تھا، زمین پر اپنی انگلی سے کوئی شمشیر بنائی اور میرے پاؤں کے گرد ہالا سا کھینچ دیا۔ میرے گلے میں لٹکا ہوا لکڑی کا سانپ اپنی اصلی حالت میں آگیا اور پھن کاڑھ کر گورے کی طرف رخ کرنے لگا، میری سر پر نیولا تھا۔ سمورال کی دی ہوئی مالا کے دانے چمک رہے تھے اور مجمع میں سرگوشیاں اُبھر رہی تھیں۔ آخر یہ سرگوشیاں اس وقت انتہا کو پہنچ گئیں جب سانپ نے میرے کاندھے پر لہرا کر نیولے کے سامنے اپنا منہ جھکا دیا، نیولے نے کسی اشتعال کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ان دونوں کے منہ بوس و کنار کے انداز میں قریب آئے اور سانپ نیچے اتر کر میری گردن پر جھول گیا۔ یہ ایک حیرت انگیز مظاہرہ تھا، گورے نے طشت میں رکھی ہوئی آگ میں کچھ جھونک دیا۔ آگ کے شعلے تیزی سے بھڑکے۔ گورے نے میرا ہاتھ پکڑ کر میری کھال کی ایک چمکی بھری۔ گورے کی چمکی کسی خنجر کی طرح میری جلد میں پیوست ہو گئی اور خون رسنے لگا۔ خون کے چند چھینٹے اس تابندہ آگ کے اوپر نچھاور کر دیئے گئے اور کچھ قطرے نیولے کے سامنے عقیدت سے پیش کیے گئے۔ نیولے نے وہ قطرے گورے کی ہتھیلی سے چاٹ لیے اور میں نے دیکھا کہ آگ اچانک بھڑک اٹھی ہے اور اس کے شعلوں نے واضح طور پر انسانی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ انسانی شکل بتدریج اتنی واضح ہوتی گئی کہ میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتی تھیں۔ وہ اقبال کا ہیولا تھا۔ جو دھوئیں اور شعلوں میں بگڑتا سنور تانمودار ہوا۔ اس کا حسین سراپا، شدید کرب و اضطراب کے عالم میں مبتلا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اپنے سارے جسم سے خون نکال دوں اور وہ آگ سرد کر دوں لیکن میرے قدم ہل بھی نہیں سکے۔ میں سسندرت تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ مجمع پر ایک جوش طاری تھا۔ ایک خوشی حاوی تھی۔ گورے کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سانپ اور نیولا مضطرب نظر آتے تھے۔ اقبال کا ہیولا دیکھ کر اُن کا شور اور بلند ہو گیا لیکن بہت جلد آگ کے شعلے دھیمے پڑ گئے اور سارے مجمع پر ایک سکون سا چھا گیا۔ جب میں وہاں سے ہٹا تو میرے قدموں کے گہرے نشان زمین پر ثبت ہو چکے تھے۔ نیولا سر پر بیٹھا ہوا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت وزنی شے ہے۔

”آؤ، میرے ساتھ۔“ بوڑھے گورے نے شفقت سے کہا۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگا۔ گورے نے نیولے کو اپنے کاندھے پر بٹھالیا اور میری گردن میں لٹکے ہوئے سانپ کو انگلی کا اشارہ کر کے لکڑی کے ایک دائرے میں تبدیل کر دیا۔ اس نے نیولے کی جلد کو بوسہ دے کر

اسے فضا میں اچھال دیا، میں اسے خاصی دُور تک دیکھ سکا۔ پھر وہ میری نگاہوں کے دائرے سے نکل گیا۔ میرے ساتھ اور بہت سے لوگ بھی چل رہے تھے۔ گرونا بھی ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ لیے ہمارے ساتھ گامزن تھا۔ یہ تمام لوگ تعداد میں بے شمار تھے۔ ان میں سے بیشتر زیادہ عمر کے لوگ تھے۔ لوگ آگے جا کر منتشر ہونے لگے پھر میں اور گورے تنہا رہ گئے۔ راستے میں ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ گورے جب اپنے پتھر کے مکان میں داخل ہوا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں ٹھنک کر رُک گیا۔ کوئی اندازہ تک نہیں کر سکتا تھا کہ پتھر کے اس بند مکان میں ایک مکمل موجود ہوگا۔ اس کی روشنی سے وہ سخت سیاہ لگی دیواریں روشن نظر آتی تھیں۔ یہ مبالغہ نہیں ہے اور نہ حسن کے معاملے میں میرے اظہار کا کوئی شاعرانہ پیرایہ ہے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہاں کشیا جیسی شکل کی ایک سفید فام حسین و جمیل لڑکی موجود تھی۔ اس نے میری طرف بہت غور سے دیکھا، ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ پھر معدوم ہو گئی۔

”جابر بن یوسف۔“ گورے نے میری طرف اشارہ کر کے اسے مخاطب کیا۔ ”یہ ہمارا مہمان ہے۔ میں اس کے علم کی پرورش کروں گا اور اسے پارسا لوگوں میں سب سے بڑا پارسا بناؤں گا۔ میں اے مقدس جانوروں کے خون سے غسل دوں گا اور یہ ہمارے لیے اس کے خلاف ایک زبردست ڈھال ثابت ہوگا۔“

دو شیر ذہال و جلال نے اس کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ ایک محویت کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ بال سیاہ تھے اور چہرہ اتنا پاکیزہ، اتنا دلکش تھا کہ یہ اقبال کی خاص کمیزوں ہی کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ ایک مکمل لڑکی تھی۔ کیشا اور اس میں بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے سوا کہ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک زیادہ تھی اور اس کے اطوار باوقار تھے۔ میں مبہوت سا اسے دیکھا کیا اور قریب رکھے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے شیریں لب کھولے۔ ”تم بھی وہیں سے آئے ہو، تم بھی اسے بھول گئے؟“ میں نے اس کے لہجے میں درد محسوس کیا۔

”ہاں اے دو شیر ذہ آسمان! میں بھی کبھی وہاں تھا لیکن میری درخواست ہے کہ مجھ سے ماضی کے متعلق سوالات نہ کرو۔“

”خوب، خوب۔“ گورے مسکرایا۔ ”یہ ذہنی صحت مندی کی علامت ہے، جارا کا کانے اسے قبول کر لیا ہے اور اس نے انگریزوں کے شریف لوگوں کا ساتھ دے کر ہماری طاقت میں اضافہ کیا ہے۔“

”بلاشبہ یہ ایک اضافہ ہے۔“ وہ اپنا طنز چھپانے لگی۔ ”اس کا قد بڑا کرنا ضروری ہے۔“

”ہاں۔ یہ ہمارا مہمان ہے۔ ہم نے تمہاری بیٹی کیشا کو اس کی آسودگی کے لئے بھیجا تھا مگر اس نے ہماری مہمان نوازی سے لطف نہیں اٹھایا۔ اس نے ہمارے پاس آنے میں تامل سے کام لیا۔ جابر بن یوسف ایک مستقل مزاج، جذباتی اور متکبر شخص ہے، میں اسے مشورہ دوں گا کہ وہ یہ خصائص ترک کر دے۔“ گورے نے سنجیدگی سے کہا۔

”وہ شخص مر گیا۔ اب جابر بن یوسف تمہارے احکام کا تابع ہے اور تمہارے جزیروں کے ہر فرد کا غلام ہے۔ اس کی اپنی کوئی ذات نہیں ہے وہ تمہارے ہاتھ کا اسلحہ ہے، وہ تمہارے لیے بہترین گھوڑا ثابت ہوگا، اس کی لگام تمہارے رکھنا تمہارا کام ہے۔ یقین کرو یہ جانور تمہارا بہترین

معمول ثابت ہوگا۔ گورمے سچ سچ بتاؤ کیا میں نے پہلے جابر بن یوسف کا گلا نہیں گھونٹ دیا ہے۔؟“ میں نے سر دلچے میں کہا۔

”تم سچ کہتے ہو لیکن یاد رکھو جو پیش گوئیاں تمہارے ذہن میں محفوظ ہیں، جزیرہ انگروما میں آکر ان کی سمت بدل گئی ہے۔ ہم نے اپنے مقدر سے لڑنا سیکھا ہے۔ ہم نے فیصلے بدل دیئے ہیں۔“ گورمے کی قدر تیز لہجے میں بولا۔

”گورمے سچ کہتا ہے۔“ نیشا ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

”میں تمہاری اصلاح کروں گا اور تم دیکھو گے کہ زمین کیسا رنگ بدلتی ہے۔ جزیرہ انگروما کا ہر خطہ تمہارا ہے، اس کے درخت تمہارے، اس کے پھل تمہارے، اس کے لوگ تمہارے اور اس کی عورتیں تمہاری ہیں۔ انگروما کی یہ عورت تمہاری خواہش پر پیش کردی جائے گی تاکہ ہوس تم پر غلبہ نہ پاسکے اور تم ایک سو ہو کر اسرار و رموز کے علم میں مستغرق ہو جاؤ۔ میں نیشا کو تمہاری آنکھوں کی جلن دُور کرنے کے لئے پیش کرتا ہوں۔ نیشا نے اس علاقے کے پُر جلال افراد کو شاد ماں کیا ہے۔ اسے اقبال کا قرب خاص حاصل رہا ہے۔ یہاں آکر اس نے کیشا اور کیشا جیسی بہت سی لڑکیوں کو پیدا کیا ہے جنہوں نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ نیرو آ زما ہونے سے دور رکھا۔ ہم نے ان لڑکیوں کے شباب کی عمر طویل کرنے کے لئے انہیں پتھروں کی شکل دے دی ہے۔ اگر تم اس کے بدن کی یکسانی سے اکتا جاؤ تو اس کی حسین لڑکیوں میں سے کسی ایک کو کسی وقت متحرک کیا جاسکتا ہے۔“ گورمے کے لہجے میں سنجیدگی اور شفقت شامل تھی۔

میں نے گورمے کی موجودگی میں آگے بڑھ کر نیشا کے خوبصورت مرمریں ہاتھوں کو بوسہ دیا اور گورمے مسکراتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا اور ہم دونوں اس کمرے میں تنہا رہ گئے۔ تھوڑی دیر خاموشی کا لطف رہا۔ میری دیوانگی میں اور تشدد آ جاتا لیکن اس وقت نیشا کی آواز گونجی۔ ”ٹھہرو!“ اس نے حکم یہ انداز میں کہتے ہوئے اپنے سر کا ایک بال توڑ کر آنکھوں کے سامنے کیا اور اسے پھونک ماری۔ اس کی پھونک سے بال جلنے لگا اور کمرے میں عجیب قسم کی چراغ پھیل گئی۔ چاروں اطراف نگاہ دوڑا کر اس نے شان استنسا سے کہا۔ ”وہ اب شاید کسی کو معاف نہیں کریں گے تم نے اچھا کیا کہ ان کی باتیں قبول کر لیں، اس کے سوا تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔“

”میں اب اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ وہ جانتی ہوگی کہ میں نے ان گنت مجسمیں اور شامیں انکار و استرداد میں کاٹ دیں۔ میں نے اپنا جسم خشک رکھا۔ میں اس کی توجہ کا منتظر رہا۔ پھر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ مجھے خود کو آئندہ دنوں کے حوالے کر دینا چاہئے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ میرے سینے پر تحائف جھول رہے ہیں۔ یہ یہاں بے کار ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کے لئے کئی بار اپنی زندگی داؤ پر لگائی لیکن یہ میرے کسی کام نہ آئے۔ تمہاری باتوں سے میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ تم پر اب تک اس عظیم و جلیل ملکہ کا تاثر قائم ہے۔“

”خاموش رہو۔“ اس نے سسکاری بھری۔ ”گو میں نے افشائے راز کے لئے اپنا ایک بال، اپنی عمر کا ایک سال کم کر لیا ہے تاہم جن لوگوں میں اب تم موجود ہو ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ وہ ماورائی علوم میں طاق ہیں۔ یہاں آکر انہوں نے اپنا علم بڑھانے کے سوا کوئی کام نہیں کیا، اقبال!..... وہ حسین و شیرہ..... اس کا قصر، اب تو ایک خواب ہے۔“ اس نے حسرت سے کہا۔

میں نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ وہ کہنے لگی۔ ”میں نے کئی بار یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ہر بار انہوں نے مجھے اپنی طاقتوں کے ذریعے واپس کھینچ لیا۔ میں اقبال کے حکم پر غلاموں کے ایک طائفے کے ساتھ کاہن اعظم کے شگون کے بعد جزیرہ امسار جا رہی تھی کہ انہوں نے

سمندر کی لہروں کا رخ موڑ دیا اور میں یہاں پہنچ گئی یہاں آ کر میں قبیلے کے سرکردہ لوگوں میں تقسیم ہوتی رہی۔ گورے کے پاس بہت سی طاقتیں ہیں۔ وہ عرصے تک گھر سے باہر رہتا ہے مجھے یہاں تک کھینچنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے اس لیے میں مستقل طور پر اسی سے وابستہ کر دی گئی ہوں۔ وہ مجھ پر شک کرتے ہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ میرا وجود ان کی برتری کے مقابلے میں بہت ناتواں ہے۔

”فرار محال ہے۔ موت بھی محال ہے۔ ہر شخص نے یہاں آ کر شاید یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب ان کے احکام کے سامنے سر جھکا لینا چاہئے۔“ میں نے نیشا کی زلفیں اپنی سانسوں سے اڑاتے ہوئے کہا اور زمین پر لیٹ کر میں نے اقبال کے التفات، اپنی کامیابیوں اور تیرہ بختیوں کی داستان اسے سنائی۔

☆=====☆=====☆

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/مؤلف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو نمٹک کے معروف پبلشرز ”علم و عرفان پبلشرز“ کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب نائسل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک..... کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجئے اور کتاب لیجئے.....

خواتین کے لیے سنہری موقع..... سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق.....

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں.....

عمیرہ احمد	ماہا ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قصہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنول نازی	گنہت عبداللہ	رفعت سراج	نبیلہ عزیز	گنہت سیما	میمونہ خورشید علی
وصی شاہ	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔ اے۔ راحت	اعتبار ساجد	شیمابجید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحق حق	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایس۔ ایم۔ ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور ilmoirfanpublishers@yahoo.com

دوسرے دن سے باقاعدہ میں نے ان کی عبادت گاہ میں جانا شروع کر دیا۔ میں رات کو ان کے جلسوں میں بھی شریک ہونے لگا۔ وہ روز جمع ہو کر اقبال کے خلاف دعائیں مانگتے تھے۔ میری آواز نے کبھی ان کا ساتھ نہیں دیا لیکن پھر میرے لب خود بخود ان کے ہونٹوں کے ساتھ کھلنے اور بند ہونے لگے۔ میرا بیشتر وقت گورے کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس نے مجھے کمال شفقت، کمال انہماک سے بہت سے اسباق رٹانے شروع کر دیے۔ میں بھی اس کے لئے کوئی نیا اور کند ذہن طالب علم ثابت نہیں ہوا۔ میں نے اس کی ہر حرکت اور ہر عمل میں بے حد دلچسپی لی۔ میرا تجسس، میرا شوق اور میری کامیابیوں نے گورے کو میری طرف کچھ زیادہ ہی مائل کر دیا تھا۔ وہ رات کو مجھے محسوس کے درمیان لے جاتا، انہیں جگاتا اور انہیں مجھ سے متعارف کراتا، اس نے کیشا کی کئی بہنوں کو بھی جگا کر میرے جذبات کو مشتعل کیا۔ یہ لوگ بعد میں اتنے بُرے نہیں معلوم ہوئے لیکن ایک کسک، ہاں ایک چھین اس وقت ضرور محسوس ہوتی تھی جب وہ طنز یہ شد و مد اور نفرت و حقارت سے اقبال کا نام لیتے تھے۔ میں گورے کے ساتھ اس وسیع و عریض جزیرے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کرتا رہا اور نہایت سعادت مندی سے اس کے اقوال، اس کی ہدایتیں اپنے دماغ میں بٹھاتا رہا۔ پُراسرار علوم کے بارے میں، سمورال، اشار اور اسٹالا سے مجھے خاصی شہ بد حاصل ہو گئی تھی مگر گورے کے نوبہ نوکر شے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو ایک سمندر ہے۔ جتنی گہرائی میں پہنچو، جتنی دنیا میں نظر آئیں گی۔ میں نے لیغو کھایا تھا۔ سانپ اور آدی کا خون پیا تھا۔ میں برسوں آگ کے گرد بیٹھا تھا۔ اب اگر میں اپنی غلاظتوں کے بارے میں کچھ کہوں گا تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنی سرگزشت بیان کروں، گندے جانور، خون، کھوپڑیاں، آگ اور طرح طرح کے عمل، جادو، عمل جراحی کی طرح ہوتا ہے۔ سنان اور ویران جگہوں پر اندھیرے غاروں میں گورے نے میری تربیت کی۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ میری اشتہا بڑھتی گئی۔ میں نے گورے کو کسی شب سکون سے نہیں سونے دیا اور پھر ایک روز ایسا آیا کہ گورے چاند کے زوال کے دنوں میں مجھے گھنے جنگل کے درمیان لے گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مشعل تھی اور آج اس نے اپنا پورا جسم بطور خاص رنگا تھا۔ میرے ہاتھ میں اس نے ایک پیالہ تمہا دیا تھا جس میں ایک سیاہ سیال، چیچھا مادہ بھرا ہوا تھا۔

گورے روزانہ ہی کوئی نہ کوئی خطرناک عمل کر کے مجھے حیرت زدہ کر دیا کرتا تھا لیکن آج وہ صبح سے مختلف قسم کے حشرات الارض پکڑ کر انہیں اپنے طلسم خانے میں ایک سیال مادے کی شکل میں تبدیل کرنے میں لگا رہا تھا۔ سمورال کی طرح گورے کا ایک کمرہ طلسمی کاموں کے لئے وقف تھا۔ گورے مجھے درختوں سے ڈھکے ہوئے جنگل کے ایسے حصے میں لے گیا جہاں دن کے وقت بھی سورج کی روشنی مشکل سے آتی تھی۔ اس نے وہاں کی نرم زمین سے کچھ مٹی کریدی اور اسے اپنے ہاتھوں اور پیروں پر مل لیا، اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کی تقلید کروں، میں نے کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ ہم دونوں ایک درخت کے سہارے اکڑوں بیٹھ گئے۔ درختوں میں پتھر کی چند مورتیاں نصب تھیں۔ گورے نے زور زور سے ایک عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ میرے لیے اگلے لمحے تجسس کے تھے میں بھی گورے کے الفاظ بمشکل دہرانے لگا۔ اس نے سیال مادہ پیالے سے نکال کر مشعل سے جلانا شروع کر دیا۔ مادے کی بو اتنی شدید اور اتنی گندی تھی کہ میرا دماغ پھٹنے لگا پھر اطراف میں ایک ایسی ہوا سرسرا نے لگی جس میں کسی ذی ہوش کا سانس لینا مشکل تھا۔ گورے پر وحشت سی طاری تھی۔ وہ زور زور سے اپنا عمل پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں جنگل جیسے جاگ سا گیا چرند و پرند کے خوفناک شور کے باعث مجھے اپنے قریب بیٹھے ہوئے گورے کی آواز بھی صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں اس کے اور قریب ہو گیا۔ سیاہ مادہ جل رہا تھا

اور اس کی بونے شاید سارا جنگل اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ گورے نے میرے ہاتھ میں مشعل تھما دی اور اپنا ایک ہاتھ مادہ جلانے میں مصروف رکھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنے گلے میں پڑی ہوئی لمبی ہڈیوں کی ایک مالا اتاری اور اس کی نوکوں سے زمین کریدنے لگا، ہڈیوں کی نوک کا زمین پر لگنا تھا کہ بہت سی کریناک چھینیں ایک ساتھ بلند ہوئیں اور آنا فانا بونے قد کے دو بہت عجیب الخلق جانور ہم سے کچھ فاصلے پر نمودار ہوئے۔ میں مشعل کی محدود روشنی میں ان کی ساخت کا فوراً اندازہ نہیں کر سکا۔ میں نے تاریک براعظم کے کسی علاقے میں اسے پہلے ایسے جانور نہیں دیکھے تھے۔ ان کا چہرہ کسی انسان سے مشابہہ تھا لیکن ان کے پیر جانوروں کی طرح تھے۔ یوں کہیے کہ وہ ایک نئی ساخت کے لنگور تھے۔ ان کے جسم میں ایک روشنی تھی۔ ایسی روشنی جس سے کرینیں پھوٹتی ہوں۔ وہ ان کی دو آنکھوں بلکہ چار آنکھوں میں تھی۔ وہ آتے ہی زمین پر لوٹنے لگے۔

وہ ناقابل برداشت تعفن، ان کی چھینیں اور ان کی آنکھوں کی مقناطیسی چمک دیکھ کر میرے لب ٹھہر گئے۔ میری اس کوتاہی کی دیر تھی کہ ان میں سے ایک جانور تیزی کے ساتھ مجھ پر چھپنا اور میرا چہرہ ایک ہی جست میں لہو لہان کر گیا۔ میں اکڑوں بیٹھا تھا اور مشعل میرے ہاتھ میں تھی اس لیے میں توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ گورے نے غصے میں میرے ہاتھ سے مشعل چھین لی۔ میں نے دوبارہ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اُسے جھٹکنا چاہا لیکن میرا قیاس غلط نکلا۔ وہ پھرتی میں کسی چپتے سے کم نہیں تھا۔ دوسری جست میں وہ میرے سر کے بہت سے بال اڑالے گیا۔ گورے نے بے بس نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن اپنا عمل نہیں چھوڑا۔

دوسرا جانور ابھی زمین پر لوٹ رہا اور چیخ رہا تھا مجھ پر یہ تو انا جانور پے در پے حملے کر رہا تھا، اس نے میرے سینے پر حملہ کر کے میرے تحائف نوچنے کی بھی کوشش کی۔ اس عرصے میں گورے ایک آخری دردناک چیخ کے ساتھ دوسرے جانور کا کام تمام کر چکا تھا پھر وہ میری طرف مڑا اور اس نے اپنا عمل تیز کر دیا، گورے کے میری طرف متوجہ ہوتے ہی جانور مجھ سے علیحدہ ہو گیا۔ میرے جسم کے مختلف حصوں پر اس کے پنجوں کے نشانات سے خون بہہ رہا تھا، مجھے سنبھلنے کا ایک ذرا سا موقع مل گیا اور میں شدید غضب کے عالم میں آندھی کی طرح اس کی جانب چھپنا۔ گورے نے حلق سے چیخ مار کر مجھے روکنا چاہا لیکن میں نے کوئی دھیان نہیں دیا، میں اس وقت گورے سے بھی اُلجھ سکتا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ اس کے گرد پھیلا کر میں نے زمین پر خود کو اس طرح گرایا کہ اس کا جسم میرے جسم سے چھپ گیا پھر اپنے تحائف پشت کی طرف ڈال کر میں نے اُسے کوئی پہلو بدلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ چمرا کر رہ گیا اور میں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر پوری قوت سے کھینچ دیں۔ اس کی بھیانک چیخ سے سارا جنگل لرز اٹھا اور ایک ساتھ بہت سی آوازیں جنگل میں گونجنے لگیں۔ جیسے جنگل میں کوئی رن پڑ گیا ہو۔ گورے نے ان دونوں جانوروں کو اٹھا کر یکے بعد دیگرے نہایت سفاکی سے ان کی آنکھیں نکال لیں اور ان کا مغز چیر کر کچھ خود کھایا، کچھ مجھے کھلایا۔ مشعل کبھی میرے ہاتھ میں آ جاتی تھی کبھی اس کے ہاتھ میں۔ سیال مادہ جل چکا تھا اور تعفن میں کمی آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ چاقو کی طرح جانوروں کے جسم چیر رہے تھے پھر اس نے وہ آنکھیں میرے حوالے کر کے ان دونوں کے جسم تو ان کی ہڈیوں کی مدد سے کھودی ہوئی زمین میں دبا دیے اور میرا ہاتھ پکڑ کر غیر معمولی رفتار سے جنگل میں بھاگنے لگا۔ اندھیری رات میں جنگل میں چلنا اور بھاگنا گورے کے لئے کوئی نیا کام معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میری بھی آنکھیں سامنے کی رکاوٹیں صاف دیکھ رہی تھیں اور میرے قدم ان سے بچتے ہوئے چل رہے تھے۔ ہمارے پیچھے جانوروں کا ایک شور برپا تھا۔ گورے جنگل سے بے تحاشا نکل کر سیدھا ساحل کی طرف آیا اور اس

نے میرے ہاتھوں سے چاروں آنکھیں لے کر انہیں ٹٹولا۔ ان مردہ آنکھوں میں ابھی تک روشنی تھی۔ دو آنکھیں اپنے پاس رکھ کر وہ اس نے سمندر میں پھینک دیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور ایک چٹان کے سہارے بیٹھ گیا۔

سرد ہوا اس کے جسم کو لگی تو اس نے آنکھیں موند لیں۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک اس کی یہی حالت رہی پھر وہ اٹھا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تیسری بار بھی گورمے نے انہیں سر کیا ہے۔“

میں خاموش رہا۔ وہ خود بخود بولا۔ ”میں نے اپنے جزیرے کے پانیوں میں نگرانی کے لئے مقدس ہریکا کی آنکھیں چھوڑ دی ہیں ابھی ہمیں وقت کی ضرورت ہے کیونکہ ابھی ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔ میں ایسی آنکھیں دُور دُور تک سمندر میں پھیلا دوں گا۔ ہریکا کو دیوتاؤں کی سعادت حاصل ہے۔ اسے قابو میں کرنے کے لئے پتھر کے ہاتھ درکار ہوتے ہیں۔“

”معزز گورمے، کیا تم وضاحت نہیں کرو گے؟“

”تم میرے ایک لائق شاگرد ہو۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ”جارا کا کی مقدس روح تم پر نگاہ رکھے۔ تم آج اس کے عتاب سے بچ گئے اب تک میرے دواڑھائی سوسا تھی مجھے مایوس کر چکے ہیں۔ صرف دو آدمیوں نے حوصلہ برقرار رکھا۔ ہریکا میں دیوتاؤں کی قوت ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں اپنی پشت پر بھی دیکھ لیتی ہیں۔ ہریکا کا پتہ لگانا بھی آسان کام نہیں ہے۔ میں ہمیشہ ان کی جستجو میں رہتا ہوں۔ اس بار انہیں قابو میں کرنے کے لئے میں نے تمہیں منتخب کیا تھا۔ تم نے حوصلہ ہار کر بھی حوصلہ برقرار رکھا۔ تم نے ایسی طاقت کا مظاہرہ کیا ہے کہ انگریزوں میں کوئی شخص آج تک یہ جرات نہیں کر سکا پہلے کچھ نہ بتانے کی یہی وجہ تھی کہ کہیں تم ہریکا سے خوف زدہ نہ ہو جاؤ۔ گورمے کے سوا چند ہی برگزیدہ لوگ یہ عمل انجام دے سکتے ہیں۔“

”مگر یہ آنکھیں اور اس کا مغز؟“

”یہ آنکھیں۔“ اس نے انہیں چومتے ہوئے کہا۔ ”یہ آنکھیں انگریزوں کے قریب آنے والوں کو دور سے تاک لیتی ہیں۔ میں نے ان جوڑوں میں سے ایک سمندر کے سپرد کر دی ہے۔ ایک ایک میرے طلسم کدے کی زینت بنے گی اور جب سمندر میں کوئی خطرہ ہوگا کوئی ہماری طرف آ رہا ہوگا تو یہ روشن ہو جائے گی اور اس کے عد سے میں ہم اپنے دشمنوں، دوستوں کو پہچان لیں گے۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور وہ مغز جو تم نے ابھی کھایا ہے، وہ طاقتوں کا ایک خزانہ ہے تم جلد ہی محسوس کرو گے کہ تم نے کیسی بلندی حاصل کر لی ہے۔“

گورمے ان آنکھوں سے بچوں کی طرح کھیل رہا تھا۔ وہ اس وقت بہت خوش تھا جیسے قارون کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ اس نے بستی میں جانے سے پہلے دو مجسموں کو بیدار کیا۔ دو حسین لڑکیاں ہمارے ساتھ ہو گئیں۔ گورمے و فوراً مسرت سے کھلا جا رہا تھا۔ آگے جا کر وہ مجھ سے علیحدہ ہو گیا اور میں ایک درخت کے نیچے اپنی ساتھی کے ساتھ دراز ہو گیا۔ صبح ہوئی تو وہ لڑکی غائب تھی اور میرے گرد ایک جھوم جمع تھا۔ میں نے ان کی آہٹیں سن کر حیرت زندگی سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ خوشی سے ناپنے لگے۔ انہوں نے میرے پیر مضبوطی سے پکڑ کر مجھے اپنے ہاتھوں پر کھڑا کر لیا۔ میں سب سے بلند ہو گیا۔ ان کا رخ جلسہ گاہ کی طرف تھا۔ گورمے بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ دو آنکھیں تھیں۔ بستی کے لوگ ہمارا جسم چوم رہے تھے۔ گرونا میرے اور گورمے کے بارے میں رطب اللسان تھا۔

اس واقعے کے بعد انگریزوں میں میری عزت بڑھ گئی۔ میرا شمار عبادت گاہ کے صفِ اوّل کے لوگوں میں ہونے لگا۔ گورے نے اسی پر بس نہیں کیا۔ اس نے مجھے پتھر میں تبدیل کرنے اور اسے اپنی اصل حالت میں واپس لانے کا عمل بھی سکھادیا۔ گو وہ عمل سکھنے میں مجھے خاصے دن لگ گئے لیکن اب میرا یہ مشغلہ ہو گیا تھا کہ میں جب بھی یکسانی سے اکٹاتا، پتھروں کو زندہ کرتا، ان سے گفتگو کرتا اور انہیں دوبارہ ان کی اصلی حالت میں واپس کر دیتا، پتھروں میں جو لوگ محفوظ تھے ان میں سے بعض علم و فضل میں یکتا تھے لیکن بد قسمتی سے مشروبِ حیات کی نعمت سے محروم رہ جانے کے سبب وہ لوگ برگزیدہ لوگوں میں شامل نہیں ہو سکے تھے۔ ان میں سے بیشتر لوگ وہ تھے جو انگریزوں میں اقبال کے خلاف تحریکِ کودل سے قبول کر چکے تھے۔ میں اُسے نہیں بھولا تھا لیکن میں اب اس کے خلاف اٹھنے والی آوازوں پر برگشتہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ سال میں ایک بار جارا کا کا کے مقدس دن پر وہ تمام مجسموں کو جگا دیتے تھے۔ اس دن ان کے ہاں جشنِ لوریمیا کی طرح ایک بڑا جشن منعقد ہوتا تھا۔ جس کے خاتمے کے بعد وہ پھر اپنی جگہ چلے جاتے تھے اور مجسموں میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ میری طاقتیں، اسرارِ سمجھنے کی صلاحیتیں اتنی بڑھیں کہ اشاروں میں گروٹا یا گورے، نیشا اور دوسرے لوگوں کو اپنے احساسات منتقل کر سکتا تھا۔ میں مشکل سے مشکل کام کے لئے تیار ہو جاتا تھا، ان کی تفصیل بتانے سے میں گریز کر رہا ہوں۔

دو سال کے صبح و شام گزر گئے۔ دو سال میں انہوں نے مجھے جوان رکھا، پہلے سے زیادہ تروتازہ، شاداب، میرا رنگ نکھر گیا تھا اور میں ان سب میں ممتاز نظر آتا تھا۔ گورے اپنے ساتھیوں کے زور و مجھے پیش کرتا۔ نیشا گورے کے مقابلے میں اب مجھ سے زیادہ قریب تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ نیشا کے لئے جزیرے کے دوسرے سربراہ اور وہ لوگوں نے درخواست کی۔ میرا جی چاہا کہ انہیں منع کر دوں لیکن اس طرح انگریزوں کی پرسکون فضا میں ہلچل پیدا ہو جاتی۔ میں نے دل پر جبر کر کے نیشا کو ان کی خواہش کے مطابق ان کے پاس بھیج دیا۔ دو سال گزر گئے تھے۔ ان کی جزیرے اور جادوؤں میں یہ کمال تھا کہ آدمی ناقابلِ یقین حد تک طویل عمر پاتا تھا اور اس کی جوانی برسوں قائم رہتی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دم گھٹتا تھا کہ جب میں عمر کے انحطاط کے دور میں داخل ہوں گا تو وہ مجھے بھی ایک مجسمے کی صورت میں بدل دیں گے اور پھر یہ ان کی مرضی پر منحصر ہوگا کہ وہ مجھے کب جگا لیں۔ اور پھر یہاں تک ہوا کہ مجھے گورے کے طلسم خانے میں اجازت کے بغیر اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ میں وہاں بیٹھا مختلف چیزوں سے شعبدے کرتا رہتا۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ مجھے جزیرہ تو ری کا حال بھی جاننا چاہیے۔ سرنگا، سرتیا کیسے ہیں؟ لیکن پھر مجھے یہ خیال دماغ سے جھٹکنا پڑا کیونکہ اب میرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔ میں انہیں دیکھ کر اذیت میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ گورے کے پاس ہریکا کی آٹھ آنکھیں تھیں جو اس نے پتھر کے ایک صندوق میں اس طرح محفوظ کر دی تھیں کہ باہر سے صرف ان کے عدسے نظر آتے تھے۔

میں نے انگریزوں میں اپنے پُر اسرار واقعات کا ذکر اختصار سے کیا ہے، ورنہ میری طاقتیں ابھرنے کے مراحل کی روداد خاصی طویل ہے اور غلطی اعمال اور نفرت انگیز شب و روز پر مشتمل ہے، گورے بظاہر بڑا علیم الطبع اور شریف النفس نظر آتا تھا مگر جب وہ اندھیری راتوں اور ویران علاقوں میں بیٹھ کر جادوئی کاموں میں مصروف ہوتا تھا تو اس کی آنکھوں میں شیطنیتِ رقص کرنے لگتی تھی۔ وہ اتنا گھبراہٹ اور کرب سے بھرا ہوتا تھا کہ میرے دل کے کئی گوشوں میں اس کے لئے نفرت بیٹھ گئی تھی اس کی مسلسل صحبت اور رفاقت سے استفادے کا خیال نہ ہوتا تو میں کبھی کا اسے چھوڑ کر انگریزوں کے دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتا۔ گورے کو مجھ پر اعتماد تھا۔ میں اس کے لئے ایک بے ضرر شخص تھا گورے کے بغیر بلند مرتبہ لوگوں میں تنہا میری ذات کوئی

حیثیت نہیں رکھتی تھی، نیشا نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں گورمے سے روحوں کو اپنے احکام کا تابع بنانے کا عمل ضرور سیکھوں، گورمے نے مجھ سے اس کا ذکر کبھی نہیں کیا تھا۔ ایک دن وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر دبے لفظوں میں اپنی خواہش کا اظہار کر دیا مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میری خواہش سن کر بے تحاشا ہنسنے لگے گا۔ اس پر ہنسی کا طوفانی دورہ پڑ گیا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟“

”نہیں نہیں۔ نیشا نے تم سے اس کا تذکرہ کیا ہوگا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”جابر بن یوسف تم ہر معاملے میں ایک مستعد اور حوصلہ مند شخص ثابت ہوئے ہو لیکن جس خواہش کا تم اظہار کر رہے ہو، وہ تمہارے لیے فی الحال موزوں نہیں ہے۔“

”کیوں؟ کیا میں نے تمہیں کبھی مایوس کیا ہے۔“

”نہیں۔ مگر روحوں کا معاملہ دوسرا ہے ایک نہیں، لاتعداد روحوں ہیں، جنہیں دیکھ کر تم اوسان کھو بیٹھو گے، روحوں کے غار میں تم تنہا ایک لمحے بھی نہیں ٹک سکتے۔ وہ ہر نئے آدمی کے لئے قہر ہیں، گورمے کے علاوہ انگریزوں کے چند ہی آدمیوں نے انہیں قابو میں کیا ہے۔ نہ جانے، وہ آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”نہ جانے کب وہ آسمانوں کی طرف جاتی ہیں۔“

”میں سمجھتا ہوں یہ ایک شجاع شخص کی توہین ہے۔“ میں نے ناراض ہو کر کہا۔ ”اگر تم میرا حوصلہ آزمانا چاہتے ہو تو چلو، مجھے وہاں لے چلو۔“

میرے اصرار کے باوجود گورمے راضی نہیں ہوا۔ میرا تجسس اس قدر بڑھا کہ میں نے اور تن دینی سے گورمے کو اعتماد میں لینے کی کوششیں شروع کر دیں، آخر کئی دنوں بعد میرے پیہم اصرار پر گورمے کسی قدر آمادہ ہوتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اس کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ آخر میری خدمتوں کا اثر ہوا۔ گورمے نے بددلی کے ساتھ ایک رات مجھے بستر سے اٹھایا اور انگریزوں کے ایک ایسے مقام پر لے گیا جو ابھی تک میری نظروں سے دور رہا تھا۔ میں کا ہو کی روح سے پہلے ہی شناسائی پیدا کر چکا تھا۔ کا ہو کوئی موقعوں پر میرے کام بھی آیا تھا، مجھے اس بات کا گمان تک نہیں تھا کہ وہ جگہ، وہ غار اس قدر ہیبت ناک ہوگا کہ مجھ جیسے تو ناشخص کے اعصاب بھی جواب دے جائیں گے۔ گورمے نے ایک جگہ پہنچ کر اپنی چھڑی ایک چٹان پر ٹکا دی، چھڑی پر کوئی شبیہ بنی ہوئی تھی، اس وقت گورمے بہت خاموش تھا۔ کوئی تصور نہیں کہ وہ دیو قامت چٹان پر اپنی جگہ سے ہٹ جائے گی، اندر گہرا اندھیرا طاری تھا۔ گورمے نے سوراخ پر کوئی سحر پڑھ کر پھونکا۔ پھر اس نے اپنے گلے سے جارا کا کا کی کھوپڑی اتار کر غار کے راستے میں رکھ دی۔ اس نے میری کلائی پکڑی اور ہم جارا کا کا کی کھوپڑی سے اپنے قدم بچاتے ہوئے تاریک غار میں داخل ہو گئے۔

غار میں داخل ہوتے ہی میری ناک میں سیلن کا ایک ناخوش گوار جھونکا آیا۔ میرا دل بے قابو ہونے لگا ہم اس مکدر کردینے والی فضا اور جس زدہ راستے میں آگے چلے۔ آگے بڑھنا، چلنا میرے لیے دشوار ہو گیا۔ مجھے متلی سی ہونے لگی، گورمے کا ہاتھ میری کلائی پر تھا۔ میں پچھتاتے لگا کہ میں نے یہاں آ کر زبردست غلطی کی ہے، ہم راستہ ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، میں گورمے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ صرف اس کی سانسیں سن رہا تھا۔ میں نے بمشکل تمام اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ مجھے کھانسی اٹھنے لگی۔ گورمے نے اپنی رفتار تیز کر دی، خاصی دور اندر جا کر گورمے کے کسی عمل سے ایک اور دروازہ کھلا اور ہلکی سی روشنی میں پتھروں کے بنے ہوئے شکستہ کھنڈر نظر آئے۔ کھنڈروں کے چاروں طرف سفید دھوئیں کے مرغولے تیر رہے تھے، گورمے دروازے کے قریب ٹھہر گیا اور اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میری حالت ناگفتہ بہ تھی، یہ جہنم کا کوئی منظر

تھا۔ یہاں کے درود یوار سے وحشت برستی تھی، گورے نے ایک کنکری اٹھا کر پھینک دی اور پھر یہ اس کے کسی جادوئی عمل کا اثر تھا کہ مجھے آنا فنا وہاں تنگ دھڑنگ سیاہ فام انسانوں کے بے شمار چہرے نظر آئے ان کے جسم مضطرب تھے۔ وہ سب سراسیمہ نظروں سے گورے کو دیکھ کر اس کے سامنے جھک گئے لیکن جب انہوں نے میری طرف نگاہ کی تو ان کی آنکھوں میں خوں خواری کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ گورے یہ کیفیت بھانپ گیا تھا۔ میرا سانس اکھڑ رہا تھا اور مجھ پر زندگی میں پہلی بار ایسی دہشت طاری ہوئی تھی کہ مجھے خود اپنے آپ پر یقین نہیں آ رہا تھا اور میرے سامنے وہ محروم و مجبور روئیں تھیں جو اپنے جسموں کی قید سے آزاد ہو کر بھی بے بس تھیں، کیا کوئی اس پر یقین کر سکتا تھا؟ روئیں جسم کا وہ لطف جو ہر جس کے لئے مہذب دنیا کے فاضل محققین ایک عرصے سے تحقیق کر رہے ہیں، وہ مردہ لوگ اپنے مان کے گمان کے ساتھ ہمارے سامنے، ہماری آنکھوں کے سامنے حاضر تھے، یہ ایک الم ناک اور وحشت ناک مظاہرہ تھا۔ ان میں طرح طرح کے لوگ تھے۔ بہت قدیم زمانے کے بھی اور تاریک براعظم کے موجودہ عہد کے بھی، انہوں نے شاید میری موجودگی پسند نہیں کی تھی، وہ خرخرہٹ، غرغراہٹ، وہ چیخیں جو ان کے حلق سے خارج ہو رہی تھیں، مجھے لرزہ بر اندام کیے دے رہی تھیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب لوگ کسی بھی لمحے مجھ پر حملہ کر دیں گے۔ میں نے اپنی ساری توانائیاں خود کو سنبھالنے میں صرف کر دیں، لیکن جب میں ان کے چہرے ان کی آنکھیں دیکھتا تو مجھ پر عرشہ ساطاری ہو جاتا۔ گورے میری کیفیت سے بے خبر سا تھا، وہ اطمینان سے نہیں مخاطب کر رہا تھا۔ ”اے شریف روح! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری ایک سوئی میں نخل ہوا۔ تمہارے لیے زمان و مکان کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ دیوتاؤں کو راضی کرو کہ وہ تمہاری قید و بند کا یہ اذیت ناک سلسلہ ختم کر دیں، تم آسمانوں میں چلی جاؤ اور ہمیں کامرانی سے سرفراز کرو۔“

”یہ روئیں، جابر بن یوسف!“ گورے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”یہ شریف روئیں ہماری رفیق ہیں، انہیں ہم نے تربیت دی ہے اور ہمارے کئی برگزیدہ لوگ انہیں یہاں روکنے کی کوششوں کے دوران ہم سے جدا ہو گئے ہیں، وہ بھی یہیں ہیں، انہیں روحوں کے درمیان یہ سب ہمارے کام آئیں گی۔ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جابر بن یوسف اگر تم ہماری خواہش پر عمل نہ کرتے تو ہم تمہیں بھی اس مجلس میں قید کر دیتے۔“ اس کے آخری جملے سے میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ ہمارے علاقے کے کئی بزرگ آبادی سے روپوش ہو کر الگ تھلگ چٹانوں میں بیٹھ کر جارا کا کا کی خوشنودی میں منہمک ہیں، انہوں نے دنیا ترک کر دی ہے، ان کا مقصد صرف ایک ہے۔ اقبال کا زوال۔ مگر۔ مگر تم تو کانپ رہے ہو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔“

”گورے“ میں نے وحشت سے کہا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا میں نے اپنا خوف تسلیم کر لیا۔ ”گورے اس وقت مجھے یہاں سے لے چلو، یہاں موت نظر آتی ہے، شاید روحوں کے متعلق میرے ماضی کے خوف مجھ پر غالب ہیں، میں خود کو اس ماحول سے مانوس محسوس نہیں کر رہا ہوں۔“

”کیا۔ کیا تم خوف زدہ ہو جا رہے؟“ گورے نے محبت سے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”لیکن میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

”اوہ یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے، میں تم سے نہ کہتا تھا کہ تم وقت سے پہلے اصرار کر رہے ہو؟ بہر حال اب تمہیں خود کو ان کی صحبت کا عادی بنانا ہوگا اور انہیں اپنی خواہش کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا۔“ گورے حکیمہ انداز میں بولا۔ ”جابر بن یوسف جیسے شخص سے میں اس

بزدلی اور دُورں ہمتی کی توقع نہیں رکھتا۔“

”گورے، میرا سانس گھٹ رہا ہے، وہ دیکھو، وہ میری طرف بڑھ رہے ہیں، ان کی آنکھوں میں میرے لیے تمسخر ہے، ہاں واقعی میں وقت سے پہلے آگیا ہوں، دیوتاؤں کے لئے مجھ یہاں سے نکالو۔“ میں نے اس کی منت کی۔ ”گورے مجھے یہاں سے لے چلو۔“

”نہیں۔“ گورے سختی سے بولا۔ ”نہیں تم مجھے مایوس کر رہے ہو، میں تمہیں ان کے پاس چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“ گورے کے لہجے میں جھنجھلاہٹ اور خفگی تھی۔

”معزز گورے، مجھے زیادہ باتیں کرنے میں دشواری ہو رہی ہے میں تم سے رحم کا طالب ہوں۔“

”نہیں۔“ گورے دروازے کی طرف مڑا اور چشم زدن میں اس کے پار ہو گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے بھاگنا چاہا مگر مجھے دروازہ بند ملا۔ میں نے اس سے سہارا لیا اور اپنی زائل ہوتی ہوئی توانائی صرف کر دی۔ اس وقت میری حالت یہ تھی کہ خون جسم میں کہیں ٹھہر گیا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ میرے اور قریب آگئے تھے، ان کے بے ہنگم قبضے میرے دل میں نشتر بن کر چھ رہے تھے میں دروازے سے چپک گیا۔ وہ مردہ لوگ مجھ سے ایک فاصلے پر آ کر ٹھہر گئے۔ اب تک میں نے صرف کاہو کی نرم دل روح کو دیکھا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کے چہرے اتنے غضب ناک اور ان کے قبضے اتنے عذاب ناک ہوتے ہیں، وہ بے نور آنکھیں چمک رہی تھیں، وہ بے نور چہرے میرا مذاق اڑا رہے تھے، میں مرے ہوئے لوگوں کے اس اثر دہام میں تنہا کھڑا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ میں جابر بن یوسف ہوں، میں اس وقت ایک بچہ تھا جو ایک خوفناک خواب دیکھ رہا ہو، گورے شاید اپنی سحر کا روتوں سے میرے اعصاب شل کر گیا تھا۔ میں سہا ہوا دیوار کے سہارے کھڑا رہا اور ان کے سفید دانتوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہ اضطرابیہ ہیجان میں اپنی زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ خوف اور دہشت سے خود بخود میرے ہاتھ اپنے گلے پر دوڑنے لگے۔ پھر یکا یک مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں تنہا نہیں ہوں، بلکہ باگمان کے کاہن کا عطا کردہ اثر دہام میرے پاس ہے، شپالی ہے، سورمال کی مالا ہے اس غیر اختیاری حرکت سے میرے جسم میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس جس خانے میں سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

مجھے اس ہیجان و اضطراب میں اپنے تحائف آزمانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا، اب انہیں چھونے کے بعد مجھے اپنے وجود کا احساس ہو رہا تھا، مجھے خود پر شرم آنے لگی۔ ڈمگی کے سینگ میرے سینے میں چبھنے لگے۔ میں نے بیک وقت وہ تمام تحائف رگڑے اور ان سے مدد لینے کے مختلف عمل پڑھنے شروع کر دیے۔ میں نے شپالی گلے سے اُتار کر ایک پھر کی طرح گھمائی، شپالی سے ایک تیز قسم کی شعاع نکلی، وہ بے قرار، در ماندہ روحوں، کچھ پیچھے ہٹ گئیں۔ ان کی مراجعت سے مجھے اپنے جسم میں دوبارہ جان آتی محسوس ہوتی ہیں۔ میں نے شپالی مختلف زاویوں سے رکھی اور اسٹالا کی ہدایتوں کے مطابق اسے ان کی طرف اُچھال کر انہیں اور پیچھے اور پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ روحوں میرے سامنے روتی اور بین کرتی ہوئی سننے لگیں۔ رفتہ رفتہ مجھے وہاں دھواں نظر آنے لگا۔ کثیف، سفید رنگ کا دھواں، مرغولے اور کھنڈر۔ ایک وحشت، میں نے انہیں دُور تو کر دیا تھا لیکن اب غار سے باہر نکلنا کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا۔ غار سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ پتھر کی وہ دیوار اتنی سخت تھی کہ میں اسے ایک انچ بھی جنبش نہ دے سکا۔ روحوں کے غائب ہو جانے کے بعد میں نے چند لمحے توقف کیا اور آنکھیں موند لیں، ان چند لمحوں میں میرے ذہن نے تیز رفتاری سے سوچنا

شرع کر دیا تھا پھر میری آنکھیں کھل گئیں، میرے ہاتھ سمورال کی مالا پر تھے، اڑدے کا چوٹی ڈھانچا اپنی اصل شکل میں واپس آ گیا تھا۔ اپنی تمام چیزیں زندہ، روشن اور متحرک دیکھ کر میرے اندر غرور کا جذبہ ابھرا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ہریکا کا مغز بھی کھایا ہے میں نے لوکا سا جیسے دیو کو شکست دی ہے، میرے بازو لوہے کے ہیں، اور میرا دل پتھر کا ہے، یہ جارا کا کا کی کھوپڑی برکتوں اور طاقوں کی امین ہے، میرے تو انا ہاتھوں کے سامنے یہ پتھر کیا ہے؟ یہ تو ایک پتھر ہے، گورے بھی ابھی اسی سے گزر کر گیا ہے۔ میں نے اپنے تمام تحائف دیوار سے مس کیے اور ڈنگی کے سینگوں سے پتھر پر ضرب لگائی۔ پتھر کی دیوار ہلکی سی ضرب سے کھسکنے لگی۔ میں نے اڑدہ اس کے اوپر چھوڑ دیا۔ اڑدے کا دیوار پر ریگنا تھا کہ دیوار شق ہو گئی اور غار کا بیرونی راستہ صاف نظر آنے لگا۔ بجلی کے طرح میں نے غار کے دہانے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ راستہ تنگ اور تاریک ہے لیکن میں لڑھکتا اور سنبھلتا ہوا آخر دہانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پتھر کا وہ بڑا تودہ ہٹانے میں بھی میں نے اپنے ان تمام تحائف سے مدد لی اور فالتانہ انداز سے باہر آ گیا۔

جب میں باہر نکلا تو غار کا پتھر اپنی جگہ ٹک گیا اور میں نے دیکھا کہ گورے وہاں کھڑا ہوا ہے۔

☆=====☆=====☆

دجال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے در آمد ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حق کا شاندار اندازِ بیاں۔ شیطان کے پجاریوں اور پیروکاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیٹ (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پہ اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مکروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجال..... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ **دجالیت** کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجال کس طرح اس دنیا کے تمام انسانوں پر حکمرانی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال ناول کے تینوں حصے کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

میری ندامت کے باوجود گورے نے دوبارہ میری پست ہمتی کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ایک ایسا چرکا تھا کہ اب میں کسی اقدام کے بارے میں کوئی پہل کرتے ہوئے ڈرنے لگا۔ جہاں گورے چاہتا، مجھے لے جاتا۔ اصولاً اس پر ہیبت غار میں بیٹھ کر مجھے روحنِ تابع کرنے کا عمل سیکھنا چاہیے تھا لیکن میں نے پھر کبھی گورے سے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ جزیرہ انگرہ میں، جہاں تک میری شہرت اور شجاعت کا تعلق تھا، لوگ میرا نام عزت و احترام سے لیتے تھے، لیکن اس واقعے کے بعد میرا دل کچھ اُداس سا ہو گیا تھا۔ میں گورے کو چھوڑ کر اکثر ساحل کا رخ کرتا مگر سمندر کی لہریں مجھے اور بے چین کر دیتیں، نیشا اور تازہ دم دو شیزاؤں نے میری اُداسی دُور کرنے میں اپنے بدنوں کو عجب عجب لوچ دیے، وہ سمندر تک آ جاتیں اور لب ساحل پر شور لہروں کی موسیقی میں ان کے بدن لہروں کی طرح بل کھاتے، میں کبھی ان کے ساتھ دُور تک نکل جاتا کبھی ہم یوں ہی اُداس بیٹھے لہریں گنتے رہتے، پھر گورے نے مجھے مصروف رکھنا شروع کر دیا۔

اڑھائی سال کی طویل مدت کے بعد ایک روز میں گھنے جنگل میں بیٹھا ہر بیکا کو تلاش کر رہا تھا کہ مجھے اپنے قریب سرسراہٹ سی محسوس ہوئی میں نے پلٹ کر ادھر ادھر دیکھا تو مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ میں اپنے کام میں دوبارہ مشغول ہو گیا۔ سرسراہٹ اور قریب محسوس ہوئی۔ گورے دوسرے جنگل میں مجھ سے کچھ دُور موجود تھا۔ میں ہکا بکا اپنے ارد گرد آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میرے قدم جہاں تھے وہیں ٹھہر گئے مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ سرنگ کی عظیم اور پُراسرار دیوی میرے سامنے اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود تھی، کیا یہ کوئی فریب ہے؟ میں نے اپنا سر جھٹک کر دوبارہ اسے دیکھا، وہ وہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تم؟“ اس نے جواب دینے کی بجائے شمال کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اپنا کام چھوڑ کر تیزی سے اسی سمت رخ کیا۔ دیوی میرے آگے آگے تھی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مجھ پر شادی پر مرگ کے جذبات کا غلبہ تھا پاؤں زمین پر رکھتا کہیں تھا پڑتے کہیں تھے۔ گویا میری نجات کا دن آ گیا تھا۔ سرنگ نے اُسے مجھے آزاد کرانے کے لئے بھیج دیا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ مجھے کہاں سے لے جا رہی ہے، میں کس طرف جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں گورے کے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ دیوی ایک شان کے ساتھ مکان میں داخل ہو گئی۔ میں بھی فوراً گورے کے طلسم کدے میں داخل ہو گیا اور میں نے اُنھیں آنکھوں والا پتھر اپنے قبضے میں کر لیا اور میں نے اس روشن آگ میں جو طلسم کدے میں ہمیشہ جلتی رہتی تھی، گورے کے تمام طلسمی اسلحہ ڈالنے شروع کر دیئے۔ ذرا سی دیر میں وہ پورا طلسم خانہ جہنم کی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ مختلف قسم کے جانوروں کی چیخوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ پھر میں اس تپش سے جلد از جلد باہر نکل آیا۔ مکان کے باہر آ کر میں نے دیکھا کہ گورے بستی کے باہر تمام سربراہان و دروہ لوگوں کے ساتھ کسی پُراسرار عمل میں مصروف ہے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں سے خون اُبلنے لگا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ٹانگیں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتیں، میرا یہ اذیت دہ اور ہولناک احساس حقیقت پر مبنی تھا کیونکہ میرا نچلا دھڑ پتھر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے بے بسی سے دیوی کی طرف دیکھا۔ دیوی جو شاید صرف مجھے نظر آ رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

تو کیا میں پتھر میں تبدیل ہو جاؤں گا؟

جزیرہ انگروما کے سربراہ آسائی عبادت میں مصروف تھے۔

تیزی کے ساتھ ان کے نجوم میں اضافہ ہوتا گیا۔ پہلی صف، پھر دوسری اور بے شمار صفیں اور ان صفتوں کے پیچھے چاروں طرف سے دیوانہ وار چیخیں مارتے ہوئے لوگ بے ہنگم رقص کرتے ہوئے اکٹھے ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زمین سیاہ فام ننگ دھڑنگ آدمی ابل رہی ہو، اتنی جلدی یہ لوگ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے جیسے سیلاب بڑھتا ہے اور جنگل میں آگ لگتی ہے۔ ان کی وحشت ناک چیخوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مگر ایسے بھیانک شور میں ایک تیز سُرِ بلی آواز ابھری اور ان کی آوازوں پر چھا گئی۔ ان کی دیوانگی میں اور شدت پیدا ہو گئی اور وہ تن دہی سے اپنی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ ان سب کے چہرے میری طرف تھے اور ان کے عریاں جسموں کا ہر حصہ متحرک تھا۔ میری پشت پر گورے کے طلسم خانے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کا دھواں اتنی دُور تک پھیل گیا تھا کہ جزیرہ انگروما پر سیاہ بادل چھائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ گورے کا یہ طلسم خانہ اس کی برسوں کی ریاضت کا ثمر تھا۔ میں نے ایک ہی حملے میں اس کے سارے طلسمی ہتھیار جلا کر گورے کو نہت کر دیا تھا۔ مقدس ہریکا کی پُراسرار آنکھیں میرے پاس تھیں، اب وہ سمندروں میں انگروما کی طرف بڑھنے والے دوست اور دشمنوں کو دیکھنے سے قاصر تھا۔..... جزیرہ انگروما میں چار بار مقدس ہریکا کو زیر کر کے اس کی آنکھیں حاصل کی گئی تھیں جن میں سے آٹھ آنکھیں سمندر میں پھیلا دی گئی تھیں اور آٹھ آنکھوں پر میں نے قبضہ کر لیا تھا۔

میں کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا صرف چند لمحوں میں وہ مجھے لامحدود زمانے کے لئے پتھر میں تبدیل کرنے والے تھے۔ میرا ہر احساس فنا ہونے والا تھا۔ میرا یہ دل جس نے بڑے بڑے معرکوں میں حوصلہ برقرار رکھا تھا۔ اب اس کی دھڑکن معدوم ہونے والی تھی یہ آنکھیں جو باگمان کے اندھیرے دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ اب بے نور ہونے والی تھیں۔ یہ سیما صفت جسم، میرا تندرست توانا جسم پتھر کے کسی حسین شاہکار میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ جب تک چاہیں گے مجھے طویل نیند میں گم رکھیں گے۔ سرنگا کی دیوی نے اچانک انگروما کے پُرسکون علاقے میں آ کر مجھے اس انجام کو پہنچا دیا تھا۔ میں غروب ہو رہا تھا۔

اور میں نے سوچا، ایسے اذیت ناک لمحوں میں کوئی کیا سوچ سکتا ہے؟ مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہ اپنی زندگی کی سب سے آخری غلطی کی ہے، اب اس خمیازہ مجھے نہ جانے کتنی صدیوں تک بھگتنا پڑے گا۔ جزیرہ توری باگمان، زارشی، انگروما کا یہ معزز اور بہادر شخص، جس نے بڑے بڑے اعزازات حاصل کیے وہ جس نے ہر جگہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، ایک ذرا سی غلت میں مارا گیا۔ جب تاریک براعظم کی جلیل الشان ملکہ اقبال باغیوں کی اس سرزمین کو نیست و نابود کرنے میں ناکام رہی تھی تو سرنگا کی دیوی ان کی سرشوریوں کی کہاں تاب لا سکتی ہے؟ میں نے انہیں دھوکا دیا جبکہ میں نے خود ان آنکھوں سے ان کی عظمت کا مشاہدہ کیا تھا۔ میں عرصے سے اس جزیرے میں مقیم تھا اور گورے جیسے پُراسرار شخص کے ساتھ رہا تھا۔ سرنگا کی دیوی جزیرہ توری میں سرنگا کو کوئی اعلیٰ منصب نہیں دلا سکتی تھی، یہ مجھے انگروما کے پھیلے ہوئے طلسمی جال سے کیسے نجات دلائے گی؟ انگروما سے نجات ناممکن تھی۔ یہاں لوگوں نے صرف آنا سیکھا تھا، انہوں نے اپنی عظمت و فضیلت اپنے علم و ریاض سے تاریک براعظم میں ایک ایسی سلطنت قائم کی تھی جس سے جانے کا کوئی دروازہ نہیں تھا، ان صاحب اسرار باغیوں کا جلال و کمال دیکھ کر ہی میں نے بہت غور و فکر کے بعد ان میں ضم

ایک دعا پڑھی۔ پھر میں نے اپنے چوٹی اڑدے کا ڈھانچا زمین پر چھوڑ دیا۔ اڑدہ زمین پر گرتے ہی اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔ اس نے ریگنا شروع کر دیا اور نیولا مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے اس سے الجھ گیا۔ زمین پر ان دونوں کے درمیان رسا کشتی شروع ہو گئی اور وہ الجھتے الجھتے گڑھے کے نزدیک پہنچ گئے۔

دیوی بدستور بانسری بجانے میں منہمک تھی۔ اس کی لے اتنی دردناک اور ہڈ اثر تھی کہ وہ پاگلوں کی طرح اس کی سمت کا تعین کر رہے تھے۔ انہوں نے نیولا اس وجہ سے میرے پاس بھیجا تھا کہ دیوی میرے قریب تھی لیکن نیولا میرے گلے میں پڑا ہوا چوٹی اڑدہ دیکھ کر اس سے الجھ گیا اور میں نے اڑدے کو اس لیے زمین پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے پرانے دوست سے معاملے میں مصروف رہے، گرونا کے ہاتھوں سے نیولا نکل چکا تھا۔ آخر گرونا نے ان دونوں لڑکیوں کو گڑھے کے اندر کھڑے ہونے کا حکم دیا اور خود دور کھڑا ہو گیا۔ اس کے ایک اشارے پر بے شمار نیزے ان دونوں لڑکیوں کے جسموں میں پیوست ہو گئے، کسی چھلنی کی طرح خون ان کے جسموں سے بہنے لگا۔ انہیں کوئی چیخ مارنے یا آف تک کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ دھواں اگلتا ہوا گڑھا خون سے بھر گیا۔ انہوں نے لڑکیوں کے سستے ہوئے بدن نکال کر ایک طرف پھینک دیے اور وہ سب زمین پر لیٹ گئے اور انہوں نے زمین سے اپنے سینے ماتمی انداز میں رگڑنے شروع کر دیے۔ ہجوم کے حلق سے متواتر عجیب و غریب چیخیں نکل رہی تھیں اور ان میں ایسی ہیبت تھی جیسے بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج میں ہو۔ وہ زمین سے اٹھے اور انہوں نے گڑھے کا خون اپنے منہ اور جسم پر ملنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ گڑھا خشک ہو گیا۔

انگرو ما کا ہر شخص کسی نہ کسی عمل میں مصروف تھا۔ وہاں پُر اسرار علوم جاننے والوں کی کمی نہیں تھی۔ جب انہیں خاصی دیر ہو گئی اور میرا بالائی دھڑ جوں کا توں رہا تو مجھے کچھ ڈھارس ہوئی۔ یقیناً دیوی کو وہ اپنی سرزمین سے نکالنے اور اس کی بانسری کی آواز بند کرنے میں ناکام ہو گئے تھے اور دیوی بہت سرشار حالت میں بانسری بجا رہی تھی۔ اسے کوئی ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ اپنی دھن میں مگن تھی۔ زمین سے اٹھ کر اور خون اپنے جسم پر مل کر انہوں نے جارا کا کا نام لے لے کر آسمان کی طرف دیکھا۔ نیولا میرا اڑدہ چھوڑ کر دوبارہ گرونا کے کاندھے پر سوار ہو گیا۔ مجھے حیرت تھی وہ اب تک ایک فاصلے پر کیوں کھڑے ہیں؟ آگے کیوں نہیں بڑھ رہے ہیں؟ انہیں کون سی طاقت روکے ہوئے ہے؟ میرے قریب دیوی کھڑی تھی شاید اس نے انہیں ایک فاصلے پر رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سر پٹک پٹک کر اور جھنجھلا جھنجھلا کر بار بار ادھر ادھر دیکھتے تھے۔ آخر ایک بوڑھا شخص صفیں چیرتا ہوا آگے آیا، گورے، گرونا اور دوسرے بزرگ اس کے قدموں پر جھک گئے۔ اس نے انہیں دھنکا دیا۔ میں نے انگرو ما میں پہلے اس شخص کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی لمبی داڑھی جھول رہی تھی اور گلے میں اتنی چیزیں لٹک رہی تھیں کہ گردن جھک گئی تھی۔ اس نے اپنے گلے سے ایک مالا توڑ کر اس کے موتی فضا میں اڑا دیے اور مختا انداز میں قدم بڑھانے لگا۔ اس کے پیچھے ایک ہجوم بڑھا۔ وہ سب بہت احتیاط سے ایک ایک قدم چل کر کوئی عمل پڑھتے ہوئے رکتے اور آگے بڑھتے رہے۔ سب سے آگے وہ شخص تھا جو ابھی ابھی آیا تھا، گورے، گرونا اور اس کے ساتھی عقیدت مندانہ انداز میں اس کے پیچھے تھے۔ ان میں سے کئی لوگ میرے دوست تھے اور مجھے علم تھا کہ وہ علم و فضل میں یکتائے روزگار ہیں۔ انہیں اپنی جگہ سے حرکت کرتے اور اپنی طرف آتے دیکھ کر دیوی میرے پاس سے ہٹ گئی اور مجھ سے دور کھڑی ہو گئی۔ نتیجتاً ہجوم کی سمت کا رخ اسی طرف ہو گیا وہ

اس نادیدہ آواز کی سمت کا سراغ لگانے اور اس کا تعاقب کرنے میں سرگرداں تھے۔ اس آواز نے ان کی سحرکاریاں بے اثر کر رکھی تھیں۔ وہ آواز کو پکڑنا چاہتے تھے۔ وہ تعداد میں اتنے زیادہ اور باکمال لوگ تھے کہ دیوی کا ان سے بچ کر نکلتا مشکل تھا۔ مگر دیوی مسلسل اپنی جگہ بدل رہی تھی۔ اس نے کوئی ایسا عمل کیا تھا جس سے وہ نابلد تھے۔ وہ میرے قریب سے ہو کر گزر گئے۔ دیوی راستہ بدلتی رہی اور ہجوم بھی بانسری کی آواز کی سمت شور مچاتا ڈھول بجاتا ماتم کرتا غضب ناک انداز میں آگے بڑھتا رہا۔

فضا کے ہول ناک شور کی گونج سے معلوم ہوتا تھا کہ آندھیاں چل رہی ہیں۔ وہ دیوی کی آواز کے ساتھ مجھ سے دور ہوتے گئے اور چکر کاٹتے رہے۔ انہوں نے میری طرف سے توجہ ہٹائی تھی۔ دیوی کبھی پیچھے کبھی آگے ہو جاتی۔ وہ آندھوں کی طرح جدھر سے آواز آتی اسی طرف دوڑ پڑتے۔ جہاں تک میری نظر کام کرتی رہی میں انھیں دیکھتا رہا۔ پھر دیوی اور وہ ہجوم میری بصارت کی حدود سے باہر چلا گیا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا کہ اگر کوئی نووارد دیکھ لیتا تو اس کی زندگی و فانیہ کرتی۔ میں نے یہاں آکر بہت کچھ دیکھا تھا۔ چنانچہ میں یہاں تک دیکھ سکتا تھا کہ درخت کی کوئی ٹہنی پلک کر مجھ سے باتیں کرے اور پانی میں آگ لگ جائے اور جانور انسانی لب و لہجہ اختیار کر لیں۔ طلسم و اسرار کی زمین میں میری رسائی کا سبب شاید یہی تھا کہ میں نے سب کچھ قبول کر لیا تھا۔ انہوں نے وہ دائرہ توڑ دیا جو دیوی نے قائم کیا تھا وہ کسی بھی لمحے دوبارہ پھر آکر میرا جسم خاک کے ان گنت ذروں میں تقسیم کر سکتے تھے۔ اگر وہ انتقام اور غضب میں بڑھتے تو میں ایک لمحے بھی زمین سے اپنا رشتہ برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن شاید انہوں نے اس طاقت کا اندازہ کر لیا تھا جو مجھے انگریزوں کی قید سے نجات کے لیے میری مدد کو آئی تھی۔ وہ ان کے سامنے نہیں تھی لیکن انہوں نے اس کی آواز سونگھ لی تھی اور اپنی تمام تر کوشش آواز کے بدن اور اس کا منبع اور مخرج قید کرنے کی طرف مبذول کر دی تھی۔ میں شش و پنج کی حالت میں کھڑا ان کی یاد دیوی کی واپسی کا منتظر تھا۔ اچانک مجھے دور کچھ رنگ ہوا کے پروں پر لہراتے نظر آئے اور پھر ان رنگوں نے میرے قریب آکر دیوی کی شکل اختیار کر لی اس نے میری سمت دیکھ کر صبر و تحمل کے انداز میں اپنا نیچہ دکھایا اور اپنے رنگ، اپنی آواز سمیت کہیں غائب ہو گئی۔ ہجوم کا رخ اب میری طرف تھا۔ وہ ایک جگہ آکر ٹھکنے کے انداز میں رک گیا۔ گورے نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر انھیں روک لیا تھا۔ وہ مجھے زہریلی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور مجھے ان کے غضب کا پورا اندازہ تھا۔ اب ان کے ساتھ وہ بوڑھا نہیں تھا جو اچانک وارد ہوا تھا۔

”ٹھہرو۔ اگر یہ زندہ رہے گا تو وہ دشمن آواز، وہ نادیدہ طاقت پھر اس کی سمت رخ کرے گی۔ وہ ضرور آئے گی تو دیکھ لے گی کہ ہم نے اپنے دن ضائع نہیں کیے ہیں ہم نے مقدس جارا کا کا کی خوشنودی کے لیے صدیاں قربان کر دی ہیں۔“

”جابر بن یوسف۔ اے معزز شخص!“ گرونا کے نرم و شفیق لہجے پر مجھے حیرت ہوئی۔ حالانکہ گورے کے طلسم خانے کی دیوار سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا، میں نے اپنے کان اس طرف لگا دیے۔ گرونا کہہ رہا تھا۔ ”تو ہمیں بتا، وہ کون ہے جو اتنے زمانے بعد جزیرہ انگریزوں کی پرسکون فضا میں ہلچل مچانے آ گیا ہے؟ سن اے مرد شریف و حق آگاہ! اگر تو ہم سے زیادہ کچھ طاقتوں سے واقف ہے اور وہ طاقتیں تیری ذات کے لیے اتنے بڑے خطرے مول لے سکتی ہیں، تو وہ اور تو دونوں ہمارے لیے مقدس و محترم ہیں۔ ہم اس کی عبادت کریں گے اور جارا کا کا کی طرح اس کی خوشنودی حاصل کر کے اپنی طاقت اور رتبے میں اضافہ کریں گے۔ تو انگریزوں پر سب سے قابل احترام شخص ہوگا، ہمیں یقین ہے کہ ہم نے غلط آدمی کا انتخاب نہیں

کیا ہے۔ بتاؤ کون ہے؟“

”مقدس لوگو!“ میں نے تمام تر انکسار سے کہا۔ ”میں جانتا ہوں تمہاری آنکھوں پر پردہ نہیں پڑا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ جب میں نے تمہارے غول میں شرکت کی تھی اس وقت میں کسی مذموم خیال سے آلودہ نہیں تھا۔ میں اپنی جگہ جب بھی صادق تھا۔ اب بھی صادق ہوں، آج دفعۃً میں نے یہ محسوس کیا جیسے کوئی میرے قریب ہو اس نے خواب ناک آواز میں مجھ سے کہا۔ چلو اپنی زمین پر واپس چلو! تمہارا پانی، تمہاری غذا تمہیں بلا رہی ہے۔ میں کسی سحر کا اسیر ہو گیا اور میں نے کہا۔ چلو۔“

”کیا تم نے اسے نہیں دیکھا؟ سچ بتا جابر بن یوسف! کیا تم اسے نہیں جانتے؟“ بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ پوچھا۔ ”کیا یہ تمہاری پاکیزگی میں آلودگی کی علامت نہیں ہے؟“

”ہاں..... میں نے اسے دیکھا ہے۔ وہ رنگوں کی ایک کہکشاں تھی اور میں نے اسے سنا ہے وہ عربی کا غنائیہ تھی۔ جب میں نے رنگوں کو بولتے دیکھا تو میں ان میں کھو گیا، اس آواز نے مجھے حکم دیا۔ جابر بن یوسف میرے ساتھ آؤ“ میں نے سر جھکا دیا۔“ میں نے انہیں فصاحت سے متاثر کرنا چاہا۔

”خوب خوب۔“ گورمے بولا۔ ”اور تم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ تم کس زمین کی پناہ میں ہو؟ تم نے اسے یہ باور نہیں کرایا کہ اب تم دنیا میں سب سے دلکش اور محفوظ جگہ پر ہو۔ جہاں علم کی قدر ہے، جہاں زندگی کا ایک مقصد ہے..... تم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ تم عالموں اور دانش مندوں کے درمیان ہو۔ اور تم تاریک براعظم کی رسوا اور ظالم ملکہ اقبالہ کے خلاف صف آرا ہونے والے ہجوم میں شامل ہو گئے ہو؟ آہ جابر بن یوسف! تم نے اس سے یہ کیوں نہیں کہا کہ جزیرہ انگریزوں کی زمین سرسبز ہے۔ اس کا پانی میٹھا ہے اور اس کی عورتیں شاداب ہیں۔“ گورمے نے مجھ سے زیادہ فصیح لہجے میں کہا۔

”کیا ایک ایسی بڑی طاقت میری دلیل سے متاثر ہو سکتی تھی جس نے اپنی آواز کے جادو سے انگریزوں کے بزرگوں کو تادیب پریشان رکھا۔“ میں نے اعتماد سے جواب دیا۔ ”مجھے اس سے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ سنو معزز لوگو! میں سمجھتا ہوں یہ ہماری غفلت کے بارے میں کوئی آسمانی تنبیہ ہے۔ کوئی اشارہ ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کچھ کم پر جوش ہو گئے ہیں۔ ہم نے شراب زیادہ بنانی شروع کر دی ہے۔ ہم پر عورتیں اپنا اثر بڑھا رہی ہیں۔ زمین کی آلائشوں سے ہمارے ہاتھ آلودہ ہیں۔“ میں نے تاثر انگیز لہجے میں کہا۔

”تم سچ کہتے ہو۔“ گرونا تاصف سے بولا۔ ”ہم نے اس غفلت میں گورمے کا طلسم خانہ کھودیا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی درس گاہ نذر آتش کر دی لیکن میرے پاس ہر بیکہ کی مقدس آنکھیں محفوظ ہیں۔ یہ غلطی ہم میں سے کوئی بھی کر سکتا تھا۔ اگر اسے کسی بلا سے واسطہ پڑتا۔ کیا میں نے تمہیں مطمئن کر دیا ہے؟“ میں نے ان کے کرب ناک چہرے دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں جابر بن یوسف! تمہاری موجودگی ہمارے لیے اطمینان کا باعث ہے۔ تم اب زمانوں کے لیے پتھر میں مقید کیے جا رہے ہو۔ تمہارا زیریں حصہ منجمد ہو چکا ہے۔ جب ہمیں تمہاری ضرورت پڑے گی۔ اور ہم علم و فضل میں کچھ اور آگے بڑھ جائیں گے تو ہم تمہیں بیدار کر لیں گے۔ ممکن ہے وہ کبھی دوبارہ اس طرف کا رخ کرے۔ آئندہ ہم اسے واپس نہیں جانے دیں گے۔ ہمارے وہ بزرگ جو انگریزوں کے غاروں میں بیٹھے

ہمارے لیے عبادت میں مصروف ہیں انھیں ہم طلب کر لیں گے۔ اور روجوں کو آزاد کر لیں گے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ یہ تم جانتے ہو۔“ گرونا کے لہجے میں سختی آگئی تھی۔

”نہیں..... میں پتھر میں منتقل ہونا نہیں چاہتا۔ میرے بیان پر شک نہ کرو۔ میں تمہارا ساتھی ہوں۔ میں نے اقبالہ کی سرکوبی کے لیے کیا تمہارے ساتھ آواز نہیں ملائی۔ مجھے علم کی لگن ہے اور میں کسی بھی موقع پر تمہارا اچھا گھوڑا ثابت ہو سکتا ہوں۔ جب میں تم سے کچھ سیکھ لوں گا۔ اس وقت تم مجھے پتھر کا خول پہنا دینا لیکن ابھی.....“ میں ان کی منت کرتا رہا۔ انہوں نے میری کوئی درخواست درخور اعتنا نہیں سمجھی۔ وہ اپنے جادوئی عمل میں مصروف ہو گئے۔ پتھر میں منتقل کرنے کا گر میں نے بھی سیکھا تھا۔ میں انھیں کسی وقت بھی بیدار کر سکتا تھا لیکن کتنی ہی بار یہ عمل پڑھنے کے بعد میری حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ جب وہ کسی طور اپنے ارادے سے باز نہیں آئے تو میں نے ڈھال کے طور پر شپالی ان کے آگے کر دی۔

”اسے ہٹاؤ۔“ گرونا چیخا۔ ”اسے ہٹا لو جابر بن یوسف! تمہاری یہ مزاحمت بے سود ہے۔“

”میری درخواست ہے کہ تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لو۔“

”تم کن لوگوں سے انکار کر رہے ہو؟“ گورے نے کہا۔

”اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے۔“ میں نے لجاجت سے کہا۔

”تمہاری فلاح اسی میں ہے کہ تم اپنے موجودہ جسم میں نہ رہو۔“ گرونا بولا۔ ”یہ کوئی سزا نہیں ہے۔ یہ تمہاری حفاظت ہے۔“

انہوں نے میری درخواست پر اپنے رد عمل میں کوئی ترمیم نہیں کی۔ معاً مجھے یہ احساس ہوا جیسے میرے جسم کے بالائی حصے پر سرنگ کی عظیم دیوی اپنا ہاتھ پھیر رہی ہے، ادھر میں نے زیریں حصہ منجمد ہونے سے بچانے کے لیے اپنے تحائف کے ذریعے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ میں نے ڈنگی کے سینک آگے کر دیے، اژدہا زندہ کیا اور شپالی رگڑتا رہا، میں نے اپنے تحفے اپنے جسم پر پھیلالیے۔

”تم غلطی کر رہے ہو، حیرت ہے تمہیں انگروما کے بزرگوں کا عرفان ابھی تک نہیں ہوا۔“

”مجھے ان کا پورا عرفان ہے، لیکن میں پتھر میں منتقل ہونے سے مر جانا بہتر سمجھتا ہوں، میں کسی احساس کے بغیر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔“

گورے نے گرونا سے کچھ کہا۔ گرونا سفاکی سے کہنے لگا۔ ”اگر تم آمادہ نہیں ہو تو ہم تمہارے آدھے جسم پر ہی قناعت کر لیں گے؟“

”کیا..... کیا تمہارا مطلب ہے کہ تم مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟“

”ہاں۔ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ بہت جلد تم خود یہ مطالبہ کرو گے کہ ہم تمہیں مکمل طور پر پتھر میں منتقل کر دیں۔ ہم تمہیں کھلے آسمان میں ایستادہ کریں گے۔ تاکہ دوبارہ کوئی تمہارے پاس آئے اور ہم اسے بھی تمہاری طرح اپنے بڑھتے ہوئے نجوم میں شامل کر لیں۔“

”نہیں دوستو۔ اے انگروما کے نیک لوگو! یہ ظلم ہے یہ میری وفاداریوں کی ناپاس گزاری ہے۔ میں تم سے احتجاج کرتا ہوں۔“

”آؤ مقدس جارا کا کی عبادت کریں۔“ گرونا نے نجوم سے کہا۔ ”انگروما کے لوگ اس نادیدہ آواز کی ہزیمت کا جشن منائیں۔ جابر بن

یوسف کو یہیں چھوڑ دیا جائے۔ جب وہ آمادہ ہو جائے گا تو ہمیں اس کا بالائی جسم پرسکون کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“

میرے پکارنے اور احتجاج کرنے کے باوجود وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میری آنکھیں گورے کے طلسم خانے کے دھوئیں سے جلنے لگیں۔ سرنگ کی دیوی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی؟ میں نہ زندوں میں تھا نہ مردوں میں۔ میرا نچلا حصہ مفلوج تھا اور اوپر کا حصہ اپنی زبوں حالی پر نوحہ خواں تھا۔ میں تاکے اس کیفیت میں مبتلا رہ سکتا تھا؟ میں کب تک اپنا بالائی حصہ زیریں حصے پر کھڑا رکھ سکتا تھا؟ اگر وہ اس طرف کا رخ کریں تو میرا کیا حال ہو گا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ دیوی کا پتہ چلانے کے لیے ہر بیک کی آنکھوں سے مدد لینا چاہیے۔ لیکن ان آنکھوں کے حد میں سمندر کی لہریں تھیں۔ اور دیوی سمندر میں کہیں نہیں تھی۔ ممکن ہے وہ جزیرے ہی میں کہیں روپوش ہو گئی ہو؟ وہ دوبارہ آئے گی تو مجھے کیا رویہ اختیار کرنا ہوگا؟ اب وہی میرا سہارا ہے۔ انگروما کے لوگ اب مجھ سے متفر ہو چکے ہیں۔ دیوی ہی عافیت کا ایک راستہ ہے، جب وہ انگروما کے سحر سے بچ کر جاسکتی ہے۔ کالاری جیسے دیوی بیکل شخص کو ختم کر سکتی ہے۔ اقبال کے روبرو ششے کا جارتو ڈر کر نکل سکتی ہے۔ وہ یہاں آ سکتی ہے تو وہ دوبارہ آ کر میری مدد کیوں نہیں کر سکتی؟“

اب اس میدان میں کوئی نہیں تھا، صرف میں تھا۔ آخر گورے کے طلسم کدے کے طبع سے نیشا برآمد ہوئی۔ میں نے اس حسین عورت کو پوری قوت سے پکارا کہ وہ ان لوگوں سے اپنے بدن کے حوالے سے میری سفارش کرے۔ نیشا انگروما میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہونے کی دعوے دار تھی۔ وہ ایک حسرت ناک نظر ڈال کر اس طرف چلی گئی جس طرف جھوم گیا تھا۔ میں اسے پکارتا رہ گیا۔

رات کے وقت میری آنکھوں میں درد ہونے لگا۔ گردن ڈھلکنے لگی۔ گورے کی تباہ شدہ طلسم خانے سے جو بھی گزرتا، میری ہیبت کڈائی دیکھ کر مسکراتا ہوا چلا جاتا۔ جابر بن یوسف الباقر کے سینے پر عظیم الشان نوادر آراستہ تھے مگر وہ اپنا نچلا دھڑ، اپنی اصل حالت میں لانے کا حقیر سا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا تھا۔

رات کے آخری پہر جب میرا بالائی جسم بری طرح دکھنے لگا، میری آنکھیں کھلنے لگیں، میں نے دیکھا، وہ خانوادہ اقبال کی بد نصیب کینز نیشا تھی۔ نیشا نے میرے گلے میں بانیں ڈال دیں، اس کی انگلی میں بالوں کی ایک لٹ جل رہی تھی۔ اور جلتے ہوئے بالوں کی روشنی میری چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ”نیشا!“ میں نے کرب سے آواز دی۔

”میں تمہیں زمین پر لٹا دیتی ہوں، اس طرح تمہیں کچھ آرام مل جائے گا اور تم اپنے تحائف سے مدد لینے کے قابل ہو جاؤ گے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے بازوؤں میں حائل کر دیئے وہ مجھے لیے زمیں پر گر گئی۔ ”نیشا! میں نے اس کی زلفیں چومتے ہوئے کہا۔ ”تم میری مدد کر کے خسارے کا سودا کر رہی ہو۔“

”شش.....“ وہ بولی۔ ”وہ میرا کچھ نہیں کر سکتے میں نے مشروب حیات پیا ہے، میں ان کی ضرورت ہوں اور تمہارے کچھ زیادہ کام بھی نہیں آ سکتی، مگر جابر تم نے یہ کیا کیا؟“

”میں سمجھ رہا تھا شاید مجھے نجات مل گئی۔“

”اوہ“ میرے غریب آدمی۔ دیوتا تم پر رحم کریں۔ تم نے کیسی مصیبتیں اٹھائی ہیں، کیسے نادر تحائف حاصل کیے ہیں تمہارا کیا حال ہو گیا

ہے۔ تم اپنے تحائف کا آزاد استعمال کیوں نہیں کرتے؟ ان سے کیا ممکن نہیں ہے مگر میرے دوست یہ خیال رکھنا کہ اگر انگریزوں میں تاریک براعظم کے سب سے قد آور لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ مجھے فوراً یہاں سے جانا چاہیے۔“

”عزیز نیشا، اب میں زمین پر لیٹ کر تحائف استعمال کروں گا مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ ادھر کا رخ کرے گی۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”وہ کون؟“ نیشا نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ۔“ مجھے فوراً خیال آ گیا اور میں نے کہا۔ ”وہی رنگوں کی کہکشاں، وہی صوت و سرو کا سمندر۔ میں اسے کیا نام دوں!“

”شاید وہ کبھی نہ آئے۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“ نیشا نے افسردگی سے کہا اور میرے پہلو سے اٹھ کھڑی ہوئی اسے زیادہ دیر تک روکنا مناسب نہیں تھا۔

☆=====☆=====☆

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان چنج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے پائرسز کو نوٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

میں نے اسے جانے دیا اور اب میں زمین پر لیٹا ہوا تھا اور اپنی ٹانگوں کو بالائی حصے کے زور سے حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنے مخالف سر کی طرف ڈال کر گردن دونوں طرف سے پکڑ کر صرف سینے کے بل زور دیا، میں اپنی جگہ سے کھسک گیا تھا، یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ دو تین بار اسی طرح میں نے جھٹکے دیے اور لڑکھتا ہوا ایک درخت کے سائے میں آ گیا۔ نیچے مٹھلیں سبزہ تھا۔ نیشا کے جام کا اثر چڑھ رہا تھا۔ آنکھیں بھاری ہونے لگیں اور میں نے دل کی گہرائیوں سے سرنگا کی دیوی کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی میں نے شپالی کی ڈوری کا آخری سراج تمام کر اسے اپنی ٹانگوں پر پھیرنے کی کوشش کی اور اڑدے کو اپنی حفاظت کے لیے حکم دیا۔ جتنے عمل بھی مجھے یاد تھے وہ میں نے دہرانے شروع کر دیے۔ نہ جانے وہ کون سا عمل تھا کہ مجھے اپنی ٹانگوں میں حرکت سے محسوس ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ دیوی ٹانگوں کے نزدیک بیٹھی میری زیریں حصے پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ میری ٹانگیں صحیح سلامت تھیں میں نے فوراً سر سے اس کے ہاتھ پکڑنے چاہے لیکن وہ دور ہوتی چلی گئی۔ میں اٹھ کر بے تحاشا اس کی طرف دوڑا۔ چند ہی قدم چل کر اس نے مجھے ساحل کی طرف اشارہ کیا اور ایک خاص جگہ جا کر کھڑی ہو گئی، اس نے مجھے آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پھیلائے اور خود رک گئی جب میں خاصی دور نکل گیا تو وہ مجھے اپنے پیچھے ایک فاصلے پر آتی ہوئی نظر آئی۔ لیکن اس کے پیچھے کیا تھا؟ ایک طویل سیاہ چادر۔ میں کچھ نہیں دیکھ سکا۔ اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔

اس سیاہ تاریک رات کو میں گورے کے گھر سے قریب تھا ابھی ہم چند قدم تیز رفتاری سے دوڑے ہوں گے۔ کہ حبشیوں کی آمد کا غلغلہ ہوا۔ وہی شور و ہنسی نقارے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے دھند کے سوا کچھ اور نظر نہیں آیا۔ البتہ دیوی میرے تعاقب میں تھی۔ اچانک بجلیاں سی کڑکیں اور انہوں نے دیوی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ روشنیوں کے جھماکے آنا فنا اس کے وجود پر مسلط ہو گئے۔ دیوی کے پیچھے ایک ہولناک قیامت برپا تھی جس کی دید سے میں محروم تھا۔ میں صرف شور اور ہا ہون سکتا تھا اور چمکتی ہوئی بجلیاں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے اور دیوی کے مابین ایک عجیب طلسمی جنگ جاری ہے۔ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنے سے میں گر پڑتا اور پھر بھاگنے لگتا۔ شعلوں، روشنیوں کے جھماکوں اور نیزوں کے درمیان دیوی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ میرے راستے کی دیوار بنی ہوئی تھی اور تمام وار خود سہہ رہی تھی۔ عقب میں پورا جنگل جلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں جو مشعلیں تھیں۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دیوی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ دیوی کے دونوں ہاتھ روشنیوں میں نہا رہے تھے۔ اور وہ اتنی بڑی اور اتنی قد آور معلوم ہو رہی تھی کہ میں دور چلتے ہوئے بھی اس کی آغوش کی امان محسوس کر رہا تھا۔ سمندر تک یہ لڑائی جاری رہی۔ مشعلیں آسمان پر اس طرح اڑ رہی تھیں جیسے طیاروں کی جنگ جاری ہو۔ اگر میں اس باران کے ہاتھ پڑ جاتا تو مجھے رحوں کے غار میں دھکیل دیتے۔ یہ میرے لیے آخری موقع تھا۔ چنانچہ میں پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا۔ انگریزوں سے فرار۔ وہاں سے نجات کے خیال کی بنا پر جسم میں ایک سنسنی دوڑی ہوئی تھی۔ ایک جوش۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ مگر یہ ممکن ہو رہا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ دیوی کا رخ بدل گیا ہے۔ میں نے بھاگ کر اس کے بدن کی سیدھ میں ہو گیا اور بار بار تصدیق کرتا رہا کہ میں کہیں اس کی امان سے نکل تو نہیں رہا ہوں؟ ابھی میں کچھ دور چلا تھا کہ مجھے ساحل پر کشتیوں کی ایک قطار کھڑی نظر آئی۔ میں کئی بار ساحل کی طرف آیا تھا لیکن میں نے وہاں ایک بھی کشتی نہیں دیکھی تھی۔ خود میری کشتی بھی انہوں نے اوجھل کر دی تھی۔ کشتیاں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ میں انگریزوں سے نجات حاصل کر رہا ہوں۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ڈھائی سال کا طویل عرصہ گزرنے

کے بعد ایک دن رہائی کا پروانہ مل جائے گا۔ اب دیر کیا تھی؟ سامنے سمندر تھا اور کشتیاں موجود تھیں۔ دیوی اپنی غیر معمولی طاقت کے ذریعے ڈھال بنی ہوئی یہاں تک لے آئی تھی۔ جب میں نے انگریزوں کی خشکی سے قدم اٹھائے اور سمندر کا پانی میرے جسم سے لگا تو مجھ پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں بھول گیا کہ پیچھے لرزہ خیز معرکہ جاری ہے، اور دیوی اب بھی مصیبت میں ہے کیونکہ وہ اپنے تمام حربے آزمائیں گے۔ آسمان آگ اگل رہا ہے اور زمین پر چاروں طرف سے نیزے ابل رہے ہیں۔ وہ نیزے جن میں آگ کے تیر تھے۔ وہ سمندر میں ادھر ادھر گر رہے ہیں۔ کوئی تیر میرے سر پر بھی لگ سکتا ہے؟ اب کچھ بھی ہو۔ میں نے کشتی کو دھکا دیا اور اچھل کر اس میں بیٹھ گیا۔

جب کشتی لہروں کے اوپر آئی تو میں نے انگریزوں پر الوادی نظر ڈالی۔ ساحل پر مشعلوں کی قطاروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے آگ لگی ہوئی ہو۔ مشعلیں دور دور تک نظر آرہی تھیں، نیزے میرے دائیں بائیں گر رہے تھے اور سمندر کی لہریں مجھے انگریزوں پر دوبارہ دھکیلنے کے لیے اپنا زور صرف کر رہی تھیں۔ چنگاریاں میری کشتی کے اوپر قص کرنے لگیں۔ میں نے گھبرا کر ساحل کی طرف دیکھا۔ دیوی پانی میں اتر رہی تھی۔ اس کے سر پر، دائیں بائیں ادھر ادھر بجلیاں چمک رہی تھیں۔ وہ آگ میں نہاتی ہوئی سمندر میں اتر گئی اور کہیں پہنچائیوں میں گم ہو گئی۔ نیزوں اور مخالف طوفانی لہروں کا سارا زور میری طرف ہو گیا۔ میں کشتی میں اوندھے منہ لیٹ گیا اور میں نے درمیان کی لکڑی مضبوطی سے پکڑ لی۔ اگر لہریں حسب سابق مجھے دوبارہ انگریزوں میں پھینک دیں گی تو میں سمندر میں کود جاؤں گا۔ یہ ارادہ کر کے میں لیٹا رہا۔ میں نے ان لہروں کی زد سے تحائف بچانے کے لیے اپنا ایک ہاتھ سینے کے نیچے رکھ لیا۔ مجھے معلوم تھا اتنی آسانی سے وہ شکست قبول نہیں کریں گے۔ انھیں سمندروں پر عبور حاصل ہے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ لہروں کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ پانیوں میں آگ لگا سکتے ہیں۔ میں اس سے پہلے بھی ایسے سمندری طوفان سے گزر چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کشتی پر دیوی نمودار ہوئی۔ اس کا ایک ہاتھ جزیرے کی طرف تھا اور دوسرا آسمان کی طرف۔ شدید ہچکولوں میں وہ کسی ستون کی طرح کشتی میں کھڑی ہوئی تھی۔ ہر طرف نیزے گر رہے تھے۔ مگر اس طوفان بلا خیز میں کشتی آگے بڑھتی رہی۔ ساحل کا شور دور ہوتا گیا۔ میں انگریزوں سے دور ہونے لگا۔ ہاں یہ سچ تھا۔ وہ دور ہو رہے تھے یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ پانچ چھ سال بعد میں اپنے علاقے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جزیرہ توری کی طرف چند گھنٹوں بعد دیوی نے اس طوفان پر قابو پا لیا۔ سمندر پرسکون ہوا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کھلا سمندر نیل گوں آسمان اور لہروں پر رواں دواں کشتی میں نے احسان مندی کی نظر سے دیوی کی طرف دیکھا۔ میرا جی چاہا کہ اس خوبصورت عورت کو اپنے گلے سے لگا لوں، اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا وہ چشم زدن میں کہیں تحلیل ہو گئی۔ میں کشتی میں اکیلا رہ گیا تھا۔ لیکن میرے حواس پرسکون تھے۔ اقبال کے دشمنوں کی سرزمین بہت دور نکل گئی تھی۔

جزیرہ توری کی طرف کشتی رواں تھی۔ وہ جگہ جہاں میں نے سب سے پہلے قدم رکھا تھا۔

بھوک پیاس میں دو دن گزر گئے لیکن یہ احساس کیا کم تھا کہ میں توری واپس جا رہا ہوں۔ میرے لوگ مجھے دیکھیں گے تو کیسا استقبال کریں گے۔ نہ جانے اس عرصے میں وہاں کیا تبدیلیاں رونما ہو گئی ہوں، ممکن ہے انہوں نے میرا انتظار ختم کر دیا ہو اور میری جگہ کوئی اور سردار متمکن ہو۔ انگریزوں کا جانے اور باغیوں کے ساتھ مل جانے کے بعد میرا ان سے رشتہ یوں بھی منقطع ہو چکا تھا۔ سرنگا اور سرتا کا کیا حال ہوگا؟ فلور پر کیا گزر رہی ہوگی؟ میرے دل میں بے شمار خدشے اور سو سے جنم لینے لگے۔ خود اقبال انگریزوں سے میری واپسی کو کس نظر سے دیکھے گی؟ مگر وہ جانتی ہوگی کہ میں تنہا

اتنے بہت سے لوگوں سے کیسے معرکہ آرا ہو سکتا تھا؟

سمندر کی بھری ہوئی پراسرار لہروں پر بھوک اور پیاس کے عالم میں میں نے چار دن گزار دیے میں زندہ رہا، امید آدمی کو زندہ رکھتی ہے لیکن خشکی کا انتظار بڑا عذاب ناک تھا۔ میں خود سے باتیں کر رہا تھا اور کبھی کبھی عربی کا کوئی مشہور نغمہ گنگنا نے لگتا تھا۔ فرض کرو، اگر توری پر کوئی اور سردار میری جگہ جلوہ افروز ہے تو جب وہ میری صورت دیکھے گا اور جب وہ میرے تحائف پر نظر ڈالے گا وہ خود کنارہ کش ہو جائے گا۔ میں کہہ جاؤں گا کہ جو باگمان کا سردار بھی ہوں۔ توری میں شوالا موجود ہے۔ شوالا کا کیا عالم ہوگا؟ اس کی نظریں میرا سینہ دیکھ کر پتھر جابائیں گی۔ اُف قلب کی کیا حالت تھی۔ نہ پوچھیے کیا گزر رہی تھی جیسے میرا وطن آ رہا ہو۔ میں پہلا شخص تھا جو باغیوں ان کے طلسم اور ان کی نفرت کا عینی شاہد تھا، میرے سینے میں کئی راز دفن تھے۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ جزیرہ کتنے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے اس کی آبادی کتنی ہے اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کس طرح مسلح کیا ہے۔ یہ معلومات اقبال کے لیے یقیناً کارآمد ثابت ہوگی، جب میں بتاؤں گا کہ میں وہاں کس کس سے ملا، نیشا سے ملا، کیشا سے ملا تو وہ کتنی متعجب ہوگی۔

میری کشتی لہروں کے دوش پر کبھی اونچی کبھی نیچی کبھی ڈوبتی کبھی ابھرتی ہوئی توری کی طرف بھاگ رہی تھی۔ بد قسمتی سے اس میں پر نہیں تھے، جب میں تھک جاتا تو اپنے گلے میں لٹکا ہوا چوبی اڑھوہ متحرک کرتا اور اس سے کھیلتا رہتا۔ میں اس پر سمندر کا پانی پھینکتا اور انکھیلیاں کرتا۔ ہر بیکار کی آنکھیں اپنے سامنے کر کے میں ان کے عدسوں میں جھانکتا اور جب تھک جاتا تو انھیں ایک طرف رکھ دیتا اور خیالات میں گم ہو جاتا۔ دل دھڑکتا، آنکھیں پلپکتی، جسم میں مستی سی چھانے لگتی، دوران خون تیز ہو جاتا، اعضا اٹھنے لگتے اور بدن میں گدگدی سی ہونے لگتی۔

پانچویں روز جب بھوک اور پیاس کی شدت سے میری حالت ابتر تھی، مجھے جزیرہ توری کی سر زمین دکھائی دی۔ وہی درخت وہی سرمست کر دینے والی ہوا۔ کشتی لہروں کے سہارے خشکی سے لگ گئی۔ میرا دل جسم سے باہر آنے کے لیے مچلنے لگا۔ میں نے کشتی ایک ٹھوک سے دور پھینک دی اور سینہ تان کر ساحل پر آ گیا۔ انھیں خبر نہیں ہوئی تھی کہ میں آ رہا ہوں۔ ایک پتھر پر بیٹھ کر انگلیوں سے اپنے بال سلیقے سے ترتیب دے کر میں نے اپنے تحائف ٹھیک کیے اور بستی سے پہلے پڑنے والے جنگل میں چلا آیا میں جنگل کی خوشبو میں درختوں کی شاخیں چھیڑتا، پتے توڑتا اور جنگلی پھل کھاتا ہوا آگے بڑھتا رہا، جنگل میں ایک جگہ مجھے خیال آیا کہ بستی میں داخل ہونے سے پہلے مجھے سمورال کی مالا سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ مالا کے دانے روشن ہو گئے۔ میری مسرتوں کا کوئی ٹھکانا رہا پھر میں چلا۔ ایک فیل بدست کی طرح ایک شیر شکم سیر کی طرح جب وہ اچانک مجھے دیکھیں گے کہ میں ان کا سردار جابر بن یوسف زندہ ان کے سامنے کھڑا ہوں تو میرے قبیلے میں کیسا رنگ چھا جائے گا۔ وہ میرا جسم ٹولیں گے کہ کیا میں واقعی ان کے سامنے ہوں اور میں اپنے تحائف سے معجزے رونما کر کے انھیں اور دنگ کر دوں گا۔

مگر ٹھہریے میں اپنے قلب کی کیفیت بیان کرنے میں نا انصافی کر رہا ہوں، مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنا دل قابو میں کر سکوں اور ذرا اس کا تصور کر سکوں۔ ہاں اس زہرہ جبین کا تصور اس مکمل کا تصور مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کے حسن جہاں تاب کے اوصاف بیان کروں اب میں اس سے قریب تھا۔ کون اپنی زندگی میں اتنے دکھ جھیلتا، کون صحراؤں کی خاک چھانتا اور انسانوں کا خون پیتا، کون لپیٹو برداشت کرتا اور کون لوریماکو مسرور کرتا۔ یہ میں تھا، جس کے اعصاب پر ہر جگہ اس کا جمیل چہرہ چھایا رہا اور مجھے معرکہ سر کرنے کی تحریک دلاتا رہا۔ انگریزوں کے لوگ کہتے تھے کہ وہ

بے وفا ہے، وہ قتال ہے، وہ بڑی رسوا ہے، مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ جابر بن یوسف نے اسے تمام اندیشوں کے ساتھ قبول کیا ہے۔ وہ ایک نگاہ التفات کے بعد اگر قتل کا حکم صادر کرے تو اسے غنیمت جانا جائے، مشکل یہ ہے کہ تاریک براعظم کے لوگ سرزمین عرب اور وہاں کے لوگوں سے ناواقف اور عشق کی روایتوں سے نا آشنا تھے۔ ایسے لوگوں میں ایک شخص آیا تھا۔ میں نے اپنے گزشتہ بیان میں اس کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ جزیرہ توری پر قدم رکھتے ہی میری شدتوں نے مجھے کتنا مضطرب کیا ہوگا؟ میں چاہتا تھا کہ سب سے پہلے اس کے آستانہ حسن پر دستک دوں لیکن اس حرم ناز کا نظارہ اس پیکر حسن کا جلوہ اتنا آسان ہوتا تو میں کبھی کامر گیا ہوتا۔

دور سے بستی کی چھوٹی ٹھکانیں ایک قطار میں نظر آرہی تھیں۔ سب کچھ وہی تھا۔ ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر میں نے اپنے علاقے کا نظارہ کیا۔ وہاں زندگی متحرک معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت میرے قریب سے میرے علاقے کا ایک شخص گزرا۔ میں نے اسے روک کر پوچھا۔ ”کیوں رے، اس علاقے کا سردار کون ہے؟“

وہ میرے سینے پر آراستہ نوادر دیکھ کر گنگ ہو گیا اور کوئی جواب دینے کی بجائے قدموں پر گر گیا۔ دہشت سے اس کا سر دوبارہ نہیں اٹھا۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر اسے بمشکل تمام کھڑا کیا۔ ”مقدس سردار جابر بن یوسف!“ وہ ہکلا کر بولا۔ ”تمہارے لوگ تمہارے منتظر ہیں۔“ وہ مجھے پہچان گیا تھا اور اسی لیے اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

”جاؤ آگے جا کر انہیں خبر کرو کہ ان کا سردار واپس آ گیا ہے۔“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ وہ سر پٹ بھاگا۔ راستے میں کئی جگہ گرا ہانپتا کانپتا بستی میں داخل ہو گیا۔ پھر میں نے ڈھول اور نقارے پٹنے کی آواز سنی اور ابھی میں آدھے راستے پر تھا کہ میرے علاقے کے لوگ اپنی چھوٹی ٹھکانوں سے بے تابانہ نکلے۔ فزاروان میں سب سے آگے ہو گیا۔ وہ سب مجھ سے کچھ دور کھڑے ہو کر زمین پر عقیدت اور اطاعت کے اظہار میں گر گئے اور فزارو و فادار کتے کی طرح میرے پیرو چاٹنے لگا۔

بستی کے قریب پہنچتے ہی میری پشت پر ہزاروں افراد کا ٹھٹ جمع ہو گیا۔ میں جس راستے سے گزرتا، لوگ عقیدت سے زمین پر گر جاتے۔ وہ حیرت سے میری صورت دیکھتے، مکان تک پہنچتے پہنچتے میرے قبیلے کے سارے لوگ میری دید کو آچکے تھے اور مکان کے سامنے ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔ وہ میری عوامی عادتوں سے واقف تھے اس لیے مجھ سے کچھ سننے کے منتظر تھے۔ بستی میں مجھ سے پہلے ایسا کوئی رواج نہیں تھا کہ سردار اپنے قبیلے کے لوگوں سے مخاطب ہو۔ فزارو نے اپنا ہاتھ بلند کر کے انہیں خاموش رہنے کی تلقین کی تمام نقارے ڈھول باجے تاشے بند ہو گئے اور جم غفیر پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔

مجھے آٹھ افراد نے بڑی احتیاط اور احترام سے ٹانگوں سے پکڑ لیا۔ میں اتنا بلند ہو گیا کہ سب کو نظر آنے لگوں۔ دور تک سر ہی سر نظر آتے تھے۔ میرے کھڑے ہوتے ہی مجھ میں ایک انتشار سا پاپا ہوا۔ میں نے توری کے وہ شناسا چہرے محبت اور فخر کی نظر سے دیکھے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔ نتیجتاً ہجوم نے بھی میرے اقدام کی پیروی کی اور ہاتھ ہلا کر زور سے اطاعت کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے اونچی آواز میں انہیں خطاب کیا۔ ”توری کے لوگو! کیا مجھے پہچانتے ہو؟ میں کون ہوں؟“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

جواب میں سرگوشیاں سی ہونے لگیں اور بے اختیار ان کے سیاہ جسموں میں سفید دانت کھل کھلانے لگے۔ ان پر میرے اس پر جملے کا خوش گوار اثر پڑا۔ میں نے کہا۔ ”میں تمہارا سردار جابر بن یوسف ہوں اور آج ایک عرصے بعد خود کو تمہارے درمیان پا کر اپنی رگوں میں خون کی گرمی محسوس کرتا ہوں، سنو کہ میں واپس آ گیا ہوں اور تمہیں مرثدہ ہو کر شدید ترین مصائب اٹھانے کے بعد میں کامیاب و کامران واپس آیا ہوں۔ اپنے سر بلند کر لو کہ میں نے جزیرہ باگمان کی سرداری بھی حاصل کر لی ہے لیکن وہاں میں اپنے بہادر دوست اسٹالا کو نیابت کے فرائض سونپ کر تمہارے پاس آ گیا ہوں اس لیے کہ مجھے تم سے سب سے زیادہ رفاقت محسوس ہوئی اس لیے کہ توری تاریک براعظم کی پر جلال ملکہ مقدس اقبال تک پہنچنے کا دروازہ ہے۔ اس لیے کہ یہیں میری ملاقات اس عظیم و جلیل ہستی سے ہوئی تھی جس نے ایک اجنبی کو اتنی سعادتوں سے نوازا۔ میں پھر یہاں آ گیا ہوں۔ چنانچہ اطراف و اکناف کے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے (میرا اشارہ شوالا کی طرف تھا) کہ جابر بن یوسف اب دو جزیروں کا سردار ہے۔ تم مجھے دیکھ رہے ہو تو غور سے دیکھ لو کہ میرا سید نوادر سے سجا ہوا ہے۔ طاقت میں میری ہمسری کرنے والے کو یہ جان لینا چاہیے کہ میں مقدس اقبال کی نظروں میں سرخ رو ہونے کے لیے کسی کو معاف نہیں کروں گا۔ میری زندگی صرف اس کے لیے وقف ہے جو ہم سب سے مقدس و محترم ہے میں تم سے کہتا ہوں کہ سر بلندی چاہتے ہو تو اس کا خیال رکھو۔ میں نے تم سے علیحدہ رہ کر بہت کچھ دیکھا ہے۔ سنو دیوتا تمہاری اطاعت کے خواہاں ہیں اور مقدس اقبال جی پر سکون اور شاد ماں رہ سکتی ہے جب تم میں سے ہر شخص اپنے آپ کو اس سے قریب کرنے کی خواہش کرے۔“

میری تقریر دل پذیر اور میری صدائے خوش انداز سن کر وہ مسرت میں جھومنے لگے۔ میں نے دیوتاؤں سے ان کے لیے دعائیں مانگیں اور اپنی آمد کی خوشی میں تین روزہ جشن منانے کا اعلان کیا۔ انہوں نے وہیں زمیں پر لوٹنا شروع کر دیا۔ عورتیں اور سب مرد بے قابو ہو گئے۔ فزارو مجھے لیے وہاں سے اپنے جھونپڑی نما مکان میں آیا۔ مکان میں فزارو نے کچھ ترمیم کی تھی۔ اندر آ کر مجھ پر خوشی طاری ہونے لگی حالانکہ مجھے فزارو سے بہت سی باتیں کرنی تھیں لیکن پانچ دن کی تھکاوٹ اور بھوک نے مجھے بے حال کر رکھا تھا۔ فزارو نے میرے سامنے اعلیٰ مشروبات اور غذائیں پیش کر دیں۔ توری کی حسین لڑکیاں میری خدمت میں حاضر ہو گئیں۔ انہوں نے تسلوں میں بھرے ہوئے پانی سے میرا جسم دھونا شروع کر دیا۔ بھنا ہوا گوشت پیٹ میں پڑا تو مجھے نیند آنے لگی۔ وہ لڑکیاں بالکل نئی تھیں۔ اتنے عرصے میں توری میں کئی لڑکیاں جوان ہو گئی ہوں گی۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں پیال کے آرام دہ بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے ہریکا کی آٹھ آنکھوں والا پتھر فزارو کے حوالے کیا۔ وہ میرے تخیلے کے لیے لڑکیوں کو چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے انھیں بھی رخصت کر دیا اور گہری نیند سو یا۔ ایسی گہری نیند جو کبھی بیروت میں مجھے اپنے آرام دہ بستر پر نصیب ہوتی تھی۔

جب میری آنکھ کھلی تو شام ہو گئی تھی لیکن میری آنکھیں روشن تھیں اور سارے بدن میں ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا، میرے بیدار ہوتے ہی فزارو اندر آیا اور میں نے اپنا تجسس ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے اس سے قبیلے کے متعلق پوچھا۔

”معزز جابر!“ وہ اس طرح وارفتگی سے بولا جیسے اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار بیٹھا ہو۔ ”تمہارے جانے کے بعد قبیلے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں نے قبیلے کی فلاح کے لیے تمہاری ہدایتوں پر عمل کیا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میرے لوگوں میں نافرمانی کی وبا نہیں پھیلی۔ میں نے نئے سرے سے ان کی جھونپڑیاں بنوائیں اور لکڑی کے لٹھوں، پتھروں اور دھات سے بہترین اوزار اور برتن بنوائے۔ میں نے اپنے قبیلے کو ہر اعتبار

سے مسلح کیا کہ اگر دو بدوان کا مقابلہ کسی دوسرے قبیلے کے افراد سے ہو تو وہ پیچھے نہ رہیں۔“

”مجھے اندازہ ہے کہ تم نے میری عدم موجودگی میں میری ذمے داریاں نبھائی ہیں۔ فزارو! میں تمہیں اس کا اجر ضرور دوں گا۔ لیکن ہمارے قبیلے کی طرف کسی نے آنکھ اٹھانے کی جرات تو نہیں کی تھی؟“ میں نے بگڑ کو پوچھا۔

”نہیں۔“ فزارو نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”مگر شوالا کی سرکشی اپنی جگہ قائم رہی۔ تمہارے جانے کے بعد اس نے ہمارے قبیلے کے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش کی۔ یہ تمہارا اقبال تھا اور دیوتاؤں کا سایہ کہ ہم اس کے شر سے محفوظ رہے۔“

”شوالا.....“ میں نے پوچھا۔ ”اس نے پھر کوئی شرارت کی ہے؟ کیا اس کی سرکشی ابھی ختم نہیں ہوئی؟ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ مجھے باگمان میں تربیت کے لیے بھیجا گیا تھا اور میں واپس آنے کے لیے گیا تھا۔“

”معزز جابر۔ اس کا خیال ہوگا کہ باگمان سے تمہاری واپسی ناممکن ہے، باگمان کی کڑی تربیت سے بہت کم لوگ واپس آتے ہیں۔ وہ دونوں قبیلوں پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن اس کے ارادے ماند پڑ گئے جب جزیرہ بیزنار کا ایک سرکش اور دیو قاتل شخص نربگا توری میں تمہارے قبیلے کی سرداری کے لیے کھڑا ہوا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ جابر بن یوسف باگمان سے واپس نہیں آیا ہے چنانچہ وہ توری کے اس قبیلے کی سرداری کا امیدوار ہے۔ کاہن اعظم نے اس کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ اگر تم چار مکمل چاند کے بعد، ادھر نہ آتے تو کاہن اعظم روایت کے مطابق نربگا کو توری کی سرداری کے لیے پیش کر دیتا اور نربگا رے کوئی شخص مقابلہ نہ کرتا۔ کیونکہ اس نے مقدس اقبال کی خاص نوازشوں سے بلند مرتبہ حاصل کیا ہے۔“

”فزارو..... تو کیا نربگانے اپنا مطالبہ واپس لے لیا؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”کیا وہ مقدس اقبال سے بہت قریب ہے؟“

”جو اپنے لوگوں کے درمیان سب سے نمایاں ہوتا ہے وہ یقیناً دوسروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور شجاعت سے مقدس اقبال کا قرب حاصل کر لیتا ہے اور مقدس اقبال اسے مزید کامیابیوں سے نوازتی ہے۔“ فزارو نے کہا۔ ”اس کی نوازشیں کسی ایک فرد کے لیے محدود نہیں ہیں۔“

”کیا نربگا واپس چلا گیا؟“

”نہیں وہ اب بھی یہیں موجود ہے۔ وہ شوالا کا مہمان ہے۔ وہ چار چاند گزر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ تم واپس آ گئے ہو تو شاید وہ واپس چلا جائے یا.....“ فزارو کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”یا کیا.....؟“ میں نے اضطراب سے پوچھا۔ ”کیا وہ میری واپسی کے بعد بھی مجھ سے نبرد آزما ہونے کا ارادہ کرے گا؟“

”ہو سکتا ہے۔“

میں نے اپنا پیر زین پر مار کر کہا۔ ”تاریک برا عظم میں ایک دن کسی کو یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں رہے گا کہ وہ مقدس اقبال سے زیادہ قریب ہے۔ میں درمیان کی صورت پسند نہیں کرتا۔ جاؤ فزارو۔ شوالا کو یہ باور کرادو کہ جابر بن یوسف کے گلے میں زارشی کے صحرا کا عطیہ شپالی موجود ہے جو اس بات کی نشانی ہے کہ اب ہر شخص کو اس سے محتاط رہنا چاہیے۔“

”معزز جابر! اسے جلد ہی اس کا علم ہو جائے گا اور نربگا بھی واپس چلا جائے گا لیکن ہمیں شجاعت کے ساتھ ذہانت بھی کام میں لانا ہو

گی۔“ فزارو نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ ”مقدس اقبال کو ذہین اور شجاع لوگ درکار ہیں۔“

فزارو نے میری برہمی دور کرنے کے لیے توری کی نو جوان لڑکیوں کے طائفے کو آواز دی۔ حسین لڑکیاں میرے پہلو میں بیٹھ گئیں۔ اور میرا جسم دبانے میں مصروف ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد قبیلے کے معزز افراد کا اجتماع ہوا۔ فزارو نے مجھے کوئی دل خوش کن خبر نہیں سنائی تھی۔ یہ خیال آتے ہی کہ فلوراشوالا کے پاس موجود ہے مجھے خود سے ندامت ہونے لگی۔ شوالا اب تک ایک کانٹا تھا۔ مجھے جزیرہ توری کی سرزمین پر اس کے وجود سے نفرت تھی اس لیے کہ مجھے اپنے لیے اس کی نفرت کا بھی اندازہ تھا۔ اس نے خود رنگا کو تیار کیا ہوگا۔ وہ جشن کی پہلی رات تھی۔ فزارو مجھے بستی میں لے گیا، اس کا خیال تھا میں وہاں سے اپنے لیے لڑکیاں منتخب کروں گا جو اپنے بدن رنگ کر مستانہ ادا کے ساتھ راستے میں کھڑی میری جنبش نگاہ کی منتظر تھیں۔ میرے قبیلے کی ہر عورت سردار سے رفاقت کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے بے چین تھی۔ میں ان کے سراپا کا جائزہ لیتا ہوا واپس آ گیا۔ مجھے امید تھی کہ کاہن اعظم سمورال میری پذیرائی کو آئے گا۔ اقبال کی طرف سے کوئی سلسلہ جنبانی ہوگی لیکن نہ اشار کا پتہ تھا نہ سمورال کا۔ شام گزرنے کے بعد میں ادھر آیا تھا۔ ان باتوں نے میرا ذہن بوجھل کر دیا۔

اور میں نے اپنے منہ پر طمانچہ مارا۔ جب مجھے اپنے بوڑھے ہندی دوست سرنگا کا خیال آیا صبح سے اب تک میں نے اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں پوچھا تھا یہ احسان فراموشی کی انتہا تھی۔ وہ نازک اندام ہندی دوشیزہ سرتیا بھی میرے قبیلے میں موجود نہیں تھی جسے میں بہت عزیز رکھتا تھا۔ یہ سرنگا ہی تھا جس کی دیوی نے مجھے انگریزوں کے طلسمی قید خانے سے نجات دلانی تھی۔ اصولاً مجھے سب سے پہلے سرنگا کو تلاش کرنا چاہیے تھا لیکن میں مقدس اقبال کے تصور میں سب بھول گیا۔ میں اپنے مکان سے نکل آیا اور میں فزارو سے حکمیہ انداز میں پوچھا۔ ”سرنگا کہاں ہے؟“

”سرنگا۔ وہ ہندی بوڑھا۔“ وہ کسی قدر تذبذب سے بولا۔ مجھے اس کے مخاطب پر پیش آ گیا۔ ”ہاں وہ سرنگا اور اس کی لڑکی کہاں ہے؟“

”میں نے سرنگا کو عرصے سے نہیں دیکھا۔“ فزارو نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کی لڑکی اسی دن سے غائب ہے جس دن ایک معزز طبیب جو ادنیٰ آسودگی کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا، تمہیں یاد ہوگا معزز جابر کہ اسی دن کسی نادیدہ قوت نے ایک اقا کو بھی ختم کر دیا تھا۔ سرتیا اسی دن سے روپوش ہے جو ادنیٰ کچھ روز تک کاہن اعظم کے زیر علاج رہا، پھر صحت یاب ہو گیا۔ آج کل وہ شوالا کے قبیلے میں مقیم ہے۔ سرنگا معتب تھا۔ اس کا دور عتاب جیسے ہی ختم ہوا۔ اسے کاہن اعظم نے توری کی آبادی سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ بہت دن ہوئے کسی نے اسے جنگلوں میں دیکھا تھا۔ لیکن اس کی لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی۔“

”اوہ فزارو تمہیں معلوم تھا کہ میں اس لڑکی کو کتنا عزیز رکھتا ہوں۔ تم نے اسے تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی؟“ میں نے فزارو سے تلخ لہجے میں کہا۔

”وہ ایک معتب شخص کی بیٹی تھی۔ اس لیے میں محتاط رہا۔“

”سرنگا۔ میرے مظلوم ہندی دوست!“ میں نے سرگوشی کی۔ ”تمہیں یہاں آ کر ایک لمحہ بھی سکون کا نہیں ملا۔ اور میں محسن کش شخص تمہاری لڑکی کی حفاظت بھی نہ کر سکا۔“

”میں جا رہا ہوں۔“ میں نے فزارو سے کہا۔ ”میں اپنے دوست سرنگا کو تلاش کروں گا اور اسے اپنے قبیلے میں لانے کے بعد مقدس اقبال سے اس کے لیے سفارش کروں گا۔“

”اسے کاہن اعظم نے نکال دیا تھا۔“ فزارو نے دبی زبان سے کہا۔

”میں اسے واپس لانے کی کوشش کروں گا۔“

”کیا تم کل صبح تک نہیں ٹھہر سکتے؟ جزیہ توری میں معزز جابر کے اعزاز میں آج رات مشعلوں کا قرض ہو رہا ہے۔ آقا تم چلے گئے تو قبیلے کے لوگ اس تقریب میں اپنے سردار کی کمی شدت سے محسوس کریں گے۔“

”نہیں یہ جشن برپا کیا جائے اور اس دھوم دھام سے کیا جائے کہ شوالا کا قبیلہ رشک کرے۔ عورتوں اور مردوں کو آزادی دو کہ آج وہ جسے چاہیں اپنا رفیق چن لیں۔ شراب کے تمام برتن کھول دو۔ ان سے کہو کہ آج رات وہ جو چاہیں کریں۔ جنگلوں سے جانوروں کو آواز دو۔ مدعوئین کو بہتر گوشت فراہم کیا جائے۔ وہ اتنی شدت سے ڈھول بجائیں کہ ان کے ہاتھ میں زخم پڑ جائیں، دوبارہ اس طرح ناچیں کہ ان کے تلوے چھل جائیں۔“

”میں نے اپنے معزز سردار کے لیے قبیلے کی چند حسین لڑکیاں پرورش کی ہیں۔ کم از کم وہ اس جشن میں شریک نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ وہ صرف سردار کے لیے وقف ہیں۔“ فزارو نے ادب سے کہا۔

”انھیں بھی لوگوں میں تقسیم کر دو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”یہ روایت کے خلاف ہے۔ وہ سردار کے لیے وقف ہو چکی ہیں۔ انھیں خصوصی طور پر جنگی پھل اور بوٹیاں کھلائی گئی ہیں۔ ان کے جسموں پر طبری کے تیل سے مالش کی جاتی رہی ہے اور جسمی کے کیڑوں نے انھیں معطر کر دیا ہے۔ ان کی سانسوں میں خوشبو ہے اور وہ اپنے سردار کی منتظر ہیں۔“ فزارو نے آہستگی سے کہا۔

میں فزارو کی ہوس انگیز ترغیبیں سنی ان سنی کر کے جنگل کی سمت چلنے لگا۔ فزارو میری صورت دیکھتا رہ گیا۔ جشن میں آج رات میری ہدایت پر جارا کا کا کی مشترکہ عبادت کا اہتمام کیا گیا تھا مگر خود میں سریتا اور سرنگا کی جستجو میں اسے چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

”سرنگا تم کہاں ہو؟“ میں نے جنگل کی سنسان رات میں ہانک لگائی۔ جنگل کی سوئی ہوئی آبادی نے مختلف قسم کی آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔ اسے تلاش کرتے کرتے بہت رات بیت گئی تھی۔ سرنگا نے خود کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے ارد گرد کوئی ایسا پردہ لگا لیا تھا، جس کے اندر کوئی نہ جھانک سکے۔ سرنگا کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ اس ہندی بوڑھے کے اسرار رفتہ رفتہ مجھ پر کھل رہے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ تاریک اعظم میں ہوس اور غضب کی نگاہوں کے باوجود اس کی لڑکی سریتا کی دو شیرنگی پر کوئی داغ نہیں آیا تھا۔ وہ ابھی تک ایک دھلی ہوئی شفاف اور پاکیزہ لڑکی تھی۔ کیونکہ وہ سرنگا کی عظیم دیوی کی امان میں تھی۔ میں تمام رات سفر کرتا رہا اور غار در غار سرنگا کو آوازیں دیتا رہا۔ اسلانا نے مجھے پر اسرار علوم کے بارے میں چند نکتے تعلیم کیے تھے اور مجھے اپنے تحائف سے مدد لینے کا گر سکھا یا تھا۔ لیکن جہاں پہلے ہی طلسمی پہرے لگے ہوئے ہوں، وہاں ان کا عمل دخل طلسم ٹوٹنے کے بعد ہی ممکن تھا۔ میں نے ایک خاص جگہ پہنچ کر سرنگا کی بوسنگھ لی تھی۔ اتنے مصائب اٹھانے اور اتنی جدوجہد کرنے کے بعد مجھ میں اپنے ارد گرد کی

موافق ناموافق فضا کا جائزہ لینے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر جب سرنگا کو متعدد آوازیں دینے کے بعد بھی کوئی رد عمل نہیں ہوا تو میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا۔ ”میں تم سے ملاقات کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا بہتر ہے کہ تم پردہ چاک کر دو اور آ کر اپنے دوست کے گلے لگ جاؤ۔“

کچھ نہیں ہوا، میری بات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے اپنے اڑدے کو حکم دیا کہ وہ مجھے سرنگا تک لے چلے۔ اڑدہ ایک سمت جا کر رک گیا۔ اند ایک غار تھا لیکن اڑدے نے اندر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اب واپس میرے گلے میں جھول رہا تھا۔ ”میں تمہارے دروازے پر ہوں سرنگا!“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”کیا تم بہرے ہو گئے ہو؟“ مجبوراً مجھے اپنا سب سے انمول تحفہ شپالی غار کے اندر پھینکنا پڑا۔ شپالی کے اندر جاتے ہی غار بقیہ نور ہو گیا اور میں جھجکتا ہوا کسمسا تا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ شپالی نظروں سے اوجھل تھی میں نے اڑدہ ازمین پر چھوڑ دیا کہ وہ شپالی ڈھونڈ کر مجھے لا دے۔ اڑدے نے صرف ایک لمحے بعد میرے ہاتھ میں شپالی اگل دی۔ ”مجھے افسوس ہے سرنگا۔“ میں نے اندر گھستے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں تمہارے لیے کوئی غیر نہیں ہوں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ میں نے ایسی طاقتیں حاصل کر لی ہیں۔ تمہارا دوست خالی ہاتھ واپس نہیں آیا۔“ میں یہ کہتا ہوا غار کی لمبی سرنگ عبور کر گیا اندر ایک ٹٹمٹاتا ہوا دیا روشن تھا اور مٹری کے جالوں کے درمیان بوڑھا سرنگا بے حس و حرکت ایک خاص انداز سے بیٹھا ہوا تھا اس کے دونوں پیر ایک دوسرے کے اوپر تھے اور ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ”سرنگا میرے محترم دوست! یہ میں ہوں جابر! آنکھیں کھولو۔“

سرنگا کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ میں نے مسلسل اسے اپنی آمد کی اطلاع دی لیکن اس کی پلکوں میں بھی جنبش نہ ہوئی۔ میری چیخنے اور پکارنے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا، مجھے زارشی کے بوڑھے یاد آ گئے۔ وہ بھی اپنے عمل میں اتنے ڈوب جاتے تھے کہ برسوں انھیں باہر کی دنیا سے واسطہ نہیں رہتا تھا سرتا کو وہاں نہ پا کر مجھے اور تشویش ہوئی، میں نے اس شکستہ کھوہ میں اسے آواز دی۔ پھر مجھے ایک چھوٹی سے جگہ کا پتہ چلا، وہ ایک تنگ راستہ تھا۔ میں اس سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر گہرا اندھیرا تھا۔ شپالی کی روشنی اس مرتبہ بھی کام آئی۔ روشنی میں جب میری نظر زمین پر پڑی تو مجھے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھنے پڑے میرے منہ سے ایک کرب ناک آہ بلند ہوئی میں اس پر جھک گیا۔ وہ سرتا تھی۔ وہ سوئی ہوئی نہیں تھی اور زندگی کے آثار بھی ایسے نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے اس کا پھول سا بدن اٹھایا تو اس کے بدن کے پھول بکھر گئے۔ وہ میری پنڈلیوں پر گر گئی۔ موت اور زندگی کے درمیان ایک کیفیت کا نام سکتہ ہے، سرتا سکتے کے کیفیت سے دو چار تھی۔ سرنگا نے اسے پتھر تو نہیں بنایا تھا۔ لیکن اسے ایک جگہ ٹھہرا دیا تھا۔ میں نے اسے چٹان کے سہارے لٹا دیا، اس کے منہ میں ایک پھول تھا اور دانت سختی سے بند تھے۔ میں دوڑ دوڑا باہر آیا۔ سرنگا اب بھی خاموش بیٹھا تھا۔ دیا جل رہا تھا۔ میری سمجھ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں؟ ان دونوں کو کیسے جگاؤں؟ انھیں کیسے بتاؤں کہ میں آ گیا ہوں؟ میں نے سرنگا کے کان میں آواز دی۔ اس کا جسم جھپٹا۔ اس کے سامنے دیوی کی وہی چھوٹی سے مورتی تھی، جسے وہ اپنے پاس بڑے احترام سے رکھتا تھا۔ اس کی نظریں مورتی پر لگی ہوئی تھیں۔ دیوی کی مورتی دیکھ کر میں نے جوش مسرت اور عقیدت میں اسے اٹھالیا اور اس کا ایک بوسہ لیا۔ میرے اس عمل سے سرنگا کے بے جان جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے جھپٹ کے مجھ سے مورتی چھین لی اس نے اشتعال کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ دیے کی روشنی میں اس کی سرخ آنکھیں خون اگل رہی تھیں۔ میں نے شگفتگی سے کہا۔ ”دشمن نہیں ہے سرنگا۔ میں ہوں تمہارا دوست جابر بن یوسف۔“

”جابر!“ اس نے کرب سے میرا نام لیا۔ پھر نرم آواز میں بولا۔ ”تم آگئے ہوں؟“

”ہاں سرنگا“ میں آ گیا۔“ میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مجھے تمہارا انتظار تھا۔“

”میں ہر جگہ تمہیں اور سرتا کو یاد کرتا رہا۔ میں انگریزوں کے باغیوں میں پھنس گیا تھا۔ اگر تمہاری عظیم دیوی میری مدد نہ کرتی تو میں کبھی وہاں

سے واپس نہ آتا۔“ میں نے احسان مندی سے کہا۔

”انگرو ما۔“ وہ زہر خند سے بولا۔ ”تم نے وہاں کیا دیکھا؟“

”میں نے کیا نہیں دیکھا؟ تم نے سچ کہا تھا کہ یہاں کی زمین کا ہر ذرہ اپنے اندر ایک اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ میں نے انگریزوں کو

قد آور اشخاص دیکھے۔ وہ ایک عجیب دنیا ہے۔“ میں نے چند سانسوں میں اسے انگریزوں کی ساری کہانی سنا دی۔ وہ پورے انہماک سے اسے سنتا رہا۔

پھر اس نے مجھ سے مختلف سوالات کیسے میں کہیں کہیں انک رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”فکر نہ کرو، اس غار کی آواز یہیں گھٹ جاتی ہے۔“

یہ سن کر میں نے اطمینان سے اپنے تمام تاثرات اسے منتقل کر دیے۔ انگریزوں کے واقعات اس نے بطور خاص اشتیاق سے سنے پھر میں نے

باگمان کا واقعہ سنایا۔ زارشی کے بوڑھوں کا ذکر کیا، اسٹالا کو اقتدار سونپنے کی داستان گوش گزار کی۔ میں ایک شاگرد کی طرح ایک عزیز کی طرح اسے اپنے

طویل دورے کی تفصیلات سناتا رہا۔ پھر میں نے بڑے اشتیاق سے اسے اپنے تحائف دکھائے۔ میں نے شپالی رگڑ کر پورا غار روشن کر دیا۔ میں نے وزنی

پتھر اپنے ایک ہاتھ پر اٹھا کر اسے آسانی سے دوسری طرف پھینک دیا۔ اڑد ہا متحرک کر کے اسے دیا بھانے کا حکم دیا۔ اور شپالی نے دیا دوبارہ روشن کر دیا۔

میں نے ڈنگی کے سینکڑوں زمین پر مارے، وہاں گڑھا ہو گیا۔ تحائف کی نمائش کے بعد میں نے سرنگا سے پوچھا۔ ”کہو محترم سرنگا کیا خیال ہے؟“

”ہاں یہ قابل ستائش ہے مگر یہ کچھ نہیں ہے۔“

”کیا..... سرنگا تمہارا کیا مطلب ہے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”جابر بن یوسف! آہ تم نے تمام باتوں کا ذکر کیا مگر تم نے واپس جانے کی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی۔ تمہارا مقصود نظر کچھ اور ہے۔ کیا ہم

کبھی یہاں سے واپس نہیں جائیں گے؟“

”واپسی؟ ارے سرنگا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں نے یہ طلسمی دنیا دیکھی ہے، اب مہذب دنیا کو بھول جاؤ۔ مجھے ایسے کوئی امید نہیں رہی

ہے، اسی لیے میں نے اس دنیا سے مفاہمت کر لی ہے۔ میرا مقصود نظر اگر وہ ہے تو یہ کوئی معمولی مقصد نہیں ہے۔ میں ان تحائف کی مدد سے اور تمہارے

مشوروں سے تاریک براعظم میں آگ لگا دوں گا۔ میں اس سلطنت میں اس سے اتنا قریب ہو جاؤں گا کہ آج تک کوئی نہیں ہوا ہوگا۔ انگریزوں کے باغی

اس کی بے وفائی کے شاک کی ہیں۔ میں کہتا ہوں ان کی طلب میں صدق نہیں تھا۔ میں یہ معرکہ ضرور سر کروں گا۔“ میں نے مکمل عزم کے ساتھ کہا۔

”نہیں۔“ اس نے اپنا ہاتھ روک کر کہا۔ ”میں سب جانتا ہوں تمہارے ارادے مجھے تو انار کھتے ہیں۔ لیکن جابر! میرے عزیز! میرے بچے!“

سرنگا نے شفقت سے کہا۔ ”تمہیں شاید جلد ہی انگریزوں سے بلا لیا گیا۔ ابھی تمہیں اور وہاں رکنا تھا۔ ابھی تمہیں پختگی کی ضرورت تھی۔ انگریزوں کے فاضل

آدمیوں نے تم میں سنجیدگی پیدا نہیں کی۔ میں تمہاری عمر کے کچھ اور سال ڈھلتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی تمہاری باتوں سے دودھ کی بو آتی ہے۔“

”سرنگ! میں اب تمہاری باتیں رد کرنے کی جرات نہیں رکھتا، لیکن تمہاری احتیاط اور تحمل کے سبق کا مجھے خیال ہوتا تو تاریک براعظم میں آج میری یہ حیثیت نہ ہوتی۔“ میں نے ناگوار لہجے میں کہا۔

”تمہیں نہیں معلوم میرے عزیز اپنا ذہن فراخ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم غلط سوچوں سے احتراز کرو گے۔ میں تم سے یہ کب کہتا ہوں کہ تم یہاں کے معاملوں میں اندر تک شامل ہونے کی کوشش نہ کرو مگر اس بات کا خیال رکھو کہ کوئی بھی شخص تمہیں عقب سے چھرا مار سکتا ہے۔“

مجھے خبر ہے سرنگ! کیا تمہیں شوالا یاد ہے؟“ میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہتے تو۔ جابر بن یوسف! تمہیں سلطنت اقبالہ کے قانون کی رو سے پورا حق حاصل ہے کہ تم اسے کسی بھی وقت دعوت مبارزت دو مگر اب وہاں ایک اور شخص بھی موجود ہے۔“

”نربگا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں اس کے متعلق سن چکا ہوں۔“

”جابر بن یوسف! ذہانت کی جنگ سب سے مفید ہوتی ہے۔ تمہیں اپنے موجودہ منصب کے مطابق صرف ایک محاذ پر شوالا یا کسی دوسرے سے جنگ نہیں کرنی، بہت سے محاذ کھولنے ہیں۔ تمہیں اپنی ذہانت کی بساط بچھانی ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں لیکن مجھے آئے ہوئے ایک دن بھی نہیں گزرا۔ حیرت ہے کہ ابھی تک کاہن اعظم سمورال نے نہ مجھے طلب کیا نہ خود میرے علاقے میں آیا، نہ ہی اقبالہ کی طرف سے کوئی پرسش ہوئی۔“ میں نے تذبذب سے کہا۔

”وہ شاید تاخیر سے تمہاری طرف رجوع ہوں کیونکہ تم انگریزوں سے واپس آئے تو تم اس علاقے کے حریفوں کے درمیان رہے ہو۔ کاش تمہارا رابطہ کسی طور ان سے برقرار رہتا۔“

”سرنگ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

اگر تمہاری عقل بعید از فہم باتیں نہیں سوچے گی تو تمہارے راستے میں بڑی تکلیفیں پیش آئیں گی عزیز جابر!۔۔۔۔۔ تم۔“

ایک ایک سرنگ کا لہجہ بدل گیا۔ روشنی کی ایک لکیر تیزی سے غار کے اندر داخل ہوئی اور فوراً معدوم ہو گئی۔ سرنگ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”وہ عظیم ہے جابر بن یوسف! مقدس اقبالہ عظیم ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”صرف اس کی طلب کرو اور زمینیں اپنے پیروں تلے روند دو۔ وہ ایک دن تمہیں سرفراز کرے گی۔ تم شجاعت اور ذہانت کے اعلیٰ مظاہرے کرتے رہو اور جب تمہیں اس کی دید کی سعادت نصیب ہو تو اس سے میری سفارش بھی کرنا۔ کہنا سرنگ! اس کی اطاعت گزار ہے۔“

میں اس سے ضرور کہوں گا۔ وہ تمہیں معاف کر دے گی۔ کیونکہ اس کا دل وسیع ہے۔ دیکھنا، تم کسی دن خود آبادی میں جاؤ گے لیکن میں سرتپا کو یہاں سے لیے جارہا ہوں۔ سرتپا پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔“

سرنگ! نے مجھے اجازت دے دی۔ یہ گفتگو ادھوری رہ گئی مگر ہم نے اہم باتیں کر لی تھیں۔ میں نے اسے زندہ و سلامت دیکھ لیا تھا۔ میں

شپالی سے غار کا طلسم توڑ کر اندر داخل نہ ہوتا تو روشنی کی اس لکیر کا گزر بھی ممکن نہ ہوتا۔ میں نے پھر رکی طور پر سرنگا سے باتیں کیں۔ کیونکہ ہماری گفتگو غار سے باہر کی پر اسرار طاقتوں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ سریتا میرے جسم سے چپکی ہوئی تھی اور مجھے اس کے لمس سے ایک گونہ مسرت ہو رہی تھی۔ میں اسے دل میں بٹھانا چاہتا تھا۔ اسے احتیاط سے لے کر میں اپنے مکان میں آ گیا۔ یہاں میں نے اس کا سکتہ توڑنے کے لیے فرازوں کی مدد طلب کی۔ فراز و سرتا کو دوبارہ دیکھ کر حیران تھا۔ ہماری پیہم کوششوں سے وہ ہوش میں آ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور سامنے مجھے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”تم!“ وہ ابھی صرف یہی کہہ سکتی تھی میں نے اس کے لب لعلیں پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے مسکرا کر بتایا کہ ہاں یہ میں ہی ہوں۔

میری ہدایت پر سرتا کو معطر پانی سے نہلایا گیا اور اسے پھولوں اور پتوں سے ڈھک دیا گیا۔ اس کے بدن کا عجیب رنگ نکلا تھا۔ میں نے اسے سراپا قیامت کو دیکھا تو نظریں جھکا لیں اور اس سے کہا۔ ”سرتیتا قسمت میں یہی لکھا ہے کہ تم بار بار حادثوں سے دوچار ہوتی رہو اور میں بار بار تمہیں نجات دلاتا رہوں۔ اب تم یہاں آ گئی ہو تو تم اس گھر کی مالک ہو۔“

اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں اور میں بستی میں سر مست لوگوں کے درمیان پہنچ گیا۔ لوگ زمین پر بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ عورتیں مرد بچے ادھر ادھر شب بیداری کے بعد اپنی چھوٹی ٹیوں کے درمیان بکھرے ہوئے تھے۔ کسی کو ہوش نہیں تھا۔

کئی دن گزرنے کے بعد بھی کاہن اعظم سمورال کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہ ہونے پر مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے انکروما اور باگمان میں بہت مصروف دن گزارے تھے۔ اس یکسانی سے جی اکتانے لگا، جس کے لیے اتنے عذاب مول لیے اس نے بھی میری واپسی پر کسی حوصلہ افزائی کا اظہار نہیں کیا؟ میں نے اس سے قربت کے لیے جو صبر آزما انتظار کیا تھا کیا وہ کم تھا؟ سرنگا جو کچھ سوچ رہا تھا اس کی میری نظر میں کچھ وقعت نہ تھی۔ میں تو صرف ایک بات جانتا تھا کہ اس کی قربت کے حصول کے بعد میری زندگی تمام ہوئی اس لیے اب مجھے اپنا گھر اپنا وطن یا نہیں آتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی سک اٹھتی تھی۔ میرا خیال تھا، میں بڑا حقیقت پسند ہوں، سرنگا سے زیادہ کہ میں نے سحر و انیسوں کی اس سر زمین سے حقیقت پسندانہ مطابقت پیدا کر لی ہے۔ لیکن میری فکر کا دوسرا پہلو قطعاً شاعرانہ تھا۔ انکروما کے لوگ کہتے تھے کہ حسین اقبال ایک خواب ہے، ایک خیال ہے ایک سحر ہے اس کے سوا کچھ نہیں لیکن اس کے معاملے میں میرے دل پر کیفیتیں گزر جاتی تھیں۔ میں سوچتا کہ جب میں اس کے قریب ہو جاؤں گا اور اس کا دست احمریں میرے اختیار میں ہوگا۔ اور اس کے لبوں کی حلاوت میری تیخیوں سے مس ہوگی تو یہ میری زندگی کا سب سے بڑا انعام ہوگا۔ توری آنے کے بعد اس کی یاد میں زبردست شدت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ انتظار کہ اس کی طرف سے کوئی پہل ہوگی، بہت گداز پیدا کرتا تھا مگر کوئی پلٹ کر خبر نہیں لیتا تھا۔ سرتیتا کی موجودگی سے ذہن و دل میں اور فشار برپا تھے۔ وہ دوسرے کمرے میں بھی سجاوٹ بیٹھی رہتی میں اسے دیکھتا اور توری کی نوجوان لڑکیوں کو دیکھتا مگر کنارہ کشی اختیار کیے رہتا کہ کبھی تو اسے میرا خیال آئے گا۔ اس کی آنکھیں بڑی ہیں اور وہ کشمکش محسوس کر رہی ہوگی۔ وہ یہ پیش محسوس کر رہی ہوگی جو صرف اس کی وجہ سے میرے سینے میں ہے۔ اس میں کوئی فریب نہیں تھا۔ میرے ذہن میں اقتدار اور دوسری سفلہ خواہشوں کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ یہ منصب، یہ مند، یہ رتبہ ان کی خواہش صرف اس سبب سے تھی کہ وہ مجھے مطلوب تھی، اس کا التفات اسی طرح حاصل کیا جاسکتا تھا کہ اس تک پہنچنے کے لیے کارنامے انجام دیے جائیں۔ اقبال کا عرفان ایک پری پیکر دوشیزہ کا سراغ، اس کا حسن ایک پہاڑ تھا، اس کا حسن ایک سمندر تھا، میں

اس پہاڑ پر چڑھنے اور اس سمندر میں اترنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ یہ مہم سر ہو گئی تو پھر دنیا میں اور کیا رہ جائے گا۔ ہاں جو لوگ راستے کا پتھر بنے ہوئے تھے۔ اور جو اس کی نظر میں میری منزلت گرانے کا سبب تھے، ان کی قسمت میں تارا جی لکھی تھی۔ وہ میری شدتوں کا اقرار نہ کرے لیکن کب تک؟ اس کا طرز عمل سردمہری کا تھا۔ یہ سردمہری اب ناقابل برداشت ہوئی جاتی تھی۔

جزیرہ باگمان روانہ ہونے سے پہلے ایک رات جبرائیل میرے پاس آیا تھا اور اس نے شوالا کے نائب زارے کے بارے میں یہ راز دارانہ خبر دی تھی کہ وہ مجھ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ جبرائیل سمورال زارے کسی کا پیہ نہیں تھا۔ اشار بھی غائب تھی۔ ان الجھنوں میں ایک خیال آیا کہ اقبال اور سمورال کو متوجہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے، شوالا کو مبارزت کی دعوت دی جائے۔ جزیرہ توری پر اس کا وجود میری شجاعت کی توہین ہے۔ میں نے فرار کو بلا کر حکم دیا۔ ”کاہن اعظم کو اطلاع دی جائے کہ جزیرہ توری کے ایک قبیلے کا سردار جابر بن یوسف اس سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔“ سمورال کا جواب بہت مایوس کن تھا۔ اس نے جواب میں یہ پیغام بھیجا کہ وہ جب مناسب سمجھے گا خود میرے علاقے کا رخ کرے گا۔ میں نے فرار کو دوبارہ اس کے پاس روانہ کیا کہ ”جزیرہ توری کا سردار جابر بن یوسف شوالا سے مبارزت چاہتا ہے اور بیک وقت دونوں قبیلوں کی سرداری کا خواہش مند ہے تاخیر وہ اپنے حق میں مضرت سمجھتا ہے۔“ فرار نے میرا یہ پیغام خاموشی سے سنا اور سمورال کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔ دوسری بار بھی کاہن اعظم کا جواب توقع کے خلاف تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”وہ پیغام مقدس اقبال کی بارگاہ میں پہنچا دے گا۔ جابر بن یوسف کو مقدس اقبال کے جواب کا انتظار کرنا چاہیے۔“

اس جواب کی روشنی میں میں نے اپنی جگہ صورت حال کا تجزیہ کیا۔ یہ بات صاف تھی کہ کاہن اعظم سمورال شاید کچھ مصلحتوں کے باعث مجھ سے ملنے میں پہلو تہی کر رہا ہے۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ انگریزوں سے میری واپسی کا قصراقبال میں جائزہ لیا جا رہا ہے۔ وہ درمیان کے واقعات سے یعنی انگریزوں میں میری مصروفیات سے لاعلم ہوں گے۔ کیونکہ جزیرہ انگریزوں میں ہونے والی سرگرمیاں ان سے روپوش تھیں۔ انھیں صرف یہ معلوم ہوگا کہ باغیوں کی ایک سرزمین انگریزوں میں اقبال کے دشمن جمع ہو گئے جو اس کا زوال دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ ممکن ہے انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ میں نے مجبور ہو کر ان میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور پھر میں اقبال کے خلاف ان کی مشترکہ عبادتوں اور دعاؤں میں بھی شریک ہوا تھا۔ میں نے انگریزوں کی بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ممکن ہے انگریزوں کے دوراندیش عاملوں نے کسی ذریعے سے انھیں یہ خبر پہنچا دی ہو کہ جابر بن یوسف انگریزوں کے باغیوں کی ہونے والی سازشوں میں باقاعدہ ملوث ہے۔ میں نے متعدد امکانات پر غور کیا۔ اپنے طور پر میں یہی کر سکتا تھا کہ تنہائیوں میں اقبال کو یاد کروں اور اسے اپنا دل چیر کر دکھاؤں کہ میں ایک پاک و صاف شخص ہوں۔ وہ ایک دن میرے اضطراب اور میری سچائیوں کا یقین کر لے گی اور مجھے اپنے قصر میں طلب کرے گی اس کا قصر دنیا کی خوب صورت ترین جگہ ہے کسی شخص کو اگر قصر اقبال میں کوئی گوشہ مل جائے تو دنیا میں اس سے بہتر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن اقبال کب طلبی کا حکم صادر کرے گی؟ کب؟ یہ کون جانتا تھا۔

عجب گولگوں کی کیفیت تھی۔ میں پوچھتا ہوں کیا میں خاموش بیٹھ جاتا؟ لیکن میری بے قرار طبیعت کو چین کہاں تھا؟ میں نے فرار کو بلا کر کہا کہ وہ اپنے قبیلے میں یہ اطلاع عام کر دے کہ جلد ہی ان کا سردار جابر بن یوسف توری کے دوسرے قبیلے کا سردار بننے والا ہے۔ میں نے حکم دیا کہ

جتنے لوگوں سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہی جائے، ہر طرف مشہور کر دیا جائے کہ جابر بن یوسف کے پاس تاریک برا عظم کے اعلیٰ ترین نوادر ہیں اور اس کی ساحرانہ صلاحیتیں اتنی زیادہ ہیں کہ شوالا ان کے مقابلے میں ایک لمحے نہیں ٹھہر سکتا۔ بہت جلد توری میں شوالا کے قبیلے پر اس کا غضب نازل ہونے والا ہے۔ وہ اپنے تحائف سے پوری مدد لے گا اور شوالا کی زندگی اجیرن کر دے گا۔ وہ شوالا کی خوبصورت عورتیں اپنی طاقتوں سے ادھر لے آئے گا اور وہاں سے اس سفید فام عورت فلورا کو بھی لے آئے گا جو پہلے اس کی ملکیت تھی۔ میں نے فزار کو ہدایت کہ شوالا کے قبیلے کے وہ باشندے جو اس کے ظلم و ستم سے تنگ ہیں وہ کسی بھی لمحے جابر بن یوسف کے قبیلے میں آسکتے ہیں۔ انھیں تمام تر عزت دی جائے گی۔ انھیں وسیع جھوپڑیاں دی جائیں گی۔ اور ہتھیار بنانے کا ہنر سکھایا جائے گا۔ فزار کو کے چہرے پر حیرت ہو رہی تھی لیکن یہ ایک سردار کا حکم تھا، مجھے اندازہ تھا کہ آئندہ چند دنوں میں یہ اطلاع دونوں قبیلوں کے ہر فرد کی زبان پر ہوگی اس لیے کہ دونوں قبیلوں کے مابین عارضی طور پر عام باشندوں کے آنے جانے پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔

دوسرے دن میں نے جھوپڑیوں کے درمیان بڑی گلیاں اور نالیاں بنانے کا انقلابی کام اپنی نگرانی میں شروع کر دیا۔ قبیلے کے لوگوں نے جب نمونے کی ایک نالی دار گلی بنائی تو ان کی حیرت دو چند ہو گئی۔ اس چھوٹی سے گلی میں اونچائی پر دونوں اطراف جھوپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اور جھوپڑیوں کے درمیان درخت لگانے کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی تھی بعد میں، میں نے لکڑیوں سے ان کے سامنے پہیہ بنایا اور اپنی ہنرمندی کے مطابق ایک اونگا بونگا چھوٹا سامال بردار ٹھیلہ بنالیا۔ جب انہوں نے اسے گلی میں چلایا تو وہ اچھلنے کودنے لگے۔ یہ خبر بھی میرے اندازے کے مطابق شوالا کے قبیلے میں پہنچ گئی ہوگی۔

پھر میں نے سماجی صلاحیتوں کا ایک مقابلہ منعقد کر لیا اور حکم دیا کہ روز اسی طرح کے مقابلے ہوں گے۔ میدان میں پہنچ کر میں نے خود ان مقابلوں میں حصہ لیا جب میں نے دو قوی الجیشہ نو جوانوں کو اپنے ہاتھ پر اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تو میرے قبیلے کے لوگ میری جسمانی طاقت پر ششدر رہ گئے۔ میں نے اپنے تحائف سے بھی ان کے سامنے حیرت انگیز عملی مظاہرے کیے۔

ان کوششوں کا نتیجہ چند ہی دن میں ظاہر ہو گیا۔ فزار نے مجھے بتایا کہ شوالا کے قبیلے کے کئی خاندان ہجرت کر کے ادھر آ گئے ہیں اور اسکے قبیلے میں میری بہادری اور پراسرار قوتوں کے تذکرے عام ہو رہے ہیں۔ شوالا کے قبیلے میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے کہ جابر بن یوسف باگمان میں اعلیٰ تربیت کے بعد واپس آیا ہے۔ وہ کسی دن قبر بن کر شوالا پر ٹوٹے گا۔

مجھے شوالا کی طرف سے جلد ہی کسی اقدام کا انتظار تھا کوئی ایسی حرکت جو اس کے قبیلے میں میرے داخلے کا راستہ استوار کر سکے۔ وہاں اس کی حمایت کے لیے میرا ایک حریف نربگا بھی بیٹھا ہوا تھا، جو یقیناً شوالا کو مشورے دے رہا ہوگا۔ شوالا کا نائب زارے بھی ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اسے اپنے اعتماد میں لینے کے لیے جمرال کے توسط کی ضرورت تھی اور جمرال سے ملاقات اس وقت تک ناممکن تھی جب تک کاہن اعظم اپنی اقامت گاہ سے دور نہ ہو۔

چند دن اور گزرے ہوں گے میرے قبیلے میں ہجرت کر کے آنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شوالا کا قبیلہ ایک دن

بالکل خالی ہو جائے گا۔ نئے آنے والوں کے لیے میں خود انتظامات کراتا اور میرے قبیلے کے لوگ خالی جگہوں پر روزانہ بننے والی عمدہ جھونپڑیوں میں انھیں منتقل کر دیے۔ میں روزانہ کے سامنے تقریر کرتا اور ان کے طعام میں شریک ہوتا۔ سرتینا بھی تمام کاموں میں میرے ہمراہ ہوتی، شوالا نے ہجرت کر کے جانے والوں کے لیے شدید ترین سزائیں مقرر کیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہجرت کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اتنا بڑا سیلاب روکنا اتنے لوگوں کو سزا دینا شوالا کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے کئی آدمیوں کو روک کر زندہ جلادیا لیکن میرے ساحرانہ کارناموں کی گونج شوالا کے قبیلے میں کچھ ایسے منظم انداز میں پہنچ رہی تھی کہ لوگ اپنی جھونپڑیاں چھوڑ چھوڑ کر ادھر آنے لگے۔ یہاں کوئی پابندی نہیں تھی، آزادانہ زندگی تھی۔ عمدہ جھونپڑیاں تھیں، گلیاں بن رہی تھیں۔ کاشت ہو رہی تھی۔ سردار عام لوگوں سے گھلامار ہوتا تھا۔

آنے والوں نے مجھے بتایا کہ شوالا کے قبیلے میں ہر جگہ جابر بن یوسف کی شجاعت کی دھوم ہے۔ چند ہی دنوں میں شوالا کا آدھا قبیلہ اپنے نیروں کے ساتھ ادھر منتقل ہو گیا۔ ان کی عورتیں اور بچے بھی ساتھ تھے۔ ان کی آباد کاری کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ مجھے اپنے مقاصد میں خاصی کامیابی ہو رہی تھی۔ ہاں اس بات پر حیرت تھی کہ شوالا نے کسی حماقت کا مظاہرہ اب تک کیوں نہیں کیا؟

مگر اس کے دن قریب آرہے تھے۔ ڈیڑھ ماہ بعد اس کے قبیلے میں صرف چند لوگ رہ گئے اس کے پاس زمین تھی اس کے پاس پانی تھا اس کے پاس اقتدار تھا اس کے پاس چند وفادار عورتیں اور مردہ گئے تھے۔ اس کے پاس دوست نربگ تھا مگر اس کے پاس اس کے قبیلے کے لوگ نہیں تھے۔ وہ اب محض چند لوگوں کا حکمران تھا۔ میں کاہن اعظم یا اشار کی آمد کا منتظر تھا۔ انھیں اب آ جانا چاہیے کیونکہ جابر بن یوسف نے انھیں کسی رد عمل کا اظہار کرنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اب ان کی سردمہری سرگرمی میں بدل جائے گی اور جلد ہی کوئی ہنگامہ برپا ہوگا۔ کیا اقبال جابر بن یوسف کو اب بھی نظر انداز کرے گی؟ میں لمحے گن گن کر کاٹ رہا تھا اور پوری طرح محتاط تھا کہ کوئی طلسمی نیزہ میرے سینے کے پار نہ ہو جائے اور میں حسرتیں لیے نہ مر جاؤں۔

☆=====☆=====☆

دیوانہ ابلیس

عشق کا قاف اور **پکار** جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے حیرت انگیز اور پراسرار واقعات سے بھرپور، سلفی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی ضوفشائیوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر ایک ان دیکھی دنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھولی کہانی بھی یاد دلا دی ہے کہ گمراہی اور ان دیکھی قباحتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔ **کتاب گھر پر دستیاب ہے۔**

میں انتظار کرتا رہا۔

اس کے سوا میں اور کیا کر سکتا تھا؟ میں نے انتظار کیا۔ ایک جاں سوز اور بے کیف انتظار۔ چند دن گزر گئے ان چند دنوں میں شوالا کے قبیلے کے بعض سرکردہ افراد بھی فرار ہو کر ادھر منتقل ہو گئے۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ رعایا کے بغیر بادشاہ کا کیا حال ہوگا؟ اس کی حکمرانی کے لیے درخت ہوں گے یا پتھر ہوں گے وہ معدودے چند جاں نثار جو شوالا کے ساتھ رہ گئے تھے وہ کب تک ایثار و وفا کا مظاہرہ کرتے رہیں گے؟ مغلوب الغضب شوالا کی برہمی اور کمزوری انھیں کب تک اپنے قابو میں رکھنے میں کامیاب رہے گی؟ شوالا کا نائب زارے اور اس کے گنتی کے ساتھی ابھی تک وہیں تھے۔ حالانکہ زارے کے متعلق کاہن اعظم سمورال کے فرزند جمرال نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے مضطرب ہے۔ فلور ابھی اس کے پاس تھی اور نرنگا بھی جو جزیرہ بیزار سے توری کے اس قبیلے پر حکمرانی کا خواب دیکھ کر آیا تھا۔ میں تصور میں شوالا کے شب و روز کے معمولات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ جو لوگ وہاں سے آتے تھے۔ وہ اس کے مظالم اور ناسازی مزاج کے قصے بیان کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہ شدید غضب میں مبتلا ہے وہ انگاروں پر لوٹ رہا ہے..... بادشاہ اپنے چند مہروں کے ساتھ رہ گیا تھا۔ اس کے تمام پیدل مارے گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ بادشاہ کوئی اوجھی چال چل کر بساط اللہ کی کوشش کرے گا لیکن اس نے غیر معمولی تحمل کا ثبوت دیا تھا۔

جزیرہ توری کے اس حصے میں بڑی چہل پہل تھی جہاں میری حکمرانی تھی۔ میں اس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ ہر طرف تیزی و توانائی نظر آتی تھی۔ جدھر دیکھیے ایک جوش، ولولے اور عزم کا اظہار تھا، صدیوں کی منجمد زندگی میں حرکت پیدا ہو گئی تھی۔ جھوپڑوں کے درمیان گلیوں کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ پودے سلیقے سے لگائے جا رہے تھے توری میں زمین کی کمی نہیں تھی۔ قدرت نے تاریک براعظم کے دوسرے جزیروں کی طرح اسے بھی طرح طرح کی نعمتوں سے مالا مال کیا تھا..... سبزہ پانی زرخیز زمین اور پھر میں یہاں آ گیا۔ میں ان کے لیے ایک نیا آدمی تھا، جس کی جلد سرخ و سفید تھی۔ جس کے نقش و نگار تھکے تھے اور جس کا لہجہ پرکشش اور منفرد تھا۔ ان کے مشاغل بدل گئے تھے، وہ دن بھر کام کرتے، سورج غروب ہوتا تو وہ انگڑائیں لے لے کر طلوع ہوتے، مشعلیں گلیوں میں ایستادہ کر دی جاتیں عورتیں اپنے بدن رنگ کر اٹھلاتی ہوئی باہر نکل آتیں۔ مردوں بھر کے پکڑے ہوئے جانوروں کو آگ پر لٹکا دیتے پھر ڈھول بجاتے، نقارے پٹنے پاؤں تھرکتے، شور مچتا اور وہ دیوتاؤں سے راتیں طویل ہونے کی دعائیں مانگتے۔ راتیں ڈھلنے لگتیں تو وہ نڈھال ہو کر ایک دوسرے کی آغوش میں ضم ہو جاتے۔ شوالے کے قبیلے کی ساری آبادی منتقل ہو جانے کے بعد یہاں تا حد نظر آدمی نظر آتے تھے۔ آدمی گروہ پسند ہوتے ہیں۔ ایسی زندگی کا انہوں نے تصور نہیں کیا تھا۔ یہاں ہر وقت کوئی جشن برپا معلوم ہوتا تھا۔ مجھ سے ان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جدھر میرے قدموں کی خوشبو جاتی، وہیں عورتیں زمین بوس ہو جاتیں۔ مرد اپنی چھاتیاں زمین سے رگڑتے جیسے کوئی دیوتا ان کے درمیان آ گیا ہو۔

ہر دو قبیلے کی متعین حدود کے سوا توری میں ایک ایسا علاقہ بھی تھا جہاں دونوں قبیلے کے افراد اکٹھے ہو جاتے۔ وہ مشترکہ جگہ کہلاتی تھی۔ یہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ شکار کی تلاش اور لکڑیاں اور پھل حاصل کرنے کے لیے دونوں قبیلوں کے افراد اس مشترکہ جگہ سے فائدہ اٹھاتے تھے اور واپس اپنے اپنے قبیلوں میں چلے جاتے تھے۔ اب اس وسیع عریض مشترکہ جگہ پر میرے آدمی بکھرے ہوئے تھے۔ انھیں شوالا کا خوف نہیں تھا کیوں

کہ انہوں نے میرے قبیلے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایک صبح قبیلے کی ایک بڑی تعدادی ساحل پر مچھلیاں پکڑنے میں مشغول تھی، شوالا کے چند جاں نثار جوا بھی تک اس کے ساتھ تھے، اپنے قبیلے کے ان دس آدمیوں کو پکڑ کر لے گئے جو ہجرت کر کے میرے علاقے میں آ گئے تھے۔ مجھے فوراً اس واقعے کی اطلاع دی گئی۔ اس خبر سے مجھے مسرت ہوئی لیکن میں نے اس کا اظہار قبیلے کے لوگوں پر نہیں کیا۔ میں نے انھیں خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ گویا شوالا کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ میں کسی ایسے ہی اقدام کا منتظر تھا۔

شام کے وقت جب میں سریتا کے ساتھ مہذب دنیا کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ فراروں ہانپتا کا نپتا داخل ہوا اس کی وحشت اس امر کی غماز تھی کہ وہ کوئی تازہ واردات سنانے کے لیے مناسب پیرایہ ڈھونڈ رہا ہے۔ میں نے اپنے بدن کی مالش کرنے والی لڑکیوں کو ہاتھ کے اشارے سے علیحدہ کیا اور فرارو کے ساتھ باہر آ گیا۔ باہر قبیلے کے افراد کا ایک مجمع موجود تھا، ان میں عورتیں بھی تھیں۔ ماحول پر خوف و ہراس مسلط تھا۔ میرے نمودار ہوتے ہی وہ زمین پر دراز ہو گئے۔ میں نے انھیں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ پھر..... پھر..... پھر میں کیا بیان کروں! میری آنکھوں نے بربریت و شقاوت، درندگی و سفاکی کا ایسا ہولناک منظر دیکھا جسے فراموش کرنے کے لیے حافظہ بگڑ جانا شرط ہے ایک ناتواں خوں آلوہ گروہ۔ دس افراد کا وہ مظلوم اور بد قسمت گروہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ انھیں قبیلے کے دوسرے افراد نے سنبھال رکھا تھا، ان کے کاندھے لٹک رہے تھے اور بازو جھول رہے تھے وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر کے گاہے گاہے میری طرف حسرت کی نظر سے دیکھ لیتے تھے۔ وہ مرے نہیں تھے انھیں عبرت کے درس کے لیے زندہ رکھا گیا تھا۔ شوالا نے انھیں درختوں سے باندھ کر دل سوز مظالم ڈھائے تھے۔ فرارو نے آگے بڑھ کر ان کے منہ کھول کر مجھے دکھائے ان کے دانت غائب تھے اور زبانیں کٹی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے ان کے ہاتھ دکھائے۔ انگلیاں ہاتھوں سے جدا کر دی گئی تھیں۔ سب کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”معزز سردار!“ فرارو نے میری خاموشی توڑنے کے لیے پوچھا۔ ”کیا ان کے سینوں سے نیزے پار کر کے انھیں اس تکلیف سے نجات دلا دی جائے؟“

”ہاں۔“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”لیکن سنو.....“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”انھیں زندہ رکھا جائے۔ قبیلے کے تمام لوگ ان کے لیے کام کریں گے۔“

میرے حکم پر سب نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ جزیرہ توری میں معذور لوگوں کو زندہ رکھنے کی کوئی رسم موجود نہیں تھی۔ وہ ایسے لوگوں کو مار ڈالتے تھے۔ میں نے اپنا فیصلہ اس لیے واپس لیا تھا کہ قبیلے کی آبادی کے سامنے انھیں ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ فرارو اور تمام مجمع میرا رد عمل دیکھنے اور سننے کے لیے پہلو بدل رہا ہے۔ میری خاموشی کو وہ اپنے محترم و مقدس سردار کی کمزوری اور مصلحت پر محمول کرتے، لیکن مجھے اپنے کسی رد عمل کے اظہار میں محتاط رہنا چاہیے تھا۔ یہ جو کچھ ہوا۔ قرین قیاس تھا۔ شوالا اس طرح اپنے قبیلے کے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ ان کی سزائیں اتنی شدید اور ہولناک ہو سکتی ہیں۔ مشترکہ علاقے میں آنے والے افراد کے لیے یہ ایک تنبیہ تھی کہ وہ کسی وقت بھی شوالا کے پنجہ استبداد میں جکڑ جائیں گے اور اگر وہ واپس اپنی زمین پر نہیں گئے تو شوالا کا قہر اس حد تک نازل ہو سکتا ہے۔ اس واقعے کے بعد مشترکہ علاقے میں جانے

والے لوگوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری رہتی۔ وہ شوالا کی ظالمانہ خو، ماورائی علوم پر اس کی دسترس، جادو گردی اور غیر معمولی طاقت سے بخوبی واقف تھے۔ مجھے سوچنے کے چند لمحے ملے، پھر میں نے متذبذب، بجوم کو دیکھ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے، میری پیروی میں بہت سے ہاتھ بلند ہو گئے، میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”جزیرہ توری کے لوگو! دیوتا تمہیں شادماں رکھیں۔ تم سب اب میری امان میں ہو۔ مجھے غور سے دیکھو اور یقین کرو کہ تمہارا سردار مرتبے، طاقت اور ذہانت میں تاریک براعظم کے تمام سرداروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم مشترکہ علاقے میں کسی خوف اور شک کے بغیر جاؤ۔ سمندروں سے مچھلیاں نکالو۔ درختوں سے پھل نوچو، جنگل میں عمدہ قسم کے جانوروں کو تلاش کرو۔ یہ علاقہ دونوں سرداروں کی ملکیت ہے اور یہ تمہارا علاقہ ہے۔ بہت جلد تمہیں دیوتاؤں کی طرف سے مسرت اور سرشاری کی نوید ملے گی۔ تم دیوتاؤں کی منشا کے منتظر رہو۔ وہ پر جلال ملکہ تمہاری طرف سے غافل نہیں ہے۔ اور سنو اگر دوبارہ تم پر کوئی حاوی آنے کی کوشش کرے تو تم مشترک ہو کر اس کا مقابلہ کرو۔ کیا تم اپنے سردار پر جانیں قربان کرنے سے گریز کرتے ہو جس نے تمہیں اعلیٰ جھوپڑیاں اور آسائش دی ہیں۔“

”معزز سردار!“ فرارو درمیان میں بولا۔ ”تمہارا حکم دیوتاؤں کا اشارہ ہے، لیکن شوالا کے آدمی ایسا سحر پھونکتے ہیں کہ بیٹائی معدوم ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاتھ اتنے مضبوط ہیں کہ مزاحمت بے کار ہو جاتی ہے۔ معزز سردار کو معلوم ہونا چاہیے کہ شوالا نے ایسے منتخب آدمی مشترکہ علاقے میں بھیجے تھے، جو حکم چلا سکتے ہیں۔“

”فرارو..... کیا ہمارے علاقے میں سحر پھونکنے والے لوگوں کی کمی ہے؟“ میں نے تنخی سے کہا۔ ”کیا تم اور تمہارے ساتھی چند دنوں کے لیے مشترکہ علاقے میں اپنے لوگوں کی نگرانی نہیں کر سکتے؟ اگر وہ تمہارے آدمیوں کو پکڑ سکتے ہیں تو تم ان کے بچے کچھے آدمیوں کو اپنی تحویل میں نہیں لے سکتے؟ کیا تم وہ طلسم نہیں توڑ سکتے جس پر شوالا کے آدمی حاوی ہیں؟ لوڈگی کے یہ سینک اپنے گلے میں ڈال لو۔ یہ صحرائے زارشی کا عطیہ ہیں۔“ میں نے اپنے ڈنگی کے سینکوں کا ہار اتار کر دے دیا۔ ”زارے آئے تو اسے بھی گرفت میں لے لو۔ اب شوالا کے پاس کوئی بھی رہنا نہیں چاہتا وہ موقع کے منتظر ہیں۔“

میرے مخاطب نے کچھ ایسا اثر مرتب کیا کہ قبیلے کے لوگ شور مچاتے اور اچھلتے ہوئے منتشر ہو گئے۔ وہ اپنے ساتھ معذور لوگوں کو بھی لے گئے۔ مکان میں آ کر میں نے فرارو کو حکم دیا کہ ”اُن دس بدقسمت لوگوں کو جنگل میں لے جا کر ختم کر دیا جائے کیوں کہ لوگ ان کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔“ یہ فیصلہ کر کے مجھے ایک دکھ محسوس ہوا لیکن موت ہی ان کی نجات کا سبب رہ گئی تھی۔

اس وقت توری کی منتخب حسین دوشیزائیں، سریتا کا سنگھار کر رہی تھیں، میں نے اسے دیکھا۔ اس نے شرما کا نظریں جھکا لیں کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ سریتا کس کے لیے سنگھار کرتی ہے؟ وہ اور دلکش ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے بہت کم بات کرتی تھی، بس کچھ ایسی حسرت آمیز لگا ہوں سے دیکھا کرتی کہ مجھے اپنی آنکھیں اس کی طرف سے ہٹانی پڑتی تھیں اس وقت بھی یہی ہوا۔ میں نے اسے دوسرے کمرے میں چلے جانے کے لیے کہا کیوں کہ اس کی موجودگی سے شوالا کے خونی اقدام پر غور کرنے میں مجھے تامل ہوتا۔

ہر چند کہ یہ ایک بے رحم مظاہرہ تھا مگر اس سے شوالا کی الجھن، بے چینی اور جلن کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس نے میرے انتظار کے دن اور کم کر

دیے تھے اور مجھے مزید آگے بڑھنے کے لیے موقع فراہم کر دیا تھا۔ مجھے جس بات کی توقع تھی، شوالا نے دیر سے سہی لیکن کی ضرور۔ اس نے حماقت کا ثبوت دے دیا تھا، اس کے قبیلے کی آبادی منتقل ہو جانے کے بعد مجھ میں اس سے نبرد آزمائی کی وہ شدت نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ شوالا کی اس اذیت ناک حالت سے ایک لطف محسوس ہوتا تھا۔ اب مجھے زارے کا انتظار تھا اور ان چند ساتھیوں کا جو شوالا کے ساتھ رہ گئے تھے۔ تنہا ہو کر شوالا کی سادہ لچسپ شخصیت ہو جائے گا؟ مگر وہ تنہا نہیں رہ سکتا تھا۔ فلور ابھی آخر دم تک اس کے ساتھ ہوگی اور نربگا بھی..... جزیہ بیز نارکا وہ دیو قامت شخص..... مجھے اسے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ جب فلور اور نربگا کے سوا تمام لوگ شوالا کو چھوڑ دیں گے، کیا اس وقت بھی تاریک براعظم کی حسین و جمیل ملکہ اقبال اپنے دستِ حنائی کو جنبش نہیں دے گی؟ شوالا اپنے لوگوں سے مایوس ہو کر آخر جلد از جلد مقابلے کا آرزو مند ہوگا اور کاہن اعظم سمورال کو یہ کھر آلود فضا صاف کرنے کے لیے جلوہ گر ہونا پڑے گا۔ شوالا کے خون سے میرے چہرے کا رنگ سرخ ہوگا۔ اس کی ہزیمت سے میرے اقبال میں اور بلندی پیدا ہوگی۔ کبھی نہ کبھی اس مجلس کے دریتچے واہوں گے۔ اس کے رخِ زیبا کی دید ایک ظالم اور سفاک شخص، شوالا کی جلالت اور جلد بازی پر منحصر ہے میں کہہ چکا ہوں کہ یہ خانہ خرابی، یہ فتنہ و فساد نہ میری طبیعت کے مطابق تھا نہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میں پہلے ہی دو قبیلوں کا حکمران تھا، یہ سارا کھڑاگ تو اس کی نظروں میں سرفراز ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس کا جلوہ میری سرکشی سے مشروط تھا۔ اس کا قرب میری شجاعت سے وابستہ تھا۔ میں نے یہ نکتہ پایا تھا کہ اسے حاصل کرنے کے قرائن کیا ہیں؟ ورنہ کیا تھا، ایک تہذیب یافتہ شخص ننگ ڈھڑنگ وحشیوں کے درمیان تھا، جن کے ہاں انسان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مابعد الطبیعیاتی مظاہر کی آماجگاہ جہاں قدم قدم پر خطرے ہوں، کس کے دماغ میں یہ معرکے سر کرنے کی سمائے گی۔ کوئی نہیں۔ ہمارے ساتھ آنے والے سب لوگ مر چکے تھے۔ سرنگا اپنی طاقتوں اور دیوی کی مدد سے زندہ تھا، ڈاکٹر جواد کو حکمت کے سبب سے، عورتوں کو ان کے حسن کی بنا پر رعایت ملی تھی اور مجھے اس لکھشاں بدن کی تحریک نے زندہ رکھا تھا۔

شام کے قریب جب بستی کے لوگ شکار سے لدے پھندے واپس آئے تو ان کے ساتھ زارے اور اس کے ساتھی بھی موجود تھے، فزارو نے زارے اور اس کے ساتھیوں کو گزشتہ دن کے مطابق لوگوں کو درغلالتے اور شوالا کے قبیلے کی سرحدوں کی طرف جاتے دیکھا تو ایک بڑے گروہ نے انہیں روک لیا، فزارو نے زارے کے طلسم کا رنگ چڑھنے سے پہلے ہی احتیاطی تدابیر اختیار کر لی تھیں۔ اس نے زارے اور اس کے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ وہ دورانِ ندیشی کے تحت جابر بن یوسف الباقر کے قبیلے میں آجائیں کیونکہ وہی آئندہ دنوں میں اس پورے علاقے کا سردار ہوگا۔ زارے شاید اسی دعوت کا منتظر تھا۔ وہ کچھ پس و پیش کے بعد تیار ہو گیا۔ اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی آ گئے۔ یہ آخری آدمی تھے۔ اب شوالا کے پاس نربگا اور فلور رہ گئے تھے..... ہاں، ایک اور شخص ڈاکٹر جواد۔ میں نے اپنے دروازے پر جب ان گنت آوازوں کا شور سنا تو باہر آ کر دیکھا فزارو کے قریب زارے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں اس مرد جری کے قریب گیا اور میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر شکایتی انداز میں کہا۔

”زارے! تم نے آنے میں دیر کر دی۔“

زارے نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور زمین پر اوندھالٹ گیا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میرے علاقے میں ایک لائق التفات شخص کا اضافہ ہوا ہے میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ جابر بن یوسف تمہیں فزارو کے مساوی درجہ دیتا ہے۔“

زارمے کی آنکھیں دک آنکھیں اور بجوم نے نعرہ ہائے تشوین بلند کرتے ہوئے اپنے نیزے زمین میں گاڑ دیے۔ عورتوں نے عالم جنون میں سر ہلانے شروع کر دیے۔ تو مند زارمے کی آنکھوں سے ذہانت مترشح تھی۔ وہ دوبارہ میرے قدموں پر جھک گیا۔ اٹھا تو عقیدت کے ساتھ بولا۔ ”جارا کا کاتھیں اور نفعتوں سے نوازے۔ تمہارا دل تمہارے دماغ کی طرح بڑا ہے۔ مقدس اقبال! یقیناً تمہارے دل اور ذہن کے حال سے آشنا ہو گی۔ تم اس کی نظروں میں ایک مقام پیدا کرو گے۔ ہم سب تمہارے لیے دعا گو ہیں۔ دیوتا تم پر اپنا سایہ قائم رکھیں۔“

زارمے کی آمد پر اس دن شام قبیلے میں کچھ زیادہ ہی سرمستی کا مظاہرہ کیا گیا۔ زارمے کے بیان کے مطابق شوالا آبادی کے انخلا سے سخت پریشان اور آرزوہ خاطر ہو گیا تھا۔ اسے اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے خود اٹھنا پڑتا تھا اور وہ اپنے وفادار ساتھیوں پر شک کرنے لگا تھا۔ نربگا اور وہ گھنٹوں سر جوڑ کر ایک دوسرے سے مشورے کرتے تھے۔ نربگا ہی نے شوالا کو غلبت سے باز رکھا تھا۔ زارمے کا خیال تھا کہ نربگا میں دیوتاؤں سے قرب رکھنے کے لیے اعلیٰ اوصاف موجود ہیں۔ اس نے شوالا کی موجودہ ذہنی کیفیت کی ایک بات مجھے تفصیل سے بتائی۔ اس کے قبیلے میں زارشی سے میری واپسی کا چرچا بڑی شدت سے کیا گیا تھا۔ باگمان میں میری سرداری کی خبر سے بھی شوالا کو دھچکا پہنچا تھا۔ فلورا کو آج بھی اس کی پسندیدہ عورتوں میں سب سے ممتاز درجہ حاصل تھا۔ زارمے نے بتایا کہ وہ خاموش اور غم زدہ سی رہتی ہے۔ شوالا اس سے جھجکتا اور ڈرتا ہے۔ اس نے نربگا سے اپنے اس نادر تحفے کا تعارف کرایا تھا اور مہمان نوازی کے طور پر کتنی ہی راتیں فلورا کو اس کے پاس بھیجا لیکن نربگا ہمیشہ شوالا سے شکایت کرتا رہا کہ فلورا نے اس کے ساتھ شب بسری سے انکار کر دیا تھا۔ شوالا بہر فلورا کو نربگا کے پاس نہیں بھیج سکتا تھا کیونکہ مجھ سے شکست کھانے کے بعد فلورا نے اپنی مرضی سے شوالا کے پاس رہنا پسند کیا تھا۔ زارمے شوالا کی تمام کمزوریوں، خامیوں، خوبیوں اور طاقتوں سے واقف تھا۔ اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے فلورا کا ذکر بطور خاص کیا۔ اور فلورا کا ذکر کر کے اس نے مجھے اداس کر دیا۔ کون جانتا تھا کہ اس گویا نایاب کے حصول میں میں نے کیا کیا انقلاب دیکھے تھے؟ فلورا اب کیسی ہو گئی ہوگی؟ کیا اس کے شہابی رخسار اب بھی دکھتے ہوں گے؟ اس کی غزالی آنکھیں اب بھی چمکتی ہیں؟ کیا اس کے سانسوں سے اب بھی خوشبو آتی ہے؟ وہ حسین گجر ایک کر یہ صورت وحشی کے گلے میں لٹکا ہوا ہے۔ یہ کیسا تماشا ہے؟ مگر فلورا اب میرے پاس آ بھی جائے گی تو کیا ہوگا وہ میرے لیے بڑی اجنبی ہوگی۔ میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ جب وہ یہ خیال کرے گی کہ جابر بن یوسف نے اس کا خیال ترک کر کے کسی اور آستانے پر سر نیاز خم کر دیا ہے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ مگر اسے کیا اندازہ کہ جابر بن یوسف کا دل اپنے قابو میں کب رہا ہے۔ اس پر تو کسی اور کا سایہ ہے۔ وہ تو ظلم میں گرفتار ہے۔ اس کے پاس شعور کہاں ہے؟

زارمے کی آمد کے دوسرے دن اچانک ڈاکٹر جواد میرے قبیلے میں آ گیا۔ اسے نہایت عزت سے میرے روبرو پیش کیا گیا۔ مجھے اس شخص سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس نے سربیتا پر ہاتھ اٹھایا تھا حالانکہ وہ میرے ان ساتھیوں میں شامل تھا جو اس سحر خانے میں اسیر ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر جواد نے اپنی دنیا کی ایک بدنصیب لڑکی کا خیال نہیں کیا تھا تو میں اسے پہلو میں کیوں نشست دیتا۔ ڈاکٹر جواد ایک طبیب تھا اور طبیعوں کو توری میں عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے اس لیے میں اسے آسانی سے نہیں نکال سکتا تھا۔ یقیناً وہ کسی سردار سے بالائیں تھا، میں نے اس سے درشت لہجے میں پوچھا ”تمہاری آمد کا مقصد کیا ہے؟“

”سیدی جابر! میں ڈاکٹر جواد ہوں، تمہارا ساقی۔“ اس نے اشتیاق سے کہا۔

”میں تمہارے نام سے واقف ہوں لیکن مہذب دنیا کے رشتے توڑنے میں تم نے خود ہی پہل کی تھی۔ تم نے اپنے دوست سرنگا کی لڑکی سریتا کا بھی خیال نہیں کیا۔۔۔۔۔۔ میں، میں تمہاری کوئی اعانت نہیں کر سکتا۔“

”میں تم سے شرمندہ ہوں، جابر بن یوسف! تمہیں معلوم ہے میری ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اب میں ہوش میں آیا ہوں مجھے ندامت کرنے کو بہت دن مل گئے تھے۔“ ڈاکٹر جواد لجاجت سے بولا۔

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“ میں نے خفگی سے پوچھا۔

”میں تمہارے قبیلے میں رہنا چاہتا ہوں، تم نے ذہانت اور تدبیر کا جوشاںدار مظاہرہ کیا ہے، میں تمہیں اس کی داد دینا چاہتا ہوں شوالا کو اس باختہ ہے۔ وہ شدید اذیت اور خفتان میں مبتلا ہے۔ تمہارے ہاں ایک شخص کی کمی ہے۔۔۔۔۔۔ میری۔۔۔۔۔۔ میں ایک بڑا طبیب ہوں۔“ ڈاکٹر جواد

نے خوشامداند انداز میں کہا۔ ”میں نے یہاں کی جڑی بوٹیوں پر تحقیق کی ہے اور یہاں کے طریقہ ہائے علاج سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ کیا تم اپنے باکمال دوست کو معاف کر کے اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرو گے؟“

”تم بے اعتبار شخص ثابت ہو چکے ہو۔“ میں نے کہا

”تم مجھے ایک موقع دو۔ میں اپنا اعتبار بحال کروں گا۔“

”جاؤ۔ تو پھر کسی جھوٹے پڑی میں مقیم ہو جاؤ اور میرے سامنے کم سے کم آیا کرو۔ تمہیں عورتوں کی ضرورت ہو تو تم ان کی مرضی سے انھیں حاصل کر لو۔“

”میں اپنے دوست کو سلام کرتا ہوں۔“ جواد نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

”شوالا کیا حال ہے؟“ وہ جانے لگا تو میں نے پوچھا۔

سیدی! شیر زخمی ہو گیا ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

”تو وہ کب آبادی کی طرف بڑھے گا؟“ میں نے پوچھا

”بہت جلد۔ اب وہاں کیا رہ گیا ہے؟ وہ سفید چڑیا ابھی تک اس کے پنجرے میں ہے۔ کچھ دن بعد تمہارے پنجرے میں آ جائے گی۔“

”نرنگا کیا کہتا ہے؟“

”وہ میری طرح کہیں محفوظ مقام پر جانے کے بہانے سوچ رہا ہے۔“

ڈاکٹر جواد بھی آ گیا تھا، اس کی خوشامداند باتوں کے باوجود اس کی طرف سے میرے نہاں خانہ دل میں ابھی تک گرد جمی ہوئی تھی۔ اب سارا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اگر اب بھی کاہن اعظم سمورال یا اقبال کا فرستادہ نہیں آیا تو کیا شوالا کی حرکت قلب بند ہو جانے کے بعد آئے گا۔ میں سمجھتا تھا، کسی کو اس وقت سے پہلے آنا چاہیے تھا، اس وقت جب لوگ ادھر سے ادھر منتقل ہو رہے تھے۔ وہ اس وقت نہیں آئے تو پھر انھیں اس کے بعد اس

طرف توجہ دینی چاہیے تھی۔ اگر وہ اس مرحلے کے بعد بھی نہیں آئے گا تو پھر اس کا یہ مطلب ہے کہ مجھے اپنی فکر کا رخ بدلنا ہوگا۔ مجھے بہت سے انڈیشوں کے بارے میں غور کرنا چاہیے۔ جزیرہ انگرودا سے میری واپسی کو قصر اقبالہ میں پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا گیا میں ایک مشکوک شخص ہوں۔ اقبالہ نے جزیرہ انگرودا کے عالموں کی رائے کے مطابق میرے ساتھ مغائرت کا سلوک کیا ہے۔ اس کی نظروں میں اتنی شدتوں اتنے جذبوں کی کوئی وقعت نہیں ہے کیوں کہ مجھ سے پہلے بہت سے ایسے جذبات کا اظہار کر چکے ہیں اور نا کام ہو گئے ہیں۔ اس کا حصول اس کا قرب ناممکن ہے۔ میں نے ایک بوٹا شخص ہوں، میری بساط اس عظیم طلسم کدے میں کیا ہے؟ میں نے زارشی، باگمان اور انگرودا میں علم و فضیلت کے جو اسباق یاد کیے ہیں، وہ بڑے ابتدائی ہیں..... مجھے اپنے متعلق سوچنا ہوگا۔ مجھے سرنگا کے پاس جانا چاہیے اور اس سے کوئی مشورہ لینا چاہیے۔ سرنگا زندہ ہے تو تنہائی کا احساس جاتا رہے گا۔ میں سرنگا کے پاس نہیں گیا، میں نے سوچا، مجھے کچھ دن اور انتظار کرنا چاہیے شوالا سے مبارزت کے لیے میں کاہن اعظم کو پہلے ہی دعوت دے چکا ہوں۔

قبیلے کی زندگی میں بڑا جوش تھا۔ اب ان کے ہاں چھ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ کب شوالا ادھر کا رخ کرتا ہے اور جابر بن یوسف کے قدموں میں لیٹ کر اپنی شکست کا اعتراف کرتا ہے۔ زارے اور فرزارو اصل میں قبیلے کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ میرا زیادہ وقت تو اپنے مکمل کی دید کے اشتیاق و انتظار میں گزرتا تھا۔ میں تو ایک پاگل شخص تھا۔ میں عربی کے مشہور شعر گنگنا تھا اور سرتا کو ان کے معانی سناتا تھا۔ وہ شرم جاتی تو میں اس کے رخسار کی چٹکی لے لیتا۔ اب بھی میری راتیں ویران تھیں۔ دوسرے کمرے میں حشر بداماں سرتا تھی۔ اس کمرے میں میری ایک ہوس ناک آواز کی بے شمار دوشیزائیں منتظر رہیں، لیکن یہ ایک امتناع تھا۔ ایک ضد..... ایک امتحان جو میں نے خود اپنے آپ مسلط کیا تھا۔ ہاں میں سرخ و ترلیوں کو دیکھتا تو مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ میرے پاس چشمے بہہ رہے تھے اور میں کنارے کھڑا انھیں حسرت سے دیکھتا تھا۔ میرے لوگ میری اس کنارہ کشی اور ضبط پر حیران تھے۔

ان سردوبے کیف دنوں میں چند دنوں کا اضافہ کر لیجئے۔ ہر لمحے کسی کی آہٹ کا انتظار تھا اور دن گزرتے جاتے تھے۔ میرے ارد گرد مایوسیاں پھیل رہی تھیں نہ شوالا کی طرف سے کوئی خبر ملتی تھی اور نہ ہی اس آتش نفس کی طرف سے کوئی پیغام موصول ہوتا تھا، میں نے ایک دوبار کاہن اعظم سے ملاقات کے لیے زارے کو بھیجا لیکن اس نے کوئی امید افزا جواب نہیں دیا۔ پھر میں نے تاریک براعظم میں پھیلے ہوئے جزیروں اور زربگا کے متعلق زارے اور فرزارو سے معلومات حاصل کرنی شروع کیں۔ وہ ایک کے بعد ایک جزیرے کا نام لیتے تھے جہاں آبادی کی منتقلی خاص احکام کے تحت عمل میں آئی تھی۔ بڑے سردار اور وہ لوگ جنھیں سرداروں نے یا اقبالہ نے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا ہے، وہی ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے جا سکتے تھے۔ چنانچہ بہت سے نام انھیں خود معلوم نہیں تھے۔ زارے اور فرزارو کے خیال میں ساری دنیا انھی جزیروں پر مشتمل تھی، اور اقبالہ کا نکات میں سب سے افضل مقام پر فائز تھی جو علاقے اس کے زیر نگین نہیں تھے، وہ کسی اور کائنات سے تعلق رکھتے تھے۔ میں کسی اور دنیا سے تعلق رکھتا تھا، کائنات اور دنیا وہ ایک ہی معنی میں استعمال کرتے تھے۔ اقبالہ ایک لافانی حقیقت ہے، جب تک دیوتا خوش ہیں وہ موجود ہے، نسل در نسل وہ اس کا نام سننے آئے تھے اسے ایسی طاقتیں دیوتاؤں نے ودیعت کی ہیں، جو دیوتاؤں سے مختص ہیں۔ وہ ایک بڑی ساحرہ ہے۔ اس کا حسن لازوال اور

ساری دنیا میں لاغابی ہے۔ زارے اور فرار و نہایت عقیدت سے اس کی صفات بیان کرتے رہے۔ جزیرہ بیزنار کے متعلق انہوں نے یہ دلچسپ انکشاف کر کے مجھے استعجاب میں ڈال دیا کہ وہاں سلطنت اقبالہ کی سب سے حسین عورتیں موجود ہیں اور وہ علاقہ، خوب صورتی میں سب سے اعلیٰ ہے۔ انہوں نے آج تک اس جزیرے پر قدم نہیں رکھا تھا لیکن لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ وہ جزیرہ حسن اور دلکشی کے اعتبار سے ممتاز ترین ہے۔ تاریک براعظم کے بیش بہا عجائب اور نوادراں اس جزیرے پر موجود ہیں۔ جزیرے کا سردار نرنگا کا بھائی ارمیگا ہے۔ اس کی طاقت و ساحری کے قصے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ وہاں تاریک براعظم کا سب سے بڑا ساحر جالموش بھی رہتا ہے، لوگوں کا کہنا ہے کہ جالموش ایک طویل زمانے سے زندہ ہے روایت ہے کہ جالموش کو مقدس اقبالہ کا قرب حاصل ہے وہ جزیرے میں ایک علیحدہ مقام پر رہتا ہے۔ وہ ارمیگا کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہوتا اور ارمیگا اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔

جزیرہ اسمار میں عورتوں کی حکومت ہے، دوسرے جزیروں کی طرح وہاں عورتوں کو مردوں کے حصول میں طاقت کا مظاہرہ کرنے کی آزادی ہے۔ وہاں کے قوانین عجیب و غریب اور سخت ہیں۔ بزرگ کہتے ہیں کہ جزیرہ بیزنار کے ایک شخص نے ایک بار ان عورتوں سے ان کی حکومت چھین لینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ان کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

”کیا ان جزیروں پر عام آدمی کو جانے کی اجازت نہیں ہے؟“ میں نے یہ حیرت انگیز حقائق سن کر پوچھا۔

”اگر دونوں سرداروں کے مابین کوئی ایسا سمجھوتا ہو جائے تو اجازت ہے۔“ زارے نے جواب دیا۔

”کیا سرداروں کی معرکہ آرائی کے علاوہ ان کے عام لوگ آپس میں جنگ و جدل نہیں کرتے؟“

”اگر مقابلے کے لیے بات طے ہو جائے تو قبیلہ آپس میں لڑنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔“ فرارو نے کہا۔

فرارو اور زارے کی معلومات محدود تھیں۔ میں اس سے پہلے بھی یہ حکایات سن چکا تھا لیکن میں نے کبھی یہ حقائق درخور اعتنا نہیں سمجھے تھے۔ ان مایوس کن لمحات میں دوسرے جزیروں کی تفصیل سن کر مجھے اپنے قد کا اندازہ ہوا۔ میرا قد وسیع و عریض سلطنت اقبالہ کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ میں تو کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس پر میرا یہ غمزہ تھا کہ میں ان سب میں ممتاز اور جلیل ہوں مجھے آندھیوں نے گھیر لیا۔ اس کے قرب کی تمنا میں عمر صرف ہو جائے گی۔ انگریزوں میں سب سے خوب صورت اور عافیت کا علاقہ تھا۔ وہاں آزادی تھی۔ وہاں نیشا اور کیشا تھیں۔ وہاں داناؤں۔ عالموں اور ساحروں کا ایک اژدہا م تھا، جن کے ہاں ہر فرد کی اہمیت تھی۔ وہ جنت نظر تھا، میں اس بیابان میں کیوں آگیا؟

شاید وہ سچ کہتے تھے، اسے میرے بارے میں غور کرنے کی فرصت کہاں ہوگی؟ سلطنت کے کتنے ہی شخص اس کے لمس جاوداں کے امیدوار ہوں گے۔ اس کا حسن ایک سحر ہے اس سحر میں سب گرفتار ہیں۔ انھی میں ایک میں بھی ہوں۔ میری جلد کا رنگ مختلف ضرور ہے۔ میرا لہجہ فصیح ضرور ہے۔ میرے اطوار شستہ ضرور ہیں لیکن میں بہت پیچھے کھڑا ہوں، آہ جابر بن یوسف الباقتر تہارے سر کو کیا ہو گیا ہے؟

ابتلا و کشمکش کے ان ایام میں کوئی فیصلہ کرنے کے لیے میں نے کاہن اعظم سورال کی خدمت میں مختلف قسم کے پیغامات بھیجے۔ کبھی میں نے کہا، میں اپنے دوسرے قبیلے باگمان واپس جانا چاہتا ہوں۔ کبھی میں نے بیزنار کے سردار ارمیگا سے مقابلہ کرنے کی درخواست بھیجی، کبھی میں نے سوالا کے باب میں اس سے غلت کا مطالبہ کیا، کبھی اقبالہ کے حضور اپنی حاضری کا اشتیاق ظاہر کیا، زارے میرا پیغام بر تھا۔ وہ میری اطلاع کے مطابق

خانوادہ سمورال سے قریب تھا۔ ان پیغامات کے جوابات کے لیے وقت کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ صورت حال میں سرمو فرق نہیں آیا اور میں اپنے دل میں ہزاروں اندیشے پرورش کرتا رہا اور تنہائیوں میں سنگ دل اقبال سے باتیں کرتا رہا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس کی سماعت بڑی حساس ہے۔ ڈاکٹر جواد نے قبیلے میں ایک شائستہ زندگی شروع کر دی تھی وہ طبی فرائض کے علاوہ قبیلے میں تعمیری طور پر انجام دی جانے والی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگا تھا۔ وہ شام کو عموماً گلیوں میں نظر آتا، جہاں شراب اور حسن کے سوتے پھوٹ پڑتے تھے۔ وہ اکثر میرے مکان میں بھی چلا آتا اور گزشتہ زندگی کی یادیں تازہ کیا کرتا، میں نے محسوس کیا کہ وہ سرتیلا سے نظریں چراتا ہے۔

☆=====☆=====☆

قلمکار کلب پاکستان

﴿..... اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟

☆..... آپ اپنی تحریریں ہمیں روانہ کریں ہم ان کی نوک پلک سنوا دیں گے۔

﴿..... آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون و کہانیاں لکھتے ہیں؟

☆..... ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔

﴿..... آپ اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟

☆..... ہم آپ کی تحریروں کو دیدہ زیب و دلکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

﴿..... آپ اپنی کتابوں کی مناسب تشہیر کے خواہشمند ہیں؟

☆..... ہم آپ کی کتابوں کی تشہیر مختلف جرائد و رسائل میں تبصروں اور تذکروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

اگر آپ اپنی تحریروں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟

تو..... ہم آپ کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتے ہیں۔

مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

قلمکار کلب پاکستان

0333 222 1689

qalamkar_club@yahoo.com

ایک ترختی دو پہر کو مجھے اپنے کمرے میں اطلاع دی گئی کہ کاہن اعظم سمورال میرے قبیلے کی طرف گامزن ہے۔ مجھے اس پر یقین نہیں آیا، میں نے اپنے سینے پر نظر ڈالی، دیوتاؤں کے نوادر تیزی سے سجائے، سریتا نے میری مدد کی۔ میں نے حکم دیا کہ کاہن اعظم کو ایک جلوس کی شکل میں یہاں لایا جائے۔ حکم کی دیر تھی۔ اچانک نقارے پٹنے لگے اور لوگ ایک جگہ جمع ہو کر کاہن اعظم کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ میں سج سجا کر بیٹھا تو سریتا نے اپنی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کی۔ کاہن اعظم کی اچانک آمد سے جمود و سکوت کی یہ فضا ٹوٹنے والی تھی۔ چند لمحوں بعد ڈھول تاشوں کی گونج قریب آتی گئی۔ میں اس کی پذیرائی کے لیے باہر آ گیا۔ توری کی ساری آبادی اکٹھی ہو گئی تھی۔ صرف وہ لوگ ان میں شامل نہیں تھے جو شتر کے علاقے میں شکار کو گئے تھے۔ فزارو اور زارے راستہ بناتے ہوئے سمورال کو لارہے تھے۔ دور سے مجھے اس کی جھلک نظر آتی۔ میں ایک عرصے بعد سمورال کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے جھک کر اپنے انداز میں اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ سمورال کے چہرے پر فکر کی لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے میری طرف حیران کن نظروں سے دیکھا۔ میں اس کی نگاہیں محسوس کر رہا تھا جو بار بار میرے سینے پر آراستہ تحفوں اور خاص طور پر شپالی اور ڈنگی کے سیٹگوں کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ سمورال کے چہرے پر ہمیشہ ایک پروقار سنجیدگی چھائی رہتی تھی مگر اس وقت وہ عجیب تذبذب کے عالم سے دوچار تھا۔ شاید اس کی نظریں میرے تحفوں کی قدر و قیمت کا اندازہ کر رہی تھیں۔ شاید وہ میری شجاعت، بلند ہمتی کے ایقان کا اعادہ کر رہا تھا۔ میں سمورال کے تذبذب سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ فزارو اور زارے سمورال کی پشت پر ہاتھ باندھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ میں نے مخاطب میں پیش قدمی کی۔

”آؤ..... آؤ..... جزیہ توری کے مقدس کاہن! ایک عرصے بعد میں کاہن اعظم کو خوش آمدید کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔ کاہن اعظم نے میرے متعدد پیغامات کے جواب میں یہاں آ کر میرا اقبال بلند کیا ہے۔ میں اس عزت کے لیے اس کا شکر گزار ہوں میں شدت سے تمہارا منتظر تھا۔“

سمورال کی روایتی سنجیدگی واپس آ گئی۔ اس نے خشک نظروں سے مجھے گھور کر دیکھا پھر سپاٹ اور بے جان آواز میں مخاطب ہوا۔

”جابر بن یوسف تمہارے سینے پر آراستہ یہ نوادر تمہاری ہمت، شجاعت اور ذہانت کی نشانیاں ہیں، تمہاری کامیاب واپسی تمہاری باطنی خوبیوں کی افزائش کی ضمانت ہے۔“

”حوصلہ افزائی کے یہ چند جملے میرے لیے کسی نادرا انعام سے بھی زیادہ ہیں۔ مجھے اجازت دی جائے تو میں کچھ جسارت کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں اس وقت تمہارے ذہن میں بیٹھا ہوں۔“

”میں کاہن اعظم سے خصوصی قرب اور اپنے نوادر کی رعایت سے یہ پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ کیا ایسے شخص کو جسے خود بالائی طاقتوں نے کسی مہم پر روانہ کیا ہو، اسے کامیاب واپسی پر حوصلہ افزائی میں نخل کا شکوہ ہو تو وہ کس سے فریاد کرے۔“

”مجھے تمہارے سامنے وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔“ کاہن اعظم نے کہا۔

”بے شک۔ لیکن شکایت الزام اور جرم سے علیحدہ ہوتی ہے۔ میں اسے اپنا حق سمجھتا ہوں۔ میں نے اس علاقے میں ہمیشہ اس کی وفا داری نبائی ہے۔“

کاہن اعظم سمورال نے مجمع کو اشارہ کیا، وہ سب لوگ اُلٹے قدموں واپس ہو گئے اور میں اسے اپنے مکان پر لے آیا۔ سریتا دوسرے کمرے میں چلی گئی زارے اور فرزارو بھی باہر رہ گئے۔

”تمہاری شکایت کا کوئی جواز نہیں۔ کیوں کہ تم اس طلسمی نظام کے صرف آلہ کار ہو جو مقدس اقبال کے اشاروں کا مطیع ہے۔ تمہیں اپنی آخری سانسوں تک اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔“ سمورال نے کہا۔

”یہ بے کیف انتظار؟..... کیا میں کوئی درخت ہوں، کیا کوئی پتھر ہوں؟ آہ سمورال، جزیہ توری کے مقدس کاہن تمہیں انسانوں، درختوں اور پتھروں میں کوئی فرق کرنا چاہیے۔“ میں نے بے زاری سے کہا۔

”تم اس کے سامنے ایک درخت ہو، ایک پتھر ہو۔ کیا اس کی نوازشوں میں تمہیں کوئی شبہ ہے کہ اس نے اس درخت کو اونچائی عطا کی اور اس پتھر کو پہاڑ بنا دیا۔“

”میں اس کے قصر کا کوئی تنکا اور اس کی دیواروں کا کوئی کنکر بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اس جام کی شکل دی جائے۔ جو اس کے احمریں ہونٹوں سے مس ہوتا ہے۔ کاہن اعظم کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے اس فضیلتوں کی بے پناہ خوشی ہے؟ نہیں یہ تمہارا گمان ہے۔ میں نے یہ صعوبتیں اس لیے اٹھائی ہیں کہ میں اس کے قرب کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنے اندر شدتیں سیٹتے ہوئے کہا۔

سمورال کی نظروں میں ایک کیفیت پیدا ہوئی ہے جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ اس نے موضوع بدل دیا۔ ”میں ہریکا کی یہ آنکھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”بہد شوق۔“ میں نے اپنے قریب رکھا ہوا وہ پتھر اسے دے دیا۔ وہ اسے بغور دیکھتا رہا۔ ”یہ ہریکا کی آنکھیں ہیں۔“ میں نے کسی قدر فخر سے کہا۔ جو سمندروں میں ہونے والی نقل و حرکت دیکھنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ کاہن اعظم! میں نے ہریکا کا مغز کھایا ہے۔ میں نے اسے زیر کیا ہے۔ تم میرے اتالیق بھی ہو۔ کیا تم میری روداد سننا پسند کرو گے؟“

اس نے ہریکا کا پتھر مجھے واپس کر دیا۔ ”شاید کبھی۔“

”کیا تمہیں انگریزوں کے باغیوں کی سرکشی کا علم ہے؟“ میں نے تیزی سے کہا۔

”اس گفتگو کا یہ محل نہیں۔“ کاہن اعظم نے نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ ”جو چیزیں تمہارے ادارک و احساس سے ماوراء ہیں ان کا تذکرہ میری اجازت کے بغیر مت کرو۔“ اس کے لہجے میں اب بھی کوئی التفات نہیں تھا۔

”میں اپنے پیغامات کے جوابات جاننے کا خواہش مند ہوں، کیا اب بھی قصرا اقبال تک میری رسائی میں کوئی امر مانع ہے؟“

”وہ تمہیں کسی دن طلب کر لے گی۔“

”یہ تم نے کیا کہا؟“ میں ناراضی سے بولا۔ ”آہ کاہن اعظم میری جوانی کے قیمتی دنوں کا حساب لگایا جائے تو وہ اسی کے تصور میں بسر ہو گئے۔ میں نے خود کو کئی بار پاگل کا خطاب دیا۔ کیا اتنی شدت کے بعد بھی یہ قلب کسی اور کے خیال سے آلودہ ہے؟“

”اس سرزمین پر صرف وہ ہے۔ تم نے محض اس کے بارے میں شب و روز سوچ کر کوئی نقصان نہیں اٹھایا ہے۔ ایک اجنبی سعاد توں سے شاد کام ہوا ہے۔ تمہیں یہاں کی زمینوں اور انسانوں کا مختار بنایا گیا ہے۔ کیا یہ کم ہے؟“ کاہن اعظم کے لہجے میں ترشی تھی۔

”مگر..... مگر تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے؟ کیا میں اظہار پر قادر نہیں ہوں؟ کیا تمہاری ساحرانہ بصیرتیں ماند پڑ گئیں؟ تم میرے اندر کیوں نہیں جھانکتے۔ تم یہ بے اعتنائی کیوں برتتے ہو؟ کاہن اعظم تم اس کے اور میرے درمیان وسیلہ ہو۔ میرے جذبے اس تک منتقل کر دو، اس سے کہو کہ صرف ایک بار حسرتیں پوری کر لینے دے، اس کے بعد وہ میرا نام و نشان مٹا دے۔“ میں نے جذبات میں ڈوب کر کہا۔

”آہ جزیرہ توری کے سادہ دل سردار!“ سوال نے باوقار لہجے میں کہا۔ ”شجاعت کے کھیل دکھا، معرکے سر کر، آسمان تجھ پر مہربان ہے، زمین تیرے قدم سے دہل جاتی ہے۔ یہی باتیں اسے پسند ہیں کیا عجب ہے کہ جس کی متناسب کرتے رہے تو اس لذت لامحدود سے آشنا ہو جائے اور کیا عجب کہ تو ایک بڑے تلاطم کا سبب بن جائے۔“

”میں دھوم مچا دوں گا۔ مشرق تا مغرب میرا نام زمین پر ثبت ہو جائے گا مگر تمہیں میرا عرفان ہے کہ ہوں اقتدار میری سرشت میں نہیں ہے۔ بس تم سے میری درخواست ہے کہ میری تربیت کرو، تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے فاضل اتالیق کا ایک قابل فخر شاگرد ثابت ہوں گا۔“ تم مجھے جہاں کی جگہ سمجھو اور مجھے سب سے پہلے شوالا کو زیر کرنے کا موقع دے کر توری کے دونوں قبیلوں کا حاکم بننے میں مدد دو۔“

”جابر بن یوسف! سردست تم میری نظر میں ایک فریق ہو۔ جب تک شوالا کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ میری ہمدردیاں منقسم ہیں۔“

”کیا تم اب بھی شوالا کے بارے میں کوئی اعلان نہیں کرو گے؟ اس وقت تمہاری آمد کا مقصد توری میں میری واپسی اور حکمرانی کی توثیق ہے یا میری متعدد پیغامات کے جواب کے ذیل میں تم کچھ کہو گے؟“ میں نے بے چینی سے کہا۔

”میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ شوالا سے مقابلے کی درخواست قبول کر لی گئی ہے۔ شوالا نے بھی آمادگی کا اظہار کر دیا ہے۔“

”اوہ۔“ میں مسرت سے اچھل پڑا۔ میرے محترم کاہن۔ اور یقیناً وہ بھی حسب سابق مقابلے کے روز بہ نفس نفیس رونق افروز ہوگی؟ وہ جو طلسم و افسوں کی اس سرزمین کی کلید ہے۔“

”ممکن ہے وہ شجاعت کا یہ مظاہرہ دیکھنا پسند نہ کرے۔“

”میں اسے دکھاؤں گا کہ میں کتنی توانائی کی قدرت رکھتا ہوں۔ میرے ہاتھوں میں کتنا پتھر اور فولا ہے۔“ میں نے جوش سے کہا۔

”جابر بن یوسف۔“ کاہن اعظم چبھتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”نیکیاں تمہاری راہبر نہیں ہیں۔ تمہارا حافظہ کمزور ہے۔ تم ابھی اس سرزمین پر اجنبی معلوم ہوتے ہو۔“

میں اس کی معنی خیز گفتگو کا مفہوم سمجھ گیا۔ ”ہاں مقدس کاہن! تمہارا قیاس درست ہے۔ توری میں آکر میں باگمان، زارشی اور انگروما کا ایک

شجیع اور متحرک شخص نہیں رہا۔ میں نے یہاں واپسی کے بعد اپنی تعلیم تربیت اور جادوئی اسرار سمجھنے اور دوسرے کمالات سیکھنے پر اس لیے توجہ نہیں دی کہ میرے ارد گرد تذبذب اور کش مکش کی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ میرا خیال تھا۔ میری واپسی بہت بڑا واقعہ ہے۔ مجھے اعزازات سے نوازا جائے گا۔ لیکن جودن گزارتا رہا وہ مجھ پر اندیشے مسلط کرتا رہا۔ پھر میں نے خیال چھوڑ دیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ تمہاری دل خوش کن آمد کے بعد یہ سیاہ پردہ چاک ہوا ہے۔ اب میں یہ سوچنے کا حوصلہ رکھتا ہوں کہ مجھے شک سے بالاسمجھا گیا ہے۔“

کاہن اعظم سمورال نے مجھے اطلاع دی کہ تین دن بعد شوالا سے مقابلہ منعقد کیا جائے گا چلتے چلتے اس نے یہ مژدہ بھی سنایا کہ مقدس اقبال نے سرنگار پر عائد شدہ بندشیں اٹھالی ہیں۔

میں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ چوم لیا اور اقبال کی تعریف و توصیف میں اپنے بیان کا کمال دکھانے کے بعد اسے جلوس کی شکل میں رخصت کر دیا۔ میں بھاگا ہوا اندر آیا اور میں نے سرتیا کو کمر سے اٹھا کر یہ خبر سنائی کہ سرنگار آبادی میں واپس آ سکتا ہے۔ سمورال کے جانے کے بعد جس تندرختلاج اور انتشار کی کیفیت ختم ہو گئی۔ سمورال مبہم الفاظ میں بہت سی معنی خیز باتیں کہہ گیا تھا۔ اسی وقت قبیلے میں شوالا سے مبارزت کا اعلان کر دیا گیا اور قبیلے کی آبادی جارا کا کی عبادت میں سر بسجود ہو گئی۔ مجھے شوالا کی یہ بہادری کی اداسند آئی کہ اس نے خود کشی کرنے کے بجائے مقابلے کو ترجیح دی۔ وہ عزت کی موت مرنا چاہتا تھا اور میں اسے اس سے محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مقابلے میں اقبال کی موجودگی کا امکان قوی تھا۔ اس کے سامنے میں اپنے اپنی بازوؤں کی نمائش کر سکتا تھا۔

اسی وقت میں قبیلے کے ایک بہت بڑے گروہ کے ساتھ سرنگار کے غارتگ گیا۔ میں نے گروہ کو ایک خاص مقام پر ٹھہرا کر غار میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ مجھے حسب سابق دشواری پیش آئی۔ مگر شپالی نے میرا کام آسان کر دیا۔ سرنگار بے حس و حرکت بیٹھا اپنی عبادت میں مصروف تھا۔ دیوی کی مورتی اس کے سامنے رکھی تھی۔ چراغ کی روشنی میں اس کا چہرہ بے حد بھیانک نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی لیکن اس نے میری مسلسل ترغیوں کا کوئی اثر نہیں لیا۔ میں نے بڑھ کر مورتی اس کے سامنے سے ہٹائی۔ اس کا انہماک ٹوٹ گیا۔“ سرنگار میرے محترم دوست چلو چلو۔“ میں نے جوش مسرت سے کہا۔“ تمہاری بندشیں ختم کر دی گئی ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔“

سرنگار اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی چمک نمودار نہیں ہوئی۔“ سیدی جابر ابھی میں نہیں جاسکتا۔“ اس نے مخمور لہجے میں کہا جیسے وہ نشے میں ہو۔

”کیوں؟ سرتیا تمہیں یاد کرتی ہے اور سنو۔“ میں نے رازداری سے کہا۔“ شوالا سے تین دن بعد مقابلہ ہونے والا ہے، کیا تم اس میں شریک نہیں ہو گے؟“

”سمجھا کرو سیدی ابھی میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔ سرتیا کو پیار کر لینا۔“ سرنگار نے مورتی میرے ہاتھ سے چھین لی۔

”تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ آؤ سرنگار! باہر نکل کر دیکھو۔“

”نہیں۔ مجھ سے اصرار نہ کرو۔ میں کسی دن خود آ جاؤں گا۔“

”کب تک آؤ گئے؟“ میں نے اپنے اصرار سے تھک کر کہا۔

”جلدی..... سیدی جابر!“ اس نے چراغ کی روشنی بجھا کر کہا۔ میری ہدایت ہے کہ تم مزید تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ سمورال کو اپنے قابو میں رکھنا، سمجھے میں تمھی لوگوں کی خاطر یہاں بیٹھا ہوں ایک بات ذہن میں رکھنا کہ ہمیں یہاں سے واپس جانا ہے۔“

”مجھے تمہارا مشورہ عزیز ہے لیکن سرنگا تم کس دنیا کی باتیں کر رہے ہو؟“

”اب تم جاسکتے ہو۔“ اس نے چونک کر کہا۔ ”مقدس اقبال اعظم ہے۔“

غار میں ایک خوشبو پھیل گئی تھی۔ سرنگا دوبارہ مورتی کو سامنے رکھ کر کھوچکا تھا۔ میں نے وہ خوشبو سونگھی اور مقدس اقبال کی عظمت و فضیلت میں رطب اللسان ہو گیا۔ سرنگا کی سخت نگرانی کی جارہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قبیلے میں سرنگا کے داخلے کے بعد ہمیں ایک دوسرے سے بہت محتاط انداز میں رابطہ رکھنا ہوگا۔ سرنگا پر اس قدر سخت نگاہ کیوں تھی؟ یقیناً ابھی بہت سے اسرار اقبال کی سلطنت میں رہنے والے عظیم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوں گے۔

میں واپس آ گیا تھا مگر میں انگرو ما سے کیسے واپس آیا؟ کیا مجھے انگرو ما والوں نے فتنہ و سازش کے لیے جزیہ توری پردھکیل دیا یا مجھے اور کوئی طاقت کہیں سے کھینچ لائی؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جزیہ توری میں میری واپسی کے بعد وہ میری واپسی کے اسباب و علل پر غور کر رہے تھے، جب انھیں یقین ہو گیا کہ جابر بن یوسف انگرو ما میں رہنے کے بعد پاک باز واپس آیا ہے تو انہوں نے کاہن اعظم سمورال کو میری جانب بھیجا ہوگا۔ میں اپنے طور پر یہی تجزیہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں افسردگی کے ساتھ وہ گروہ واپس لے آیا جو سرنگا کے استقبال کے لیے گیا ہوا تھا۔

واپس ہوتے ہوتے ہمیں شام ہو گئی۔ شام کو توری پر شباب آ جاتا ہے آج میں اس جشن طرب میں شریک ہوا۔ ڈاکٹر جواد تین چار دو شیرازوں کے درمیان شراب کے خم لندھا رہا تھا اور وہ حسین و شیرازوں اس کے ساتھ کھیل رہی تھیں، مجھے دیکھ کر جواد نے ایک قہقہہ لگایا اور اس نے میری طرف گوشت کا وہ ٹکڑا پھینک دیا جو وہ اپنے دانتوں سے نوج رہا تھا۔ میں نے اسے چبا کر کھالیا۔ ڈاکٹر جواد میرے ساتھ چلا آیا اور مقابلے کے لیے اعلیٰ قسم کی جڑی بوٹیاں دینے کی پیش کش کرنے لگا۔ یہ دو دن قبیلے نے جشن قبل از فتح میں گزار دیے۔ آخری دن میرا دل مچلا جا رہا تھا۔ کل عجیب حادثہ ہوگا۔ جب اقبال جلوہ گر ہوگی جب فلورامیری تحویل میں آجائے گی۔ میں ان دونوں سے کیسے نمٹوں گا میں اسی کیفیت میں مبتلا تھا کہ جواد کمرے میں آیا اور اس نے مجھے جڑی بوٹیوں کا ایک تھہ عطا کیا، مجھے مزید کسی حماقت کی ضرورت نہیں تھی لیکن جواد کا اخلاص دیکھ کر میں نے وہ بوٹی اس کے سامنے نکل لی۔ دفعۃً مجھے تشنگ کا احساس ہوا اور زمین پر کھڑا رہنا دو بھر ہو گیا۔ سرتیانے مجھے گرتے ہوئے سنبھالا۔ میرا رنگ نیلا ہونے لگا۔ ڈاکٹر جواد غائب ہو چکا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ڈاکٹر جواد نے مجھے زہر دے دیا ہے۔ ایسا سرج الاثر زہر جس میں جادو کی آمیزش تھی۔ جو یقیناً شوالا نے اسے دیا ہوگا۔ مجھے اسی وقت بستر پر لٹا دیا گیا میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مجھے اتنا یاد رہا کہ میں نے اپنی چوٹی اٹھ دیا متحرک کرنے کے لیے اسی سختی سے پکڑ لیا تھا اور جب میرے ہاتھ میں اس کا لچلچا جسم آیا تو میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

کافی دیر بعد میری آنکھ کھلی تو میں نے فزا روا اور زارے کو سر ہانے پایا۔ سرتیا کے زانو پر میرا سر تھا اور وہ پتوں کا بنایا ہوا ایک پنکھا جھل رہی

تھی۔ میرے جسم پر اژدہا پھن پھیلائے ریگ رہا تھا۔ سریتا نے مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر میری پیشانی سے پسینہ پونچھا اس کے آنسو ڈھلک کر میرے گالوں پر گرے۔ میں نے ہوش میں آتے ہی شپالی منہ میں رکھ لی اور ایک انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ زارے اور فرارو مودب کھڑے ہو گئے۔ سریتا کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اژدہا میرے قدموں سے لپٹا ہوا تھا۔

”وہ فرعون کہاں گیا؟“ میں نے فرارو سے پوچھا۔

”کون؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”وہی طیب جواد۔ وہ جہاں کہیں ہوا سے پکڑ کر لاؤ۔“ میں نے حکم دیا۔ فرارو اور زارے ایک ساتھ دروازے کے طرف لپکے۔

سریتا نے مجھے دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ شوالا نے آخری ذلیل حربہ آزمایا تھا مگر میرے چوٹی اژدہے نے متحرک ہو کر وہ سارا زہر چوس لیا تھا جو اس بوٹی میں بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر جواد نے غداری کی تھی۔ مجھے اس پر پہلے ہی شبہ تھا۔ خوش قسمتی سے وہ شوالا کے علاقے کی طرف بھاگ گیا تھا لیکن وہ بچ کر کہاں جائے گا؟

فرارو اور زارے کی ناکامی کے بعد میں نے اس کی تگ و دو چھوڑ دی آئندہ روز سے یہ سارا علاقہ میرا ہوگا اور ڈاکٹر جواد کو طیب ہونے کے باوجود کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ قبیلے میں میری بیماری کی خبر پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ اس لیے وہاں کے ہنگاموں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سریتا نے مجھے باہر جانے سے روک دیا اور میں اس کے ساتھ آگ پر سکا ہوا گوشت کھا کر سو گیا۔ سریتا اپنی خلوت میں چلی گئی۔

فرارو اور زارے نے رات بھر خجروں پر دھار رکھی تھی رات بھر جانوروں کی قربانیاں دیوتاؤں کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ علی الصباح فرارو اور زارے نے آکر میری خیریت پوچھی، میرا تھا جل رہا تھا لیکن میں مقابلے کے لیے بالکل تیار تھا۔ فرارو اور زارے کے ہمراہ آنے والی نوخیز لڑکیوں نے مجھے دیوتاؤں کے مشروب میں غسل دیا۔ میرا جسم پھولوں کے عرق سے مہکا دیا گیا۔ نت نئے انداز سے نقش و نگار بنائے گئے۔ مجھے طرح طرح سے مرصع کیا گیا۔ لڑکیاں چلی گئیں تو نو جوانوں کے ایک دستے نے میرے تھکے چمکانے اور خنجر نیزے سجانے میں بڑی پھرتی دکھائی۔

پھر میں نشے کی حالت میں جھومتا ہوا اس میدان کی طرف قدم اٹھانے لگا جہاں شوالا سے میرا مقابلہ منعقد ہونے والا تھا۔ وہاں پہلے ہی سے روایتی شان و شکوہ کے ساتھ توری کے لوگ جمع ہو گئے تھے لوگوں کا ایک جم غیر میری پشت پر تھا۔ ہر طرف فلک شگاف نعرے بکھرے ہوئے تھے۔ شوالا کے قبیلے کی طرف سے کوئی فرد نہیں تھا۔ فرارو اور زارے میرے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے، کاہن اعظم سمورال اور مقدس اقبال کی سواری آنے والی تھی۔ میدان میں رقص کرنے والی لڑکیوں نے گھیرا ڈال دیا تھا۔ شوالا ابھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک تنہا شخص سچے ہوئے جسم اور ہتھیاروں کے ساتھ سر جھکائے، سینہ تانے میدان میں داخل ہوا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس نے چیختے ہوئے ہجوم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، اور اپنی

جگہ جم کھڑا ہو گیا۔ وہ شوالا تھا مجھے یہ دیکھ کر شدید مایوسی ہوئی کہ اس کے ساتھ زربگا اور فلورائیں تھیں، اچانک ایک خطرے کا احساس ہوا لیکن مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اسی وقت میرا پشت پناہ سرنگا ہجوم کا سینہ چیرتا، تیز قدم بڑھاتا ہوا میرے قریب آ گیا میں نے اس سے بغل گیر ہونا چاہا مگر اس نے مجھے روک دیا۔ قریب آ کر اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا میری پیشانی پر رکھا۔ پھر اسے کھینچتا ہوا اوپر کی جانب بڑھاتا گیا۔ اس

کام سے فراغت پا کر وہ بڑے ادب سے بولا۔ ”اے جزیرہ توری کے عالی و مرتبت سردار! میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔“

”سرنگا میرے دوست!“ میں نے محل کر کہا۔ ”مجھے اس موقع پر تمہاری دعاؤں کی بے حد ضرورت ہے۔“

جواب میں سرنگا نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے سلام کیا اور پھر ہجوم میں گم ہو گیا۔ اسی وقت میں نے سرنگا کی عظیم دیوی کی پرچھائیاں اپنے قریب محسوس کیں، جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، لوگوں کا شور و غل بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک گہری خاموشی مسلط ہو گئی۔ بلند مقام پر جہاں اقبال کی نشست کا انتظام تھا۔ اس کے عین اوپر آسمان میں سیاہ ذرات کا بھنور چکر اتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ یہ اقبال کی آمد کا اعلان تھا۔ اس وقت میرے اضطراب کا کیا عالم ہوگا؟ سیاہ ذرات کا دھندلکا بالائی مقام تک آ کر فضا میں غائب ہو گیا۔ تمام مجمع زمین پر گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ فضا میں ایک لطیف موسیقی کا شور بلند ہوا اور ایک لطیف خوشبو سارے میدان میں پھیل گئی۔ جب مطلع صاف ہوا تو مقدس اقبال کا جلوہ جہاں تاب نظر آیا۔ وہ تمام تر تزک و احتشام سے اپنی مسند پر جلوہ گر تھی، میری نگاہیں اس کا طواف کرنے میں محو تھیں، اس کا سارا بدن سبز پتوں اور سرخ پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے ایک طویل مدت اور طویل چاہت کے بعد اسے دیکھا تھا۔ اس کی روشن آنکھیں ایک طرف کی ہوئی تھیں۔ میں اپنے احساسات محفوظ رکھتا ہوں، جو اہل دل ہیں انھیں تصور کی دعوت ہے بس میں گنگ تھا۔ جی چاہتا تھا کہ یہیں یہ عالم ٹھہر جائے۔ ہر چیز اپنی جگہ جم جائے۔ اس منظر میں کوئی تبدیلی نہ ہو کوئی اور نہیں وہ اقبال تھی۔ اقبال سا منے تھی وہ لوریا، نیشا، زولین اور اشار نہیں تھی وہ اقبال تھی وہ میری شب تھی وہ میرا دل تھی وہ میرا احساس تھی وہ میرا دل تھی مجھے کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ میں اس وقت ہوش میں آیا جب کاہن اعظم نے میدان میں آ کر مقابلے کی شرائط کا اعلان کیا میں اور شوالا میدان میں ایک دوسرے کے آنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میرے قریب کھڑے ہوئے لوگ ہٹنے لگے۔ اس وقت میں نے اپنے زور بازو کا مظاہرہ کرنے کے لیے اپنے ایک ہاتھ سے ایک شخص کو اٹھا کر پھینک دیا۔ پھر دوسرا ہاتھ بڑھا کر ایک شخص کو اٹھا لیا۔ اور اسے مجمع کی طرف اچھال دیا۔ اب ہم دونوں میدان میں اکیلے رہ گئے شوالا ٹکٹکی باندھ کر میرے تنھے دیکھ رہا تھا لیکن اس نے حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔ کاہن اعظم جارا کا کا کی ابتدائی رسوم کے بعد درمیان سے ہٹا تو ہم دونوں نے اپنے اپنے نیزے زمین میں گاڑ دیے، اس وقت میں نے شوالا سے پوچھا۔ ”موت سے پہلے کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے۔ فلور کہاں ہے؟“

اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ایک مصنوعی قہقہہ۔ ”فلور؟ جابر بن یوسف! تم اسے کبھی نہ پاسکو گے“ میں نے اسے بطور تحفہ زربگار کو دے دیا ہے۔ زربگار جو ارمیگا کا بھائی ہے ارمیگا جو زربگار کا سردار ہے بیزار جہاں جالوش کا قیام ہے تم اسے کبھی حاصل نہیں کر سکو گے اور یوں بھی تمہارا آخری وقت آپہنچا ہے۔“

میری کنپٹیاں جلنے لگیں آخری وقت میں شوالا نے ایک اور چرکا لگا دیا تھا۔ ”تو مجھے گویا تمہیں بہت ذلت آمیز شکست دینی پڑے گی؟“ میں نے دانت پیس کر کہا۔

”میں تمہاری آنکھیں نکال لوں گا۔ پھر کوئی اجنبی یہاں سرائٹھانے کی جرات نہیں کرے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے پینٹر ابدلا اور تنید وے کے مانند خطرناک انداز میں دائیں بائیں چکر لگانے لگا۔ اس کی حرکتیں مضحکہ خیز تھیں۔ اس مقابلے میں طلسمی صلاحیتیں آزمانے کا پورا موقع دیا گیا۔ میں

اسے طول دینا چاہتا تھا تا کہ اقبال دیر تک بیٹھی رہے۔ چنانچہ میں اپنی جگہ پر بے پروا کھڑا رہا۔ دفعۃً اس نے اپنے گلے میں لٹکی ہوئی مالا کے دانے زمین پر بکھیر دیے جب میرے پاؤں اس پر پڑے تو مجھے وہ شعلے محسوس ہوئے میں نے اپنا چوہلی اٹھوا کر متحرک کیا، وہ زمین پر لوٹ کر تمام دانے چٹ کر گیا۔ شوالا دیکھتا رہ گیا۔ شوالا نے اپنی قیمتی مالا ضائع کر دی تھی، پھر اس نے اپنے گلے میں لٹکی ہوئی ایک انسانی کھوپڑی زمین پر دے ماری بجلی کی ایک کڑک سی پیدا ہوئی اور میرے گرد طواف کرنے لگی لیکن بجلی نے میرے جسم کے کسی حصے کو نقصان نہیں پہنچایا۔ میں کھڑا رہا کھوپڑی زمین پر گررتے ہی کئی حصوں میں بکھر گئی تھی۔ شوالا کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ پھرتی سے لوٹ کر دور چلا گیا اس کی مٹھیاں بندھیں، میرے نزدیک آ کر اس نے مٹھیاں کھول دیں اور میری طرف زہریلے کیڑے اور چیونٹیاں اچھال دیں جو جو تک کی طرح مجھ سے چمٹ کے میرے جسم میں سوراخ کرنے لگیں، لمبے بھر کے لیے تو مجھے شدید اذیت کا احساس ہوا لیکن اڑدے نے میری مشکل جلد ہی آسان کر دی اس نے سارے کیڑے مضم کر لیے اور زمین پر آ کر ناپنے لگا جیسے اس کی مرغوب غذا مل گئی ہو۔ ان طلسمی اعمال کی تفصیل خاصی طویل ہے وہ وار کرتا رہا میں انھیں ضائع کرتا رہا۔ اس نے اپنے گلے میں لٹکے ہوئے تمام تحائف ایک ایک کر کے ختم کر دیے، شپالی اور اڑدے کے کرشمے اس کے سارے طلسمی حربوں پر حاوی ہو گئے۔ پھر اس نے اپنا نیزہ اٹھایا اور زمین پر ناپتے ہوئے اڑدے کو نشانہ بنانے کے لیے ادھر ادھر مارنا شروع کر دیا۔ اس کا کوئی نشانہ کامیاب نہیں ہوا۔ اڑدے پھرتی سے ایک طرف ہٹ جاتا تھا۔ میری طرف سے وہ شاید بے فکر ہو گیا تھا۔ میری حیثیت ایک تماشائی کی سی ہو گئی، لوگ انگشت بدنداں تھے کہ میں ایک جگہ کیوں کھڑا ہوں جب وہ کوئی حرکت کرتا تو میں اس کا جواب دے دیتا لیکن میں ہر ممکن احتیاط برتتے ہوئے تھا کہ کہیں کوئی نیزہ بہک کر میرے دل کے پار نہ ہو جائے۔ نیزے کی انی میں زہر بھرا ہوا تھا۔ میری خاموشی اور سکوت پر میرے قبیلے کے لوگوں کے چہرے گوگو کی کیفیت میں نظر آتے تھے میں نے یہ مقابلہ خاصا دلچسپ اور سنسنی خیز بنا دیا تھا۔ میں کنکھیوں سے مرصع تخت پر جلوہ گن اقبال کو دیکھتا جاتا تھا جس کی آنکھیں مجھے اپنے جسم کے پار محسوس ہو رہی تھیں۔ میں مسخروں کی طرح پینتر بدل بدل کر شوالا کے وار رد کر رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے ایک سے ایک کاری حملہ آخروہ تھکنے لگا اور اس کا گلا نوادے سے خالی ہو گیا۔ اس کے تمام تحائف یا تو ضائع ہو گئے تھے یا میرے ہاتھ میں آنے کے بعد زمین پر دھرے رہ گئے تھے انھیں دوبارہ اٹھا کر گلے میں ڈالنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ جب اس نے دوبارہ نیزہ سنبھال کر جسمانی لڑائی کے لیے پرتولے تو میں نے اجازت طلب نظروں سے جھک کر اقبال کی طرف دیکھا، پھر شپالی اچھال کر ایک خاص زاویے سے شوالا کے جسم پر پھینک دی وہ چیخ اٹھا اور نیزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا میں نے بھی اپنا نیزہ پھینک دیا۔ میں نے شپالی کی پروا نہیں کی کیونکہ اسے اٹھانا اڑدے کا کام تھا۔ میں نے تمام تحائف پشت پر کر کے شوالا کا دیو قامت جسم اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ہم دونوں دور تک زمین پر لوٹتے پوٹتے رہے میں نے اسے اپنی پوری قوت سے بھیج لیا تھا اس دیو کی ہڈیاں چرمرانے لگیں۔ اسے نیم جاں چھوڑ کر میں اس سے علیحدہ ہو گیا وہ زمین پر کھڑا ہوا تار ہا۔ آخر وقت تک اس کی آنکھوں میں ایک طغیانی تھا میں نے اسے دونوں ناگوں سے پکڑ کر اٹھالیا۔ اس میں ہاتھ پیر چلانے کی سکت نہیں تھی وہ اوندھا لڑھکنے لگا۔ میں اسے لیے لیے سرنگا کے پاس آیا۔ کیا خیال ہے سرنگا؟ اس کے مظالم تمھیں یاد ہیں؟“

”ہاں..... مگر اب کیا رہ گیا ہے؟ تم نے اس طاقت کا مظاہرہ کر کے مجھے متاثر کیا۔“ سرنگا نے تحسین آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

میں نے فخریہ گردن اونچی کی اور سوالا کو اپنے ہاتھوں پر اٹھائے سمورال کی طرف چلا گیا۔ ”دیوتاؤں کی خدمت میں۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”کاہن اعظم بتاؤ میں اس زندہ لاش کا کیا کروں؟“

کاہن اعظم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اقبالہ کی سمت آیا میں نے تیز نظروں سے اسے دیکھا لیکن اس اثنا میں سوالا نے میرے سر کے بال نوچنے شروع کر دیے وہ میرے کاندھوں پر بیٹھ کر میرے تحائف کھینچ رہا تھا۔ میں اقبالہ کے جلوے میں ایسا ڈوبا تھا کہ سوالا کی طرف سے بے خبر ہو گیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک مشکل مرحلہ تھا۔ شپالی زمین پر پڑی ہوئی تھی اژدہا بھی مجھ سے دور تھا۔ نیزہ بھی میرے پاس نہیں تھا۔ سوالا بری طرح میرے بال نوچ رہا تھا۔ تکلیف سے میرا برا حال تھا لیکن میں نے اس کی ٹانگ اتنی زور سے مروڑی کہ اس نے ایک چیخ کے ساتھ میرے بال چھوڑ دیے پھر میں نے اس کا چہرہ اپنے سامنے کیا۔ اسے گیند کی طرح اچھالا اور شدت غضب میں اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ پھر میں نے اسے ایک ٹھوکر ماری اور ایک طرف چل دیا۔ وہ اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کی چیخیں آسمان سر پر اٹھاری تھیں میں پلٹ کر آیا مجھے خیال آیا کہ انگریزوں میں سیکھے ہوئے پتھروں میں منتقل کرنے کے عمل کا اقبالہ کے سامنے کیوں نہ مظاہرہ کر دوں؟ میں نے تیزی سے اپنا عمل شروع کیا۔ پلک جھپکتے میں سوالا کے پیر پتھر میں تبدیل ہو گئے اس کا زیریں حصہ بخر ہو گیا۔ اور بالائی حصے سے سوالا کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ میں نے اسے اسی طرح چھوڑ دیا۔ مجھے معلوم تھا۔ اب کسی کو خنجر آزمانے کا موقع نہیں ملے گا۔ اب وہ یوں ہی سسک سسک کر مر جائے گا۔ اپنی جگہ واپس پہنچ کر میں نے اژدہ کے منہ سے شپالی نکالی اور اسے گلے میں ڈال کر اس ملک تمام حسنات کا اضافہ کر لیجئے اقبالہ کے تخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ توری کے لوگ میدان میں اتر کر وحشیانہ رقص کرنے لگے تھے وہ ایک دوسرے پر لوٹ رہے تھے اور اپنے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہے تھے۔ جب میں کھڑا ہو گیا تو کاہن اعظم نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں خاموش کر دیا۔ اقبالہ کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ سمورال نے اعلان کیا۔ ”دیوتا گواہ میں ہیں کہ مقدس اقبالہ کے سامنے جزیہ توری کے ایک قبیلے کے سردار جابر بن یوسف نے دوسرے قبیلے کے سردار سوالا کو شکست دے دی ہے اب وہ دونوں قبیلوں کا اس وقت تک سردار ہے جب تک سلطنت اقبالہ کا کوئی دوسرا شخص جابر بن یوسف کی شجاعت کو زیر نہ کرے ایک زمانے بعد توری دوبارہ ایک قبیلے میں مدغم ہوا ہے لیکن اس کی دو قبیلوں کی حیثیت اپنی جگہ ہے۔ دونوں قبیلوں پر حکمرانی کے لیے جابر بن یوسف کو دوبارہ شکست دینا ہوگی۔“

کاہن اعظم کے اعلان کے بعد میں نے یہ سنہرا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ میں نے تمام تر فصاحت سے اقبالہ کو مخاطب کیا۔ ”اے آسمانوں کی دیوی! اے زمین کے سب سے خوب صورت پھول اپنے ہاتھ دراز کر اور میرا گلا گھونٹ دے تاکہ میں ایک ابدی نیند سو جاؤں مجھے ایک مہم سا اشارہ کرتا کہ میں سمجھ سکوں کہ جو میں سوچ رہا ہوں وہ تو سمجھ رہی ہے، مجھے میری بساط سے آگاہ کر اپنے قدم آگے کرتا کہ میں انھیں چاٹ کر ان پر اپنے جذبہ شوق کی مہر ثبت کر سکوں۔“

جواب میں پہلی بار اقبالہ کے ہونٹ کھل گئے۔ جیسے جل ترنگ بج اٹھے میں نے محسوس کیا۔ ہاں میں نے محسوس کیا یہ میری نظروں کا گمان نہیں کہ اس کی آنکھوں میں ایک کرب پنہاں تھا۔ اس نے اپنے سبز پوش بدن کا ایک پھول میری طرف اچھال دیا۔ اس کے ہاتھ مرتش ہوئے ہاں

میری خاطر ان میں جنبش ہوئی۔ اس نے میری بات سنی اس نے کسی رد عمل کا تو اظہار کیا۔ پھر اس نے اپنا ایک ترشا ہوا پیر آگے کر دیا اور میں سیڑھیاں دیوانوں کی طرح چڑھتا ہوا اس کے آسانی سراپا کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کے بدن سے سبز پتے نوپنے کی ایک خواہش میرے اندر بری طرح پیدا ہوئی لیکن میں نے ان پیروں کو بوسہ دینے پر اکتفا کیا میں نے ان پر اپنی زبان پھیر دی۔

فرار و زار نے سرنگا اور سریتا نے مجھ دیوانے کو اٹھایا، مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب گئی اور میں کب تک اس کے مرمروں میں پیروں سے پڑا کھلتا رہا۔ کیا وہ چلی گئی؟ ہاں وہ چلی گئی میں کھویا کھویا، ڈوبا ڈوبا سا اپنے رفیقوں کے ساتھ چلا، نشاط و انبساط کے نقارے میرے دل پر نشتر چلا رہے تھے، تماشا لحوں میں ختم ہو گیا تھا۔ میں جزیرہ کے دونوں قبیلوں کا سردار بن گیا تھا۔ تاریک براعظم میں کسی شخص کے پاس بیک وقت اتنے قبیلوں اور علاقوں کی سرداری کا اعزاز نہیں تھا۔ سرنگا میرے ساتھ تھا اور شاید میری کیفیت سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اس کا ہاتھ شفقت کے انداز میں میری پشت پر تھا اور میں سوچ رہا تھا کیا محض یہیں تک دادرسی ہوگی؟ کیا میں صرف اتنے ہی انعام و اکرام کا مستحق تھا؟ کیا مشقتوں، اذیتوں، کرب، ناک یادوں اور جلتی ہوئی راتوں کا یہی صلہ ہے؟ کیا بس یہی ہے؟ اس کے سوا کچھ نہیں؟ جزیرہ توری کا طاقت ور اور عالی مرتب سردار بہت ناتوانی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنا دل تھامے ہوئے تھا اور اسے انگریزوں کے فاضل دانش مندی یاد آرہے تھے۔ جنھوں نے اس کے خلاف ایک محاذ بنالیا تھا۔ کیا ان کی رائے صائب ہے؟ یہ تو استیصال ہے!“

سریتا چمک رہی تھی، قبیلے میں عید کا سماں تھا۔ ہم تین اجنبی سرنگا، سریتا اور میں اب جزیرہ توری کے مختار کل تھے مگر ایک ہستی کی کمی محسوس ہوتی تھی فلوراکی۔ میرے تصرف میں سب کچھ آگیا صرف وہ باقی رہ گئی تھی فلوراجس کی وجہ سے اس پر صعوبت زندگی کا آغاز ہوا تھا، مجھے فلوراکی پر بہت رحم آیا اس نے اپنے محبوب کی طاقت و حشمت نہیں دیکھی وہ ابھی تک اسیر بلا ہے اور میں اتنا سر بلند ہونے کے باوجود اسے حاصل کرنے میں ناکام رہا ہوں، شوالا کو شکست دے کر کوئی غیر معمولی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ فلوراکو بیز نارا ایک شخص لے گیا اور میں دیکھتا رہ گیا؟ میں کس قدر بے غیرت آدمی ہوں؟ شوالا جیسے دیوکوشکست دینے، زارشی سے واپس آنے، انگریزوں سے نجات پانے، باگمان میں لوکا سا کو زچ کرنے والے شخص کا حاصل کیا تھا؟ اپنی آگ میں جلنا، اپنے ہونٹ کاٹنا، اپنا گوشت چباننا۔ اس کے پاس اقبال نہیں ہے۔ فلوراکو نہیں ہے۔ اور توری کی نو خیز دوشیزائیں بھی نہیں جو دیکھیے تو سب کچھ ہے جو سوچے تو کچھ بھی نہیں۔ سرنگا زبانی طور پر مجھے سمجھا کر دوبارہ اپنے غار میں چلا گیا۔ مجھے اسے روکنے کی مہلت بھی نہیں ملی، میں آس پاس گلیوں میں برپا ہونے والے جشن میں نہیں گیا۔ وہاں شراب، جوانی اور موسیقی بہہ رہی تھی، مجھ سے نہ جانے کیوں یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو سکا۔ میں انھیں بھی اذیت میں مبتلا دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں باہر گیا اور میں نے چیخ چیخ کر انھیں حکم دیا۔ ”بند کرو یہ جشن۔ اپنی اپنی جھونپڑیوں میں جاؤ۔ جاؤ احقو جاؤ۔ ختم کرو یہ جشن۔“

وہ سراسیمہ ہو کر مجھے دیکھنے لگے رقص رقص کیا۔ نقارے تھم گئے اور وہ خاموش منہ لٹکائے ہوئے اپنی اپنی جگہوں سے ہٹنے لگے۔ ان کے مایوس چہرے دیکھ کر مجھے تکلیف ہوئی۔ میں نے دوبارہ چیخ کر کہا۔ ”اچھا جودل چاہے کرو۔ پھر شروع کر دو یہ کھیل۔ مستی کا رقص کرو۔“ مشعلوں کی روشنی میں ان کے حیرت زدہ چہرے مجھے نظر آرہے تھے۔ انہوں نے دوبارہ ہاؤ ہو شروع کر دی تھی، میرا دل چاہا انھیں دوبارہ منع کر دوں اور پھر یہ

سلسلہ جاری رکھنے کا حکم دوں پھر منع کر دوں، پھر اجازت دوں اس طرح انھیں پریشان کرتا رہوں میں اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کے لیے بستی سے دور چلا گیا۔ اندھیرے میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر میں نے خود کلامی شروع کر دی۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند آئی مجھے حیرت ہے کہ اس عذاب میں مجھے نیند کیسے آگئی تھی

غالباً ایک ساعت گزری ہوگی کہ میرے پہلو پر کسی نے دستک دی میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اندھیرے میں میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں نیند اچانک کہیں غائب ہوگئی میں اٹھ کر اسے دیکھنے لگا اور میں نے شپالی کی روشنی میں اس کے وجود کا یقین کیا۔ وہ سرو قد لالہ رخسار، خانوادہ اقبال کا ایک تروتازہ نوشگفتہ نومیدہ پھول تھی اس کے چہرے پر تبسم رقصا تھا۔ اس کے اوصاف و شفاف بدن پر چند پتے سجے ہوئے تھے، مجھے اپنی نسون میں شدید کھنچاؤ محسوس ہوا اس کے حسن کا بیان کروں گا تو میرے سننے والے حسد کریں گے خانوادہ اقبال کی کوئی دوشیزہ کتنی حسین ہو سکتی ہیں۔ ذرا سوچیے تو وہ اس کا پرتو تھی وہ اشار یا ژولین میں سے کوئی نہیں تھی۔

میری استغناء نگاہوں اور امتناع سے اس کی سیماب صفی میں اور اضافہ ہو گیا کسی شہزادی کے سے انداز میں اس نے اپنے لب کھولے۔ ”جزیرہ توری کے معزز شخص! میں نماز ہوں۔“

”یقیناً تم مقدس اقبال کے شبستان کی آرائش ہو، کیا اس نے مجھے طلب کیا ہے؟ اس نے تمہارے ذریعے کوئی پیغام بھیجا ہے؟“ میں نے بے تاب سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے خوش ادائی سے جواب دیا اور مسکرانے لگی۔

”تو مجھے بتاؤ اے پری پیکر نازیں! اس نے کیا کہا ہے؟ وہ آتش بدن شعلہ نفس میرے بارے میں کیا سوچتی ہے؟“

”اس نے مجھے بھیجا ہے۔“ وہ نزاکت سے بولی۔

”تمہیں؟“ میں نے تذبذب سے پوچھا۔ ”مگر کس لیے؟“

”میں تمہارے نفس کی غذا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”کیا.....؟ مگر نہیں۔“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”میرے نفس نے روحانی رفعتیں چھولی ہیں۔ اس کی غذا مادہ نہیں ہے۔“

”میں تمہارے لیے روحانی سرشاریوں کی نوید ہوں، میرا بدن مادی آلائشوں سے پاک ہے۔“

”میں نے اپنا نفس ایک ستون سے باندھ دیا ہے۔“

”کیا تم اس کا عطیہ مسترد کرنے کی جرات کرو گے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”میں نے تمہاری خواہش نہیں کی ہے ہر چند کہ کرہ ارض کا کوئی بھی ذی ہوش شخص تمہیں مسترد نہیں کر سکتا۔ اگر تم کوئی انعام ہو تو میرے

ساتھ رہو میں تمہیں سجا کر رکھوں گا لیکن میری طلب اپنی جگہ صادق اور مکمل ہے۔ میرے لیے اس کی خواہش مقدم ہے۔“

”کیا تمہیں اشار یاد ہے؟“ اس نے سرگوشی کی۔

”کیا تم اس کی جانشین بن کر آئی ہو۔ وہ کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم لیکن میں اشار کی جگہ بھیجی گئی ہوں۔“

”میرا یہ امتحان بھی خوب ہے میں تو ہلاک ہو جاؤں گا۔“

”میں تمہارے جلتے ہوئے بدن کی آگ سمیٹنے آئی ہوں۔“

”یہ آگ میرا سرمایہ ہے میں اسے سرد کر کے اپنا مقام گرانا نہیں چاہتا۔“

”میں بھی ایک آگ ہوں، مجھے چھو کر دیکھو، مجھے تمہارے ساتھ رہنے کا اعزاز اس نے میری خدمات سے خوش ہو کر بخشا ہے۔“

ایک عرصے سے فروزاں ہوں۔“ اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”لو یہ مشروب نوش جاں کرو۔“

یہ قصر اقبال کا متبرک مشروب ہے اسے پی کر تمہیں میرے بدن کی چاندنی نظر آنے لگے گی تمہیں مشروب خاص کی ضرورت ہے؟“

”نہیں۔ تمہارا شکریہ میں اپنا خون پی رہا ہوں۔“

”اوہ وہ سمٹ کر زمین پر دراز ہو گئی۔ مجھ سے اس کا قیامت خیز سراپا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ ایک بار پھر اقبال نے

میری خلوت کے لیے اشار کی طرح ایک نازنین بھیجی تھی لیکن اشار کا زمانہ اور تھا۔ شاید میں اس وقت ناپختہ کار تھا۔ اب بہت فرق ہو گیا تھا کیا اتنی

ریاضت اور صداقت کا انعام یہ ہے کہ وہ اپنی کنیز بھیج کر میری دل آزاری کرے؟ کیا میرا استحقاق صرف اسی قدر ہے؟ باگمان میں اور یہاں تھی، انگریزوں

میں نیشا، کیشا موجود تھی۔ میں نے کہاں کہاں نا آسودگیاں اور محرومیاں اوڑھے رکھیں؟

میں اسے یکسر مسترد بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن میں نے سوچا اسے مسترد کر دینا چاہیے زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ اس کا عذاب مجھ پر نازل ہو

گا۔ ہو جائے میں نے اس سے کہا۔ ”اے ستم بر مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے بہتر ہے تم قصر اقبال واپس چلی جاؤ۔“

”اقبالا۔ مقدس اقبال۔ اس گنہگار شخص پر رحم کرو۔“ وہ عاجزی میں اپنے آپ سے بولی۔ ”آہ کون اسے سمجھائے کہ کائنات کے اس حصے

کو کیسی روحانی عظمتیں حاصل ہیں۔“

”تمہارے جملے میری فہم سے بالا ہیں۔“ میں نے اس کی گفتگو سن کر کہا۔

”دیوتا تم پر سایہ لگن رہیں سیدی جاہر! تم گناہ کر رہے ہو۔“ اس نے اپنے بال پھیلا کر کہا۔ ”آہ جو تمہیں جاننا چاہیے شاید تم اس سے

ابھی تک ناواقف ہو۔ تم ابھی زمین کے آدمی ہو شاید تم نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ یہ سب کیا ہے؟ شاید تمہاری آنکھوں نے ابھی بہت کم دیکھا

ہے۔ میں اس کے قرب کی علامت ہوں سیدی جاہر! وہ مسلسل کہتی رہی۔

”تم میرے لیے باعث سعادت ہو۔“ میں نے اس کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے کچھ سنہیلنے کا موقع دو، میں اس وقت تمہاری

چاہتا ہوں۔“

”میں تمہارے قریب رہوں گی کیونکہ مجھے تمہارے لیے تفویض کیا گیا ہے۔“ اس نے کہا اور میری نظروں سے غائب ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

میری قوت فیصلہ ختم ہو گئی تھی۔ انتشار کے ایسے لمحوں میں مجھے کاہن اعظم سمورال کی یاد آئی۔ شوالا کے مرنے کے بعد اب میری حیثیت ایک فریق کی نہیں رہی تھی، میں بھاگتا ہوا اس کے غار میں پہنچ گیا اور ایک مدت بعد اس کی طلسمی عبادت گاہ میں داخل ہوا۔ وہ میری صورت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ”کاہن اعظم سمورال!“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں تمہاری پناہ چاہتا ہوں۔ اور تینوں قبیلوں کی سرداری سے عہدہ برآ ہونے کا اعلان کرنے آیا ہوں۔“

جب میں نے عبادت گاہ میں قدم رکھا، اس وقت سمورال ہرن کی مردہ آنکھ میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری آمد سے اس کی محویت ٹوٹ گئی۔ میں نے وحشت زدہ انداز میں اس سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ میری صورت دیکھنے لگا۔ ”جابر بن یوسف!“ وہ متحیر نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”تم جو اعلان کر رہے ہو، میں اس پر تمہیں دوبارہ غور کرنے کا موقع دیتا ہوں..... کیا تم شراب میں غسل کر کے آرہے ہو؟“

میں نے اس سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے بعد کہا۔ ”میں کسی اور زبان میں گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے غلاموں کی ایک کثیر فوج، وسیع زمین اور مضبوط حکومت کی ہوس نہیں۔ میں ایک نظر زدہ شخص ہوں۔ یہ سب میرے لیے اس وقت باعث افتخار ہوتا جب میری نگاہ اس کے جلوے سے پاش پاش نہ ہوئی ہوتی۔ اب مجھ میں مزید استقامت نہیں ہے۔ میری گزارش ہے کہ مجھے جزیرہ توری کا ایک عام شہری بنا دیا جائے یا مجھے اور میرے ساتھیوں کو مہذب دنیا میں واپس کر دیا جائے، اگر یہ ممکن نہیں تو ہماری ہلاکت کا جشن منعقد کیا جائے۔ میں ایک فیصلہ کر کے تمہارے پاس آیا ہوں۔“

سمورال نے ہرن کی آنکھ ایک تازہ پتے میں لپیٹ کر پتھر کے پیالے میں رکھ دی اور میری وحشت کا جواب دینے کے بجائے اس نے اپنی عبادت گاہ کی چاروں دیواروں کا طواف کیا اور بندر کی شبیبہ کی مٹھ کا ایک عصا لے کر دیواریں ٹھونکیں۔ پھر اس نے جلتے ہوئے پیالے میں کوئی سفوف ڈالا۔ دھواں پھیل گیا۔ ایک ناقابل بیان قسم کی بونے عبادت گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ ننگ دھڑنگ سمورال نے جارا کا کا کی کھوپڑی گلے سے اتار کر دروازے پر لٹکا دی۔ اس کے بعد وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور مجھے زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔

”تم کیا کہہ رہے تھے؟“ اس نے باوقار لہجے میں پوچھا۔ مجھے دوبارہ اپنی شدت اور اضطراب کا حال بیان کرنے میں تامل ہوا۔ پھر بھی میں نے اپنے قلب کی حالت زیادہ مدلل اور جامع انداز میں دوبارہ بیان کی۔ میں نے کہا۔ ”میں تنگ آ گیا ہوں میں اب اپنی جھوپڑی میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اب میرا دل کسی درخت پر رہنے کو چاہتا ہے کیونکہ میں ایک جانور ہوں۔“

سمورال نے تمام تر سنجیدگی سے میری روداد جنوں سنی اور بھاری بھر کم آواز میں بولا۔ ”تمہاری عمر جہراں سے کم معلوم ہوتی ہے۔ تم کوئی معمولی پرندے ہو جو ایک ہی قسم کی رٹ لگاتا ہے۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ جو مناصب تم نے حاصل کیے ہیں وہ اس کی قربت سے مشروط ہیں۔ تم بیک وقت تین زمینوں کے سردار ہو، اس کے باوجود تمہارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ تم عظیم و جلیل ملکہ اقبال کی رفاقت کا اذعا کرو۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم اس وسیع پراسرار سرزمین پر پھیلے ہوئے تمام بزرگ لوگوں سے برتر ہو گئے ہو اور وہ لوگ جنہوں نے تم سے زیادہ مرتبت اور عظمت پائی ہے تم انھیں عبور کر کے اس کی خلوت میں پہنچ جاؤ گے؟ تم تو ابھی سے تھک گئے۔ کیا تم نے ان لوگوں کو دیکھا جو اس کی نظر میں زیادہ دِقیع اور مستند ہیں پھر تشنگی کا عذاب

سہمہ رہے ہیں۔ تم اس کے دعوے دار کیسے ہو گئے۔ جب کہ تم نے ابھی صرف تین علاقوں کی سرداری حاصل کی ہے تم نے اپنے اطراف میں موجود ان لوگوں کی آنکھوں میں جھانک کر نہیں دیکھا جو اس سے قریب ہیں۔ کیا وہ حواس سے محروم ہیں اور تمہاری طرح سوچ نہیں سکتے؟“

”سمورال۔ مقدس کا بن تم آج عجیب باتیں کر رہے ہو۔“ میں نے حیرت سے اسے گھور کر دیکھا۔ ”لیکن مجھے یہ تاثر دیا گیا تھا کہ اس کی نظروں میں میرے لیے چمک موجود ہے۔ اس نے مجھے دوبار اپنے جلوے سے سرفراز کیا۔ اس نے میری محرومی دور کرنے کے لیے اپنے شبستان سے اشارہ بھیجی جس کا علم شاید تمہیں نہیں ہے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ وہ مجھ پر مہربان ہے۔ مجھے یہ باور کرایا گیا تھا کہ بس اب میری طلب کا جواب موصول ہونے والا ہے۔ مجھے باگمان اور صحرائے زارشی میں تربیت کے لیے بھیجا گیا۔ مجھے اس کے کس شریں کی سعادت نصیب ہوئی۔ سنا گیا تھا کہ اجنبیوں کے لیے یہ زمین قبر کی جگہ دینے میں بخل سے کام لیتی ہے لیکن ہم اجنبیوں کو خاص رعایت دی گئی ہے۔ اب نماز کے بدن کا تحفہ بھیجا گیا ہے جسے میں مسترد کر کے تمہارے پاس چلا آیا ہوں۔“

”آہ میرے غریب نوجوان!“ سمورال نے ایک سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تم سے بھی تو کہا گیا تھا کہ اس مٹی کا ذرہ ذرہ محروم و سراسر سے آلودہ ہے۔ تم نے اتنی دور دراز کا سفر کیا اور اپنے قد کی پیمائش نہیں کی۔ تم نے حسن و جمال کی اس ملکہ کے بارے میں پورے طور پر آگاہی حاصل نہیں کی۔ تم نے ابتدا ہی سے بہت سے زیادہ خواہش کا اظہار کر دیا۔“

”مقدس کا بن! کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ میں تم سے اجازت لے کر تمہارا خنجر اٹھاؤں اور اپنے سینے کے پار کر لوں؟ میں اب تک جو کچھ سمجھتا رہا، کیا وہ غلط تھا؟ کیا تم مجھے اس جلیل منصب سے آگاہ کرو گے۔ جہاں مال کا راس کے جمال بے مثال کا باب کھلتا ہے۔ یقیناً اس کی کوئی منزل کوئی انتہا تو ہوگی؟“

”کون جانتا ہے، کسے معلوم ہے.....“ کا بن اعظم کے لہجے میں یاسیت تھی۔ ”مگر ایک شخص ضرور طلوع ہوگا۔“

”تم بھی نہیں جانتے؟“ میں نے حسرت سے کہا۔ ”وہ شخص..... کیا وہ کسی شخص کی آمد کا منتظر ہے؟“

”میں اس شخص کو جانتا ہوں۔“ کا بن اعظم نے کہا۔

”کون ہے وہ؟“ میں نے کرب سے پوچھا۔

”وہ شخص جو علم و فضیلت، عزم و شجاعت میں سب سے یکتا ہوگا۔ جس کی شدتیں اتنی پراثر ہوں گی کہ پتھر نرم پڑ جائیں۔ وہ شخص جو برداشت، عقل اور مردانہ اوصاف کا حامل ہوگا۔“

”شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ ایک ناقابل تعبیر خواب ہے۔ میں تمہارے پاس اسی لیے آیا تھا۔ میرے خیال میں یہ قرین عقل ہے کہ آدمی ایسے اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کی بجائے جو عام انسانی جسم کے لیے ناممکن ہیں اس کی طلب سے دستبردار ہو جائے۔ اور جو ہے اسی پر قناعت کرے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

”نہیں جابر بن یوسف! میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ تم بھی اس صف میں شامل ہو جاؤ۔ جس میں اور بہت سے عظیم لوگ کھڑے

ہیں۔ یہ لوگ جو تمہارے حکم کے تابع ہیں۔ یہ ان گنت عورتیں جو تمہارے جسم کے تبرک سے فیض یاب ہونے کے لیے مضطرب رہتی ہیں یقیناً عظمت کی طرف تمہاری مساعی کا انعام ہیں ممکن ہے کسی دن تم کسی بڑے انعام کے مستحق ٹھہرو۔ ممکن ہے تمھی وہ شخص ثابت ہو۔ اگر تم اس سرزمین کی لا تعداد عالموں کی طرح اس کی خوشنودی کی آخری منزل تک نہ پہنچے تو بھی تم زیاں کا سودا نہیں کرو گے۔ تمہیں زماز سوچنی گئی ہے۔ ایسے نادر تحفے غلاموں کو نہیں ملا کرتے۔“ سمورال نے تلخی سے کہا۔

”کاہن اعظم! تمہاری گفتگو سے مجھے انکروما کے فاضل بزرگ یاد آ رہے ہیں جنہوں نے مقدس اقبالہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ خاکم بدہن وہ کہتے ہیں اقبالہ ایک سراب ہے۔ ان کے ہاں میں نے جید عالم دیکھے۔ مجھے گرونا اور گورے نے سمجھایا تھا کہ میں انکروما میں رہ کر اسی دن کے انتظار میں رہوں جب وہ مقدس اقبالہ کی سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیں گے لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ آخر میں وہاں سے چلا آیا۔ وہ سچ کہتے تھے۔“ میں نے افسردگی سے کہا پھر میں کمرے میں پھیلتا ہوا دھواں دیکھ کر کہا۔ ”یا وہ غلط کہتے تھے۔“

”تم یہاں آزادی سے گفتگو کر سکتے ہو۔“ سمورال نے میرے اندیشے کو گھٹ کر کہا۔ ”ہاں تم نے انکروما میں اور کیا دیکھا؟“

☆=====☆=====☆

شکنجہ

شکنجہ ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گذشتہ کچھ سال سے ”ٹریک ٹو ڈپلومیسی“ کا غلغلہ کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جا رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جوڑنگ آلود دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین و حضرات اپنی مساعی سے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن..... اس ٹریک ڈپلومیسی کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل رچایا جا رہا ہے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں ”بھولے بادشاہوں“ کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانسی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ”را“ پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا دھندہ کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے ایکشن ایڈونچر جاسوسی سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

میں اسے تمام تر دلچسپی سے انگریزوں کے واقعات سنانے لگا۔ میں نے نیشا، کیشا کا تذکرہ کیا۔ ہریکا کا معرکہ سنایا۔ سمورال کی سماعت کا اشتیاق دیکھ کر میں کسی قدر جھجکا۔ پھر میں نے وہ واقعات دانستہ طور پر سرسری انداز میں بیان کرنے شروع کر دیے۔ ”اور میں آگیا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر تم وہاں سے آ کیسے گئے؟“ سمورال نے پوچھا۔

”میں.....“ میں نے کسمسا کر کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم میں نے ایک دن آنکھ کھولی تو میں کشتی میں تھا اور میری کشتی جزیرہ توری کی طرف گامزن تھی۔“ میں سمورال سے سرنگ کی دیوی کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سمورال کو انگریزوں میں ہونے والے واقعات کا قطعی علم نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بڑے فصاحت سے اس کے سامنے دروغ گوئی سے کام لیا۔

”تم نے ایک دن خود کو کشتی میں پڑا پایا اور تمہارے پاس مقدس ہریکا کی نایاب آنکھیں بھی تھیں؟ تمہارے تمام تحائف بھی محفوظ رہے؟“ سمورال نے میرے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کے انداز میں پوچھا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی بڑی طاقت کا کرشمہ تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ہریکا کی مقدس آنکھوں پر عرصے سے میری نظر تھی۔ میں اکثر فرار ہونے کے خیال سے ساحل پر جایا کرتا تھا اور ناکام واپس آ جاتا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے گروہ میں شامل کرنے کے لیے کوئی جبر نہیں کیا تھا۔ جب تمام راستے مسدود معلوم ہوئے تو میں نے شکست تسلیم کر لی تھی۔ پھر گورمے مجھے ہریکا کے شکار کو لے گیا۔ اس نے وہ آنکھیں اپنے طلسم خانے میں میرے سامنے رکھی تھیں۔ میں وہ آنکھیں اپنے ساتھ باہر لے جایا کرتا تھا۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ جب مجھے وہ غیبی مدد ملی تو آنکھیں میرے پاس تھیں۔“ میں نے سمورال کو مطمئن کرنے کے لیے کچھ حقیقت اور کچھ افسانے پر مشتمل داستان سنائی۔

سمورال میری بات سے مطمئن ہو گیا یا نہیں؟ میں نے یہ جاننے کے لیے سر اٹھانے کی جرات نہیں کی اور اس سے درخواست کی۔ ”میں انگریزوں میں بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا لیکن ہمیشہ اس کی پرچھائیاں میرے ساتھ رہیں۔ بہر حال اب جبکہ میں آرزوئیں اور امیدیں دل میں بسائے جزیرہ توری میں واپس آ گیا ہوں۔ مقدس سمورال! تم نے مجھے اور پریشان کر دیا ہے تم نے کہا تھا کہ شوالا کے بعد میری حیثیت ایک فریق کی نہیں رہے گی۔ میں نے کہا تھا کہ تم مجھے جمرال کی جگہ سمجھو۔ میں خود کو تمہاری خدمت میں پیش کرتا ہوں اور تمہارے احکام کا ہمیشہ پابند رہنے کا عہد کرتا ہوں۔ میں اس کے خیال سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میرے سینے میں اپنا علم منتقل کر دو میں تمہاری ترام ہوں۔ مجھے اپنی عظمت کا سہارا دو۔ میں تمہاری محسوس کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”تم اپنے قبیلے میں واپس لوٹ جاؤ اور زمازی آغوش کی گرمی سے اپنے اندر حرارت پیدا کرو، تم کتنے بد بخت ہو کہ مقدس اقبال کا عطیہ مسترد کر رہے ہو؟ سر بلندی چاہتے ہو تو قناعت کا وتیرہ چھوڑ دو دیوتا تمہاری طرف مثبت نظر رکھتے ہیں۔“

”دیوتا میری طرف مثبت نظر رکھتے ہیں۔ مقدس اقبال کی خصوصی نوازشیں میری طرف ہیں۔ جارا کا کا‘ کا مجھ پر سایا ہے۔ سمورال میرا محسن اور اتالیق ہے۔ میں تین قبیلوں کا سردار ہوں۔ آہ یہ کتنی دل خوش کن حقیقتیں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ایسی بلندی پر جلوہ فگن ہے جہاں پرندے بھی پرواز کر کے نہیں پہنچ سکتے۔ یہ خوب نظام ہے کیا دلچسپ ہے یہ طلسم۔“ میں نے پھکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

”جو اس کے طلسمی نظام کا اسیر ہے، وہ یقیناً اس کے حسن جہاں تاب کا زخمی ہے۔ جو اس کی طلب کرتا ہے اور اس کی زلفیں چھونے کی جستجو میں دوڑتا ہے، وہ اس سرزمین میں کوئی درجہ ضرور پاتا ہے۔ وہ جارا کا کاکی نمائندہ ہے۔“ سمورال نے اپنی نشست سے اٹھ کر مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”جابر بن یوسف! تمہاری دنیا اور یہاں کی دنیا میں کوئی مطابقت نہیں جو تم سے کہہ دیا گیا۔ اس پر عمل کرو۔ تمہارے بازوؤں میں فولاد ہے۔ ابھی سے اس کے حصول کا دعویٰ ایک مضحکہ ہے۔ تمہارے آگے بہت سے لوگ کھڑے ہیں ان کے آگے جانے میں تمہیں شجاعت و ذہانت کے اور معرکے سر کرنے ہوں گے۔ تمہارا سینہ اور چہرہ اس نجوم میں نمایاں ہونا چاہیے۔“ سمورال نے اکتاہٹ سے کیا۔

”مگر یہ سب کیا ہے؟ وہ کون ہے اور یہ سب کیوں ہے؟“ میں نے پہلی بار گستاخی کی جسارت کی۔

سمورال نے ایک بار پھر عبادت گاہ کا طواف کیا اور دھواں تیز کرنے کے لیے کچھ اور سفوف آگ کے سپرد کر دیا۔ جب دھوئیں کے مرغولے تیز ہو گئے۔ تو وہ بولا۔ ”اس سوال کے جواب کے تم اسی وقت متحمل ہو سکتے ہو جب تمہارے دماغ میں ایک ہاتھی کی وسعت پیدا ہو جائے۔“ میں نے سمورال سے دوبارہ اپنے جنون کی تکرار کی۔ کیونکہ اس ذکر میں مجھے ایک لذت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے کلام بند کر دیا۔ اور میں نے اس کی عبادت گاہ کا ہر چیز کا بہ نظر جائزہ لینا شروع کر دیا۔ میں طلسمی کڑھاؤ کے پاس گیا اور میں نے اس سے فرمائش کی۔ ”کیا اس جلتے ہوئے تیل میں اس کا عکس زیریں نظر نہیں آ سکتا؟“

”نہیں..... کاش یہ ممکن ہوتا۔“ سمورال نے حسرت سے کہا۔

”تمہارا یہ طلسم مجھے بہت پسند آیا۔ عظیم سمورال! تم مجھے اس کا علم سوچنے میں بخل سے تو کام نہیں لو گے؟“

”یہ تمہارے انہماک پر منحصر ہے، میں تمہیں کچھ سکھانے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔“

سمورال کی زبانی یہ بات سن کر میں نے بے چینی سے کہا۔ ”یہ میری سعادت ہے۔“ میں نے آگے بڑھ کر اس کے پیر کا انگوٹھا چوم لیا۔ ”تمہارا ساتھ اور سہارا رہا تو میرا اضطراب ختم ہو جائے گا۔ اتنی وحشت انگیز باتیں سن کر میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن میں جہراں سے زیادہ مستعد ہونے کی کوشش کروں گا..... یہ کڑھاؤ۔ یہ عصا..... میں خود کو اس عبادت گاہ میں رکھے ہوئے نوادر کے استعمال کا اہل ثابت کروں گا۔ میں خط غلامی تحریر کرتا ہوں۔“

میں یہاں کچھ اور کہنے آیا تھا۔ سمورال نے آج پہلی بار مجھ سے اتنی طویل اور اپنائیت کی گفتگو کی تھی۔ میں نے اسے اعتماد میں لینے کے لیے زبان و بیان کی ساری قوتیں صرف کر دیں۔ سمورال نے مجھے عبادت گاہ میں کسی روک ٹوک کے بغیر آنے کی اجازت دے دی تھی میں اس کے طلسمی کڑھاؤ پر جھکا ہوا تیل کے مدد جزر اور ارتعاش میں جزیرہ توری کے مختلف مناظر دیکھ رہا تھا۔ سمورال میری ہر فرمائش پوری کر رہا تھا۔ اس طرح میں کڑھاؤ کا نظام جاننے کا خواہش مند تھا، آخر میں نے اسے کہا۔ ”میں سرنگا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

سمورال کے چہرے پر کھنچاؤ سا پیدا ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ کا عصا تیل میں ڈال کر اسے گھمایا اور مختلف طریقوں سے تیل کی سطح پر کوئی منظر ابھارنے کی سعی کی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ خاصی دیر تک طلسمی کڑھاؤ میں لکڑیاں جلانے، آگ تیز کرنے اور متعدد عمل دہرانے کے

باد و سردنگ کا چہرہ نمودار نہیں ہوا۔ مجھے سمورال کی ناکامی پر مسرت ہو رہی تھی اور میں سرنگا سے وابستگی پر فخر محسوس کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ سمورال کیوں ناکام ہے؟ میں نے کہا۔ ”مقدس کا بہن! میں اجازت چاہتا ہوں۔ میں دوبارہ اپنی منتشر قوتیں یک جا کرنے کی کوشش کروں گا۔ تمہارے مشورے پر میں نماز کا شگفتہ سرا پاپا اپنی آغوش میں سمیٹ لوں گا کیونکہ یہ اس کا عطیہ ہے جو سب سے طاقت ور ہے۔ جو مطلق العنان ہے۔ بڑی طاقت چھوٹی طاقتوں سے یقیناً سوا ہوتی ہے۔ تمہارے معنی خیز کلمات سے میں اپنا وزن کر رہا ہوں۔ میں نماز کو اتنی زور سے بھیجوں گا کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ ادھر تم اپنے دل اور اپنی عبادت گاہ میں میری نشست کی گنجائش پیدا کرو۔“

سمورال طلسمی کڑھاؤ میں الجھا ہوا تھا، عبادت گاہ میں کثیف دھواں درود یوار پر چھایا ہوا تھا۔ ”تم نہیں جاسکتے۔“ اس نے چونک کر کہا۔ ”ٹھہرو۔“ کڑھاؤ سے ہٹ کر اس نے پانی کے ایک برتن میں اپنا ہاتھ ڈال کر چاروں طرف پانی چھڑکا۔ دھواں لمحوں میں صاف ہو گیا۔ پھر اس نے جارا کا کاکھی کھوپڑی دروازے سے ہٹائی اور مجھ سے کہا۔ ”تم جاسکتے ہو۔“

کا بہن اعظم سمورال سے مزید سوال و جواب کا موقع نہیں تھا۔ وہ کچھ مکدر سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے غار سے نکل کر میں نے اطراف میں دیکھا۔ درختوں نے اندھیرا اور دبیز کر دیا تھا۔ سمورال سے آج کی ملاقات گزشتہ ملاقاتوں سے مختلف تھی۔ اس نے اپنی عبادت گاہ ماورائی طاقتوں سے روپوش کر کے مجھ سے راز دارانہ باتیں کی تھیں۔ اور انگریزوں کے حقائق کرید کرید کر پوچھنے چاہے تھے۔ میں نے اسے مکمل تفصیل سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ میں انگریزوں کے ذکر سے پہلے ہی سمورال کے اضطراب کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اس ملاقات سے سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ میرے ذہن کی بہکتی ہوئی رومیرے قابو میں آ گئی تھی۔ سمورال کے انداز بیان نے مجھے بعض نازک اور حساس باتوں کی طرف توجہ دینے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس طلسمی نظام کا خاکہ میرے ذہن میں ترتیب پا رہا تھا اور اب میں اپنی کوتاہیوں اور خوش اعتقادیوں کے بارے میں کوئی معقول رائے قائم کر سکتا تھا۔ یوں ہم سب لوگ ایک دوسرے کے حریف تھے اور یوں ہم سب لوگوں کو اس کے سحر حسن نے جکڑ رکھا تھا میرے عزائم نہ اس وقت اتنے پست تھے کہ میں ٹوٹ کر زمین پر لیٹ جاتا اور نہ اتنے بلند کے مجھے اپنے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپتی محسوس ہوتیں۔ میں ایک معتدل شخص تھا اور مجھے نماز کا کشش انگیز بدن اس سمت راغب کر رہا تھا جہاں میں اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ بستی سے دور اس درخت کے نیچے۔

وہ وہاں نہیں تھی۔ میں نے اسے آواز دی۔ ”اے چمن زارا اقبال کی کلی! محترم نماز! تم کہاں ہو؟ میری نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاؤ دیکھو کہ میری نگاہوں میں شرم ساری اور میرے قلب میں بے قراری ہے۔ آؤ کہ میں اپنے تشنگ اور اضطراب پر ملامت کر چکا ہوں۔ آؤ کہ میرا بدن جل رہا ہے۔“ اس کے خیرہ کن وجود کے ظاہر ہونے میں دیر ہوئی تو مجھے اپنے جلتے ہوئے بدن میں سردی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ ناراض تو نہیں ہو گئی؟ کہیں وہ قصر اقبال میں واپس تو نہیں چلی گئی؟ میں اُسے آواز دیں دیتا رہا اور اپنے گزشتہ رویے پر ندامت کا اظہار کرتا رہا، میرا گلہ خشک ہونے لگا۔ آخر صبح کا ذب سے کچھ دیر قبل وہ نمودار ہوئی۔ ”نماز“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”بعض اوقات مہذب دنیا کے رشتوں اور آداب سے میرا الحاق ہو جاتا ہے۔ میں یہ بھول جاتا ہوں کہ ایک وسیع سمندر درمیان میں ہے۔ میں کا بہن اعظم سمورال کے پاس گیا تھا، اس نے مجھے احساس دلایا کہ میں کس جگہ کھڑا ہوں اور میرا مقام کیا ہے۔“

میں سرکشی و سرشاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نماز کو بستی میں لے آیا، بستی کی گلیوں میں رات بھر کے تھکے ہوئے مخمور لوگ اوندھے پڑے تھے۔ انھیں اپنے جسموں کا ہوش نہیں تھا۔ نماز میرے ساتھ میرے جھونپڑی نما مکان میں آ گئی۔ نماز کو کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے سرتی کی موجودگی کا کوئی خوف نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں بلند آواز میں کوئی بات نہیں کروں گا۔ اس نے کہا کہ تم صرف ہونٹ کھولنا میں ان کی حرکت سے معنی اخذ کر لوں گی۔ سو میں نے اس سے آہستگی سے کہا۔ ”یہاں پیال کے نرم و نازک بستر پر میرے پہلو میں دراز ہو جاؤ۔“ اس نے جواب دیا تمہاری شجاعت اور جنوں کے جو تہ کرے میں نے سنے تھے وہ سچ ہیں۔“ وہ میرے دل سے قریب ہوئی۔ صبح میں وقت کم تھا۔

جب آفتاب نے اپنی کرنیں زمین پر تقسیم کرنی شروع کیں اور میرا شمار ٹاٹو میں زیادہ تن دہی سے اپنے بارے میں سوچنے لگا، سرنگا کہتا تھا کہ ہمیں مہذب دنیا میں واپسی کے امکانات ہمیشہ سامنے رکھنے چاہیں۔ سرنگا کے پاس ایک عظیم دیوی تھی ایک چھوٹی سی مورتی جو ایک مکمل عورت کی شکل اختیار کر کے ناقابل یقین کارنامے سرانجام دے سکتی تھی۔ وہ یہاں اپنی مورتی کی سرکاریاں چھپا نہیں سکتا تھا۔ اور اسی لیے کئی بار معتبہ قرار دیا جا چکا تھا۔

سمورال نے جس انداز سے بعض حقائق اشارۃً بیان کیے تھے، وہ رہ رہ کر میرے ذہن میں فشار پیدا کر رہے تھے۔ احتیاط، اعتدال و دراندیشی، اس ملاقات کا مآل تھا۔ یہاں بات کرنا بھلا نا بھی مشکل تھا، روشنی کی پراسرار لکیریں۔ نادیدہ سراغ رساں ہر سمت لگے رہتے تھے۔ سرنگا پران کی کڑی نظر تھی۔ اور احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں سرنگا کے غار میں اس سے مشورے لینے کے لیے کم سے کم جاؤں۔ حالانکہ ایسے عالم میں سرنگا کی ذات میرے لیے ایک بڑا سہارا تھی۔ تاریک براعظم میں اتنے مصائب جھیلنے کے بعد کم از کم زندہ رہنے کا آسرا ضرور ہو گیا تھا۔ جسے زندگی کا شوق ہو، اس کے لیے یہ بات کیا کم ہے وہ زندہ ہے۔ اور زندگی کا شوق کسے نہیں ہوتا؟ مجھے بھی تھا میں یہاں اس وقت تک سرخ رو تھا جب تک جزیرہ توری میں یا آس پاس کے علاقوں میں میرے مقابلے کا کوئی اور شخص پیدا نہیں ہو جاتا۔ قناعت میں امان ہے۔ قناعت میں زندگی ہے مگر موت زدہ زندگی جزیرہ توری میں محبوس ہو کر میں اپنے آپ کو طویل المیعاد زندگی کی ضمانت دے سکتا تھا، لیکن عورتوں، شرابیوں اور غلاموں پر قانع ہو جانا میرے مزاج کو راس نہ تھا۔ اب بھی میرے دل میں اضطراب کا ایک شعلہ روشن تھا۔ ایک مبہم امید شاید سنگلاخ چٹان میں سبزہ و گل پیدا ہو جائیں۔ ایک بیبا غصہ جو قناعت کو موت سمجھتا تھا اور ہر طرف ہا ہو کر کے شور مچانے کو اکساتا تھا۔ ایک خفیف امکان۔ شاید اس حرکت و طاقت میں واپسی کی کوئی صورت نکل آئے؟ شاید میں نے اپنی افتاد طبع اور قلبی کیفیتوں کی وضاحت کر دی ہے۔

صبح ہوتے ہی میں اپنے ٹھکانے سے اٹھا اور نماز سے کہا کہ وہ مجھ سے دُور دُور نہ رہے۔ نماز نے خوش ادائی سے میری خواہش پر ہر وقت نمودار ہونے کا وعدہ کیا اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے فزار اور زارے کو طلب کیا۔ رات بھر جشن میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے ان کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنے لہجے میں وزن پیدا کیا اور بولا۔ ”معزز زارے اور فزارو! تمہارے سردار جابر بن یوسف نے توری کے دوسرے قبیلے کے سردار شوالا کو شکست دی ہے اور وہ اب دونوں قبیلوں کا حکمران ہے۔ تمہارا سردار محسوس کرتا ہے کہ مقدس اقبال کی خوشنودی کے لیے صرف یہی مناصب کافی

نہیں ہیں کہ وہ تین قبیلوں کا سردار ہے۔ اس کا مقام شجاعت کے علاوہ بھی بلند ہونا چاہیے۔“

”بے شک۔“ فزار اور زار نے ایک زبان ہو کر کہا۔

”معزز لوگو! پس یہ لازم ہے کہ قبیلے کی بیشتر ذمہ داریاں وہ اپنے نائبین کو سونپ دے اور خود حصول علم اور دیوتاؤں کی نظر میں اپنا مرتبہ

بالا کرنے کے لیے بستی سے دور جنگلوں میں چلا جائے۔“ میں نے کہا۔

فزار اور زار نے میرے مخاطب کی تبدیلی پر حیرت ہوئی ہوگی۔ انہوں نے سر جھکا دیے اور پھر اطاعت اور فرمانبرداری کی علامت کے

طور پر زمین پر لیٹ گئے۔ ”میں جو کہتا ہوں اسے اپنے کانوں میں محفوظ کر لو۔ میں تم دونوں کو امانت توری کی نیابت دے رہا ہوں۔ شوالا کے قبیلے کی

نیابت اور دوبارہ آباد کاری زار نے سپرد کی جاتی ہے اور میرے قبیلے کا نائب فزار ہے۔ قبیلے میں ایسی حد بندیاں ختم کر دی جائیں جو شوالا اور

کالاری کے زمانے میں تھیں۔ زمین اور آبادی نصف نصف تقسیم کر لی جائیں۔ میں یہیں توری میں موجود رہوں گا اور تم دونوں کے کام کا جائزہ لیتا

رہوں گا لیکن قبیلے کے فیصلے، انتظامی امور، غذا اور پناہ کے معاملات تم دونوں کو اس وقت تک سنبھالے رکھنے ہوں گے جب تک میں خود یہ امور اپنی

نگرانی میں نہ لوں۔ قبیلے کی ہر نوجوان لڑکی سب سے پہلے میرے ملاحظہ کے لیے پیش کی جائے گی۔“

میرے اس جملے پر انہوں نے حیرت سے سر اٹھا کر دیکھا لیکن میں نے اپنے احکام جاری رکھے۔ ”تم اہم معاملات میں کسی بھی وقت

اپنے سردار سے مشورہ کر سکتے ہو۔ تم جانتے ہو جابر بن یوسف نے یہ مقام کس طور پر حاصل کیا ہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ اس کے پاس کیسے کیسے نادر

تحائف موجود ہیں؟ اور تم اس امر سے بھی واقف ہو گے کہ اس مقدس اقبال کی خوشنودی حاصل ہے۔ سرکشی اور سازش کی سزا بہت شدید ہو سکتی ہے۔“

میں نے شپالی زار کے جسم پر پھینک دی، وہ تڑپ کر زمین پر لوٹنے لگا، اس کی کمر میں ایک بڑا داغ پڑ چکا تھا، مقدس چوٹی اٹھ رہا متحرک کر کے میں

نے فزار کی طرف روانہ کر دیا وہ فزار کے جسم پر ریگنے لگا اور فزار خوف و ہراس کے عالم میں زار کے اتباع کرنے لگا۔ پھر اٹھ ہا شپالی منہ میں لے

آیا اور میرے گلے میں لٹک کر دوبارہ ساکت ہو گیا۔ میں نے ان دونوں کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ ”تم نے دیکھا؟“

”ہاں جابر بن یوسف اے مقدس سردار!“ زار نے احترام سے کہا۔ ”تمہیں اپنے نوا در کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا

مقام ہمارے قلب میں کندہ ہے ہم تمہارا بہترین ہتھیار ثابت ہوں گے۔ فزار نے بھی اسی قسم کے کچھ جملے ادا کیے۔

”سرنگ کی نوجوان لڑکی سرتیا اسی مکان میں رہے گی اور تم دونوں اس کی خواہش مقدم سمجھو گے۔ اس کے لیے بہترین غذائیں اور

خادماں مہیا کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔“

دونوں نے دوبارہ روایتی طور پر اطاعت کا مظاہرہ کیا۔ انھیں واپسی کا حکم دے کر میں سرتیا کے کمرے میں آیا۔ اس کے بدن پر توری کی

لڑکیاں جڑی بوٹیوں کے تیل سے مالش کر رہی تھیں۔ اچھی خوراک اور مسلسل آرام کے باعث سرتیا کا حسن نکھر آیا تھا۔

☆=====☆

آئندہ دو دنوں میں شوالا کے قبیلے سے آئے ہوئے لوگ اپنے علاقے میں منتقل ہونے لگے۔

ان کی منتخب لڑکیاں میرے ملاحظے کے لیے پیش کی جاتی ہیں میں نے چند معیاری دوشیزائیں علیحدہ کر کے باقی لڑکیاں زارے اور فزارو کے سپرد کر دیں۔ دو دنوں تک یا تو میں نماز کے ساتھ رہا یا اپنی سیاہ فام خادماؤں کے ساتھ۔ میں نے اپنے قبیلے کی چیدہ چیدہ لڑکیاں اپنے لیے وقف کر لیں۔ میرا مکان ان دو دنوں میں عورتوں سے بھر ا رہا۔ سربتا خاموشی سے یہ تغیر دیکھ رہی تھی۔

دو دنوں کی کسل مندی کے بعد میں کاہن اعظم سمورال کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے اپنے فیصلے سے مطلع کیا کہ میں جزیرہ توری کے دو نو قبیلوں کے لیے نائب مقرر کر کے اس کے پاس حصول علم کے لیے آیا ہوں۔ میں نے مشعل کی لومیں دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی جلا کر عہد کیا کہ میں ہمیشہ اس کا وفادار اور مطیع رہوں گا۔ میں نے کہا: ”سب مقدس اقالما کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرنے اور انی قوت و عظمت بڑھانے کا اقدام ہے۔“

میری آمد سے کاہن اعظم کی آنکھ کی چمک بڑھ گئی اور اس نے شفقت سے میرے سر کے بال کھینچ لیے میں نے فوراً غار سے باہر جا کر ایک ہرن شکار کیا اور اس کی کھال ادھیڑ کر عربی ذائقے کا گوشت بھون کر سمورال کو کھلایا۔ مجھے معلوم تھا یہ اس کی مرغوب غذا ہے۔ وہ مجھے غار کے ایک تاریک گوشے میں لے گیا اور کمر کھود سے اس نے پتھر کا ایک برتن نکال کر اس کا محلول میرے جسم پر اندل دیا۔ نکال کر ایک مجھے اس محلول پر ہوا جسے محلول

میرے مساموں میں داخل ہو رہا ہے۔ مجھ پر ایک نشہ آور کیفیت طاری ہو گئی اور میں نے نشے کی حالت میں سمورال سے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا، تاریک برعظم میں اپنے عزائم بتائے اور اقبال کی بارگاہ میں پہنچنے کے بڑے بڑے دعوے کیے۔ یہ پہلا دن تھا کہ رمی طور پر سمورال نے مجھے شاگرد کی حیثیت سے سرفراز کر لیا۔ اس سے پہلے اس نے مجھ کو ایک عساکر کا طلسمی وظیفہ بتا دیا اور مقررہ اجارہ کا کاروبار شروع کیا۔

مسترس ہو گئی۔ اس وقت کا بن اعظم فیاضی پر اتر آیا تھا۔ میں نے کڑھاؤ کے نیچے آگ جلا کر سمورال کا مخصوص سفوف تیل میں ڈال کر کوشش کی کہ سرنگا

پھر میں نے زارے، فزارو کی مصروفیات دیکھیں، قبیلے میں تیزی سے کام ہو رہا تھا، پھر اچانک مجھے ڈاکٹر جواد کا خیال آیا۔ شوالا اور میرے مقابلے

یہ سب باتیں سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔

۴۔ میں نے وہیں ہڑے ہڑے پھنکار ماری۔

”کیا ہوا؟“ کاہن اسکیم مجھ سے بولا۔ وہ دور بیٹھا کوست

”کچھ نہیں..... وہ طیب جو اول نظر آ گیا تھا۔“ میں نے لڑکھرائی زبان سے کہا۔

کردے۔ رات کے وقت میں اس کے غار سے چلا آیا۔ میری نس نس میں ایک عجیب غبار چھایا ہوا تھا۔ میں پتھر راستے سے ہٹا تا گر جتا اور چیخا ہستی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہستی میں میری آمد سے ہلچل مچ گئی۔ میں نے فرار کو حکم دیا کہ صبح تک ڈاکٹر جواد کو میرے مکان پر حاضر کیا جائے۔ میں نے اس کا پتہ بتایا اور مکان میں داخل ہو کر نماز کو آواز دی۔ وہ آگئی۔

صبح صادق کے وقت میرے دروازے پر فرار اور زارے موجود تھے۔ ان کے پیچھے زارے کے جانوروں کے وسط میں ڈاکٹر جواد کھڑا تھا۔ مجھے تاریک بر اعظم کے دستور کا علم تھا کہ طبیبوں کو وہاں خاص مراعات حاصل ہیں۔ ڈاکٹر جواد پر کسی زمانے میں ایک اقا بوقیعات تھا اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو حالات کچھ اور ہوتے۔ مہذب دنیا کا یہ شخص میرا ساتھی۔ یہ بد نصیب میرا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اگر میں اس کے زہر سے مر جاتا تو سرنگا اور سرتیا کو بھی موت کا جام نوش کرنا پڑتا۔ جواد مجرموں کی طرح زمین کی طرف نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ میرے صرف ایک اشارے پر نیزوں سے اس کا جسم چھلنی ہو سکتا تھا۔ سرتیا بھی باہر آگئی تھی اور حقارت سے اس بے غیرت شخص کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر جواد کی گرفتاری کی اطلاع ملتے ہی نماز رخصت ہو گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اپنے غصے کا اظہار کس طرح کروں؟ ”ڈاکٹر جواد کیا تجھے اب بھی کسی رعایت کی توقع ہے؟“

”مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے سیدی!“ اس نے خجالت سے کہا۔

”فرعون بے ساماں! تو اسے غلطی کہتا ہے؟“

”یہ کیسے سیدی جاہل! یہ کم ظرفی ہے۔“ وہ مردہ آواز میں بولا۔

”آہ سارے الزام تیرے لیے بیج ہیں۔ تو یقیناً ایک عرب نہیں ہے۔ تیرے خون میں خرابی ہے۔“ میں نے لرز کر کہا۔

تمہاری ہر گالی مجھ پر بجتی ہے۔ فیصلے میں دیر نہ کی جائے مجھے سزائے موت دی جائے۔“

”موت؟“ میں نے تحقیق آمیز لہجے میں کہا۔ ”اے بد بخت شخص تو نے اپنے لیے کتنی آسان سزا تجویز کی ہے۔“

”میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ میں نے تمہارے اعتماد کو دھوکا دیا ہے سیدی جاہل! اب کوئی ندامت میری غلطی کا تذراک نہیں کر سکتی۔“

”ڈاکٹر جواد! کیا تیرا دماغ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا؟ تجھے معلوم ہے کہ تیرے ساتھی نے جزیہ توری میں کتنی منزلیں سر کر لی ہیں؟ مقدس

اقبالا کی نظروں میں اس کا مقام کیا ہے؟ کیا تو نے میرے سینے پر نظر نہیں ڈالی تھی؟ تو اس حقیقت سے باخبر نہیں تھا کہ میں کتنی بار موت کے منہ میں گیا ہوں گا؟ تو نے میری اقبال مندی مصنوعی سمجھی تھی؟“

”مجھے حقائق کا علم تھا سیدی! لیکن میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ تم نے یہ تمام فتوحات تاریک بر اعظم کی عظیم الشان

ملکہ اقبال کے لیے کی ہیں اور میں نے.....“

جواد کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ”خاموش کیوں ہو گیا؟ صاف کیوں نہیں کہتا کہ تو اپنے ایک ساتھی کی درخشنی سے

ناخوش تھا۔ تو حاسد ہے۔“

”یہ غلط ہے سیدی! لیکن میری بساط الٹ چکی ہے۔ اب کسی جرح کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ میں سزا کا

منتظر ہوں۔“ ڈاکٹر جواد نے بے خوفی سے کہا۔

”نہیں ڈاکٹر!“ میں نے غضب میں کہا۔ ”میں تیری زبان سے وہ نکتہ اگلوانا چاہتا ہوں جس نے تجھے عقل و ہوش سے بے گانہ کر دیا تھا۔“ اس نے خاموشی غنیمت سمجھی لیکن اس خاموشی نے میرے قہر میں اور اضافہ کر دیا۔ میں نے چیخ کر اپنا سوال دہرایا۔ جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنا دانش مندی کے منافی تھا۔ کیونکہ اقبال اس پر مہربان رہ چکی تھی۔ میں ان پنے تلے نیزوں کو حرکت کا حکم دے سکتا تھا جو اسے نشانے پر لیے ہوئے تھے مگر میں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ میں نے ڈاکٹر جواد کے لیے کسی اندھیرے غار میں قید تنہائی کی سزا کا ارادہ کر لیا۔ پھر میں اس خبیث کوسرا سنانے کا اعلان کرنے ہی ولا تھا کہ خلاف معمول دور سے سرنگا آتا دکھائی دیا۔ وہ تیز قدموں سے آ رہا تھا۔

”محترم سرنگا تم؟ اچانک کیسے آ گئے؟“ میں نے اسے خوش آمدید کہتے ہوئے کہا۔ ”ذرا ٹھہرو میں اس وقت ایک مقدمے کا فیصلہ کر رہا ہوں، سرنگا کیا تم اپنے اس مہذب ساتھ کو پہچانتے ہو؟“

”میں اسی کے سلسلے میں غار سے اٹھ کر آیا ہوں۔“ سرنگا نے آہستگی سے کہا۔ ”میرے ساتھ اندر چلو۔“

”کیا تم اس کی سفارش کرنے آئے ہو؟“ میں نے ناراضی سے پوچھا۔

”ہاں۔ مجھے اس کا حق پہنچتا ہے۔ میں تم سے فیصلے بدلوا سکتا ہوں۔“

”سرنگا! یہ قابل گردن زنی ہے۔“

”بے شک۔ لیکن میں اس کی معافی کی درخواست کرنے آیا ہوں۔“

”کیوں؟ تم اس کا جرم جانتے ہو؟“ میں نے جھلا کر کہا۔

”اسے چھوڑ دو سیدی جابر! دوبارہ اس سے ایسی حماقت سرزد نہیں ہوگی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔“ سرنگا نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

”سرنگا! یہ ڈاکٹر جواد ہے۔ اس نے سرتاپا پر شرمناک حملہ کیا تھا اس نے تمہارے دوست کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”کیا تم میری سفارش لائق اعتنا نہیں سمجھتے؟“

”درست ہے۔“ میں نے نڈھال ہو کر کہا۔ ”فزارو، زارمے ڈاکٹر جواد کو چھوڑ دو اور اسے قبیلے کے عام شہریوں میں شمار کر لو۔“

میرے فیصلے پر ڈاکٹر جواد بے اختیار محافطوں کا دائرہ توڑ کر میرے پاس آیا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ ”سیدی جابر! تم ایک عظیم آدمی ہو۔“

اور سرنگا تم۔“ وہ سرنگا کے گلے لگ گیا۔ ”تم یقین کرو میں تمہارے اعتبار کو کبھی صدمہ نہیں پہنچاؤں گا۔“

فزارو اور زارمے میرے فیصلے پر دم بخود تھے۔ ڈاکٹر جواد رہا ہو کر شادمانی کے عالم میں رقص کر رہا تھا۔ میں سرنگا کے ساتھ اندر چلا آیا۔

سرنگا نے کمرے کے اندر ایک گہرا سانس لیا۔ ”سیدی جابر! اس کمرے میں یقیناً کوئی اور بھی ہے۔“

سرنگا کا قیاس درست تھا۔ نماز اندر موجود تھی جو اسے نظر نہیں آتی تھی۔ اور میں اس سے اس وقت باہر جانے کی درخواست بھی نہیں کر سکتا

تھا کیونکہ سرنگا کی آمد کے بعد میری یہ درخواست مشکوک اقدامات میں شامل ہو جاتی۔ ”ہاں محترم سرنگا! مقدس اقبال کا ایک پیش بہا عطیہ میری سیرائی

جاں کے لیے یہاں موجود ہے۔“

”اوہ اقبال! مقدس اقبال!۔“ سرنگا نے پورے احترام سے کہا۔ ”سیدی جابر! کیا تم ہماری نظر کو اس سعادت سے محروم رکھو گے؟“

”میں کسی دن اس نادر عطیے کا جلوہ تمہیں بھی ضرور دکھاؤں گا۔“ میں نے نماز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری بوڑھی آنکھوں کی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

بینائی بڑھ جائے گی۔“

سرنگا مقدس اقبال کے جاہ و جلال کے گن گانے لگا۔ میں اس سے ملاقات کا طالب تھا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں اسے سمجھایا کہ میں

جلد ہی اس کے پاس آؤں گا۔ اس وقت ڈاکٹر جواد کی رہائی کے سلسلے میں اس کی سفارش پر بحث کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔

”سیدی جابر! تمہیں میری گزشتہ گفتگو یاد ہے؟“

میں نے ذہن پر زور دے کر اور سمجھ کر کہا۔ ”ہاں۔“ سرنگا مہذب دنیا میں واپسی کے امکان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میں نے نماز کا خیال کر کے کہا۔ ”کاش وہ میری التجائیں سن لے۔“

”سرنگا دل میں ایک ہی حسرت باقی ہے۔“

”وہ فیاض ہے جب اس نے تمہیں اتنا نوازا ہے تو آئندہ بھی وہ بخل سے کام نہیں لے گی۔ وہ تمہیں شاد کام کرے گی حوصلہ رکھو سیدی جابر!“

”سچ ہے سرنگا! تم حق کہتے ہو۔ میں مستقل اس کی نگاہوں میں رہنا چاہتا ہوں۔“

”اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تم عقل و ہوش، عالمانہ اور بہادرانہ فضیلتیں بڑھاتے رہو۔“ سرنگا نے عقیدت سے کہا۔

<http://kitaabghar.com>

”میں نے بہت کچھ سوچا ہے۔ میں نے سوچا ہے۔۔۔۔۔“

”بس بس سیدی جابر!“ سرنگا نے مجھے روک کر کہا۔ ”پہلے عمل کرو۔ اس کے بعد دعوے کرنے کی عادت ڈالو۔“

سرنگا اٹھ کر دوسرے کمرے میں اپنی بیٹی سربیتا کے پاس چلا گیا اور چند لمحوں میں واپس آ گیا پھر مجھ سے اجازت لے کر وہ جانے کے لیے

تیار ہوا تو میں اسے دور تک چھوڑنے گیا۔ نماز میرے ساتھ تھی۔ میں نے سرنگا کا ہاتھ دبا کر اسے اپنے بارے میں غور کرنے کا اشارہ کیا۔ واپسی میں

مجھے دوبارہ ڈاکٹر جواد نظر آیا وہ ایک جھونپڑی کے دروازے پر کھڑا شراپ پی رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر اس نے ادب سے سلام کیا۔ ”سیدی جابر! اب

کھلے دل سے مجھے معاف کر دو۔“

میں سنی ان سنی کرتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میں نے تمام خادماؤں کو سربیتا کے کمرے میں بھیج کر نماز کو آغوش میں لے لیا۔ تم

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

نے اچھا کیا جابر بن یوسف کہ طبیب جواد کے سلسلے میں اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔“

”کیوں؟“ میں نے اس کا چہرہ سامنے کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا اس میں مقدس اقبال کی ایما بھی شامل تھی؟“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”مقدس اقبال فرار خدلی اور فیاض پسند کرتی ہے۔“ نماز جھکتے جھکتے بولی۔

”مگر ڈاکٹر جواد نے اپنے سردار سے غداری کی تھی!“

”مقدس اقبال اے اعتبار لوگوں کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ مگر طیب جو ادا از خود اس قبیح فعل پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔“

”اسے سوالا نے آمادہ کیا ہوگا؟“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کیا تم اس بارے میں کچھ جانتی ہو۔ مجھے اندھیرے میں نہ رکھو۔“ میرے اصرار میں شدت پیدا ہو گئی۔

”طیب جو ادا پر ایک طیب کی حیثیت سے جا را کا کا کی خصوصی عنایتیں ہیں۔ میں تمہیں یہ خوش خبری سناتی ہوں کہ اقبال نے اس کے سلسلے میں تمہارے ہر فیصلے کی قبل از وقت توثیق کر دی ہے لیکن تم نے پہلے صحیح صورت حال جاننے کی کوشش تو کی ہوتی۔“

”میں نے اس سے پوچھا تھا لیکن وہ خاموش رہا۔“

”وہ ایک ذک پہنچا کر تمہیں دوسرا صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔“ نماز نے کہا۔

”پھر اسے کس نے آمادہ کیا تھا؟“ میں نے تشریحات سے پوچھا۔

”اسے تمہاری ساتھی فلورا نے لالچ دیا تھا۔“

”کیا؟ فلورا نے..... فلورا نے؟“

”ہاں اسی سفید فام لڑکی نے جو سوالا کے ساتھ تھی اور اب جزیرہ بیزنار میں نرنگا کے ساتھ ہے۔“

نماز کے اس انکشاف نے مجھے لرزہ بر اندام کر دیا۔ سفید فام فلورا نے ایک بار پہلے بھی سیاہ فام سوالا کو مجھ پر ترجیح دی تھی۔ لیکن دوسرے لمحے اس حقیقت نے مجھے سرشار کر دیا۔ مقدس اقبال کے رویے سے ظاہر تھا کہ وہ وسیع و عریض تاریک براعظم کے اس بے مایہ شخص پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ میری پرستش کا اثر ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر جو ادا کے سلسلے میں اس نے ہر فیصلے کی توثیق کر کے مجھے اپنی عنایتوں کی بشارت دی تھی وہ پری پیکر میرے تصور میں مسکراتی ہوئی ابھری۔

دوسرے دن صبح اٹھار کی طرح میں نے نماز کو اعتماد میں لے کر بعض طلسمی اسرار سمجھنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ لیکن فلورا کی چھانسن دل میں چھپی رہی۔

اسی دن میں دوبارہ کاہن اعظم کی اقامت گاہ پر تربیت کے لیے گیا۔ اتالیق ہونے کے باوجود کاہن اعظم کے لہجے اور رویے میں دوستی اور رازداری کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ میں نے مزید احتیاط اور احترام سے پیش آتے ہوئے کہا۔ ”مقدس کاہن! باگمان میں میرے نائب اسٹالانے مجھے چند ابتدائی اسرار کی تعلیم دی تھی اور میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اپنے باطن میں ایسی صفات پیدا کرنے کا خواہشمند ہوں جو دیواروں اور سمندر پار کی حرکات و سکنات کے بارے میں مجھے باخبر رکھ سکیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا، اس نے کہا تھا۔ تمہارے باطن میں سخت ریاضت کے بعد ایسی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم طلسمی اسرار کی تربیت کے ساتھ ساتھ میرے قلب و نظر اتنے توانا کر دو کہ میں زمین کے اندر دبی ہوئی چیزیں دیکھ سکوں۔“

”ہاں۔ ہاں جابر بن یوسف! سمورال نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آدمی میں دیوتا کی صفات پیدا ہو سکتی ہیں۔ مگر کوئی شخص دیوتا نہیں ہوتا جس نے جتنی محنت کی اپنے باطن کو اتنا ہی منور کیا۔ جس نے جتنی برداشت کا ثبوت دیا اپنے اوصاف میں اتنا ہی اضافہ کر لیا۔ ہر معزز اور نامور شخص اپنی اس

حد میں رہتا ہے جہاں تک اس نے ریاض کیا اور وقت صرف کیا۔ علوم باطن اور اسرار و کمالات کے کرشمے وقت اور انہماک کے ساتھ ساتھ فروغ پاتے رہتے ہیں۔ جمرال اور تم اسی منزل سے گزر رہے ہو، اور میں بھی میری بصارت اور سماعت بھی ابھی محدود ہے۔ میرے حواس ایک خاص مقام تک جا کر رک جاتے ہیں۔ میں نے ساری عمر اسی کوشش میں صرف کر دی ہے کہ میں ان کا دائرہ وسیع کرتا ہوں۔ لیکن جہاں دوسری برتر قوتیں حائل ہو جاتی ہیں وہاں یہ دائرہ بہت مختصر اور بعض اوقات معدوم ہو جاتا ہے۔ تم اپنے تمام علم و فضل کے باوجود اقبال کا حال نہیں جان سکتے ہاں اپنے برتر خیال سے صرف ایک بہتر قیاس کر سکتے ہو۔ طاقت ور باطن کا روشن دروازہ ہر وقت نہیں کھلا رہتا۔ اسے کھولنا پڑتا ہے۔ پھر کہیں اندر کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ تم یہ تمام علوم سیکھ سکتے ہو لیکن اس سے پہلے میں تمہارے اطراف میں پھیلی ہوئی ایسی چیزوں کا ادراک کراؤں گا جن کی ترکیب اور ماہیت بدل دینے سے کرشمے رونما ہوتے ہیں۔“ میں پوری توجہ سے کاہن اعظم کی اثر انگیز باتیں سن رہا تھا۔ آج پہلی بار اس نے اس قدر دیر تک مجھ سے خطاب کیا تھا۔

وہ مجھے اپنے غار سے ملحق ایک سرنگ میں لے گیا۔ غار کا یہ حصہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، حالانکہ میں اس کی اقامت گاہ کے چپے سے واقف تھا۔ وہ خود اسرار کی دنیا تھی۔ اندر جا کر اس نے ایک دیوار پر اپنے عصا سے ایک مربع بنایا۔ پتھر کی دیوار میں چمراہٹ ہوئی اور تھوڑی دیر میں ایک کمرے سے کسی درندے کی ہیبت ناک آواز سنائی دی۔ درندے کی دہاڑ اتنی خوف ناک تھی کہ مجھے کئی قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں نے شپالی گلے سے اتار کر روشن کی تو کمرہ منور ہو گیا۔ ڈگنی کے جتے کا ایک عجیب الخلقت جوڑا اس اندھیرے کمرے میں بند تھا۔ کاہن اعظم کو دیکھ کر ایک درندے نے جست لگائی اور میں حفظ ماتقدم کے طور پر اس کی پشت پر ہو گیا۔ کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بے لگام درندہ کاہن اعظم کے سامنے آکر، سر جھکا کے کھڑا ہو جائے گا۔ اور کاہن اعظم اس کے بڑے سینگ پکڑ کر اس کے دماغ میں خنجر سے سوراخ کرنے لگا۔ ”جابر بن یوسف!“ سمورال نے آواز دی۔ ”اس سوراخ پر منہ لگا دو۔“

ایک لٹلے کے لیے میرے ذہن میں شبہ ابھر کہ کہیں کاہن اعظم بداعتمادی کا مظاہرہ تو نہیں کر رہا ہے لیکن میں نے دوسرے ہی لمحے یہ شبہ جھٹک کر جانور کے دونوں سینگ پکڑ لیے۔ میرا سینگ پکڑنا تھا کہ عظیم الجثہ درندے نے ایک پھنکار بھر کر اپنے سر کو اوپر اچھال دیا، میں اگر سینگ چھوڑ دیتا تو دیوار سے جا ٹکراتا، لیکن اس زبردست جھٹکے کے باوجود میں نے اس کے سینگ نہیں چھوڑے اور اپنے حواس قائم رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔ میں ڈگنی جیسی بلا زیر کر چکا تھا۔ مگر اس کی پشت پر توازن برقرار رکھنے میں کئی بار میں نیچے گر پڑا۔ میں بار بار گر پڑتا اور وہ مجھے منوں میں ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ وہ اسی طرح مجھے نچاتے نچاتے اس وسیع کمرے میں دیوانہ وار گھومتا رہا، آخر میں بہ مشکل تمام اس کے دماغ پر اپنا منہ رکھنے میں کامیاب ہو سکا۔ میری زبان اس کا خون تیزی سے چاٹنے لگی۔

”مقدس کاہن! کیا میں ان کے جسموں پر شپالی رگڑ دوں؟ کیا میں اپنا چوبی اثر دہا متحرک کر دوں؟“ میں نے چیخنے ہوئے کہا۔

”نہیں تم اتراؤ۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لیے اور درندے نے تابع داری سے اپنے دونوں سینگ اس کے آگے کر دیے۔ پھر کاہن اعظم نے اسی طرح دوسرے درندے کو بلایا۔ ”اس کے تھنوں سے دودھ نچوڑ کر ایک برتن میں جمع کر تا رہا۔ مادہ خاموش کھڑی تھی۔ کاہن اعظم

بہت تیزی سے دودھ دودھ رہا تھا۔ برتن بھر کر وہ کمرے سے باہر آ گیا اور اس نے اسے دوبارہ اسی طرح بند کر دیا جس طرح کھولا تھا اب اس کے ہاتھ میں دودھ کا بھرا ہوا برتن تھا، جسے وہ عبادت گاہ میں لے آیا نصف دودھ ایک دوسرے برتن میں لوٹ کے باقی نصف دودھ پیالوں میں بھر دیا گیا پھر برتن چھت سے لٹکا دیا گئے۔ وہاں اس قسم کے اور بھی بہت سے برتن لٹکے ہوئے تھے۔ پیالوں کے دودھ میں اس نے چند جڑی بوٹیاں ملائیں اور بلند آواز میں ایک مخصوص عمل پڑھ کر مجھے اپنے ساتھ لیے غار سے باہر آ گیا۔ جنگل میں چلتے ہوئے اس نے سانپ کے بل تلاش کیے۔ جہاں کوئی بل نظر آیا۔ اس میں دودھ کے چند قطرے ٹپکا کر وہ کھڑا رہا سانپ بل سے باہر آ گیا۔ تو اس نے وہ پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ چند قطرے پینے کے بعد سانپ کی حالت غیر ہو گئی اور وہ مزید دودھ کی چاہت میں سمورال کے ہاتھ چاٹنے لگا۔ سمورال نے سانپ اٹھا کر اس طرح گلے میں ڈال لیا جیسے اس سے بڑی پرانی شناسائی ہو، پھر اس نے ایک دوسرے عمل سے اُسے چوبی ڈھانچے میں تبدیل کر دیا۔

ہم جنگل میں کئی جگہ یہ عمل کرتے رہے اور سانپ پکڑتے رہے یہ دودھ کی تاثیر تھی کہ واپسی کے وقت میری اور سمورال کی گردنوں میں متعدد لکڑیاں تھیں۔ جنہیں ہم نے دیوار پر ناٹک دیا اور باقی دودھ خود پی لیا۔ دن بھر کی اس مشقت کے بعد سمورال نے عبادت کے مخصوص پتھر پر بیٹھ کر اپنے پالتو درندوں کے بارے میں بتایا۔ اس خوف ناک درندے کا نام راٹ تھا۔ وہ دیوتاؤں کی نوازش سے ایک طاقتور جانور کہلاتا تھا، سمورال نے چند سال قبل ان میں سے ایک کو طلسمی طور پر نابینا کر کے پکڑ لیا تھا۔ پھر اس نے دوسرا جانور پکڑا اور انہیں ایک غار میں بند کر کے پراسرار طریقے پر اپنا تابع کیا۔ وہ توری کے نافرمان اور بیمار افراد کو ان کے سامنے ڈال دیا کرتا تھا۔ یہ ایک دلچسپ اور مفید سزا ہوتی تھی۔ جب نافرمانی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آتا تھا تو وہ سانپ اور دوسرے جانور انہیں کھلاتا تھا اور جب یہ صورت نہیں ہوتی تھی تو وہ نشہ آور چیزیں کھلا کر ان کے لیے شکار تلاش کیا کرتا تھا۔ سمورال کے دیو قامت درندے اپنے خون، گوشت اور دودھ کے اعتبار سے غیر معمولی قوتوں کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ میں نے ان کے سینگوں پر چڑھ کر دودھ پیا تھا۔ میری بے خونی اور جرأت سے سمورال بے حد خوش تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے راٹ کا انمول دودھ عطا کیا۔ وہ دودھ جس میں سانپوں کو اپنی طرف کھینچنے اور بے دام غلام بنانے کی صلاحیت موجود تھی۔

دوسرے ہی دن سمورال کے اس وحشت ناک مظاہرے کے بعد جزیرہ توری میں مجھے اس کی عظمت اور قوت کا اندازہ کچھ زیادہ ہی ہوا۔ میں نے طے کیا کہ میں اپنے مکان میں ایسی عبادت گاہ اور اس قسم کے لوازم ضرور بناؤں گا۔ بلکہ مجھے اپنے لیے کوئی عمدہ غار تلاش کر لینا چاہیے جہاں میں توری کے طاقتور جانوروں کو جمع کرتا رہوں۔ میں نے سمورال سے یہ تمام عمل سیکھ لیا اور مسلسل ایک ہفتے تک اس کے پاس جاتا رہا اور نئی نئی حیرت انگیز چیزیں دیکھتا رہا۔ میں نے ان گروما میں گورے کی طرح پراسرار عمل کیے تھے مگر سمورال کے سامنے میں ایک نوآموز شاگرد بن جاتا تھا۔ اور ہر چیز کرید کرید کر پوچھتا تھا۔ ایک ہفتے میں مجھے اپنے ارد گرد کی اشیاء کی صلاحیتوں اور خواص کا خاصا علم ہو گیا۔ لیکن یہ ابتدا تھی۔ بہت ہی ابتدا۔ سمورال کے ساتھ یہ مختصر وقت گزار کر مجھے اپنی اوقات کا عرفان ہوا کہ میں ایک کیم شیم ہا تھی ہوں، جسے جنگل سے پکڑ کر شہر میں چھوڑ دیا گیا ہے اور جس کے جسم پر اعلیٰ درجے کی سواری رکھ دی گئی ہے۔ اسے شہر کی گلیوں میں چلنے اور بوجھ اٹھا کر چلنے کے آداب بھی نہیں آتے، میں ایک ہاتھی تھا۔ ہاتھی کا کوچ شہر کی طرف تھا، گوشترا بھی دور تھا۔ مجھے خوف ہے کہ اگر میں ان تمام اعمال و اشغال کا ذکر تفصیل سے کروں گا، جن میں سمورال کے ساتھ

میں مصروف رہا تو میری تحریر سے خون کی بو آئے گی، میں نفرتیں سمیٹنا نہیں چاہتا۔ تاریک برا عظم کی پراسرار زمین میں کیا کچھ ممکن تھا؟ میں سمورال کے پاس جاتا رہا اور اپنی آنکھوں کو یقین دلاتا رہا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی ہیں، وہ حقیقت ہے۔ سمورال کے لیے میں ایک تیز گھوڑا ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے میری پیٹھ پر بیٹھ کر ایک ہی چابک مارا تھا کہ میں سر پٹ دوڑا چلا جا رہا تھا، اب میں دعوے کرنے میں محتاط تھا۔

سمورال سے طلسمی علم و ہنر کی تعلیم کے ذکر میں میری ایک خلش کا اظہار رہا جاتا ہے۔ آہ وہ خلش جو نماز کے انکشاف کے بعد مجھے خلجان میں مبتلا کیے ہوئے تھی، فلورا۔ فلورا۔ فلورا۔ وہ فلورا جسے میں نے آکسفورڈ میں اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ فلورا جو میری موجودہ حالت و ہیئت کا سبب تھی۔ میرے جسم پر رنگ لگے ہوئے تھے مجھے اپنے حلیے پر ہنسی آتی تھی۔ ہر طرف نیزے تھے۔ میں اپنے وطن، اپنے گھر سے دور تھا۔ وہ فلورا جو میرا آغاز تھی۔ میرے جنوں کا آغاز۔ وہ مہذب شائستہ، حسین و جمیل اور نرم و نازک فلورا اپنے محبوب سے دُور لباس سے آزاد سرکش و حشیوں کے عذاب میں مبتلا تھی۔ اسی نے میرے لیے زہر بھیجا تھا، وہ میری زندگی، میری موت کی آرزو مند تھی، جزیرہ ہیز نازک و معزور و جوان رنگ ایک سیاہ فام غیر مہذب و حشی، اب اس کا آقا تھا۔ فلورا کو کیا ہو گیا تھا؟ جزیرہ توری میں قدم رکھتے ہی وہ مجھ سے دور کر دی گئی تھی۔ پھر اس طویل عرصے میں ایک ہی بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اقبالہ کے خیال سے اپنے آپ پر جو ایک پابندی عائد کی تھی، نماز کے آنے کے بعد وہ ختم ہو گئی تھی۔ اقبالہ کی نظر میں دوسری عورتوں سے میرا ربط و ضبط کوئی معیوب فعل نہیں تھا۔ حالانکہ میں اپنے ماضی سے مشروط ہونے کے سبب اسے ایک معیوب بات سمجھتا تھا، مگر اس نے خود میرے لیے نماز کا عطیہ روانہ کیا تھا۔ تو فلورا کو ساتھ رکھنے میں اسے کیا عذر ہوتا؟ اصل میں میرا مقصد تو وہ گورہ نایاب تھا۔ جسے یہاں کے لوگ مقدس اقبالہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔

فلورا نے جسم میں چنگاریاں بھری تھیں، اقبالہ کے بارے میں سمورال کے بیان کردہ حقائق نے پہلے ہی مجھے ناتواں کر رکھا تھا، یہ مایوسی اور بددلی، میں نے سمورال کی خدمت میں حاضری دے کر اس سے مزید علم حاصل کرنے کے شغل میں دور کرنے کی کوشش کی۔ میرے جسم میں ایک تلاطم آیا ہوا تھا اور میں طرح طرح کے نئے نئے زاویوں سے سوچتا تھا کہ آئندہ کیا کرنا ہے؟ میں نے خود کو بھی اپنے منصوبوں سے ایک طرح لاعلم رکھا تھا۔ جزیرہ توری میں میرے دونوں ناکتین نے انتظامی امور باقاعدگی سے سنبھال لیے تھے۔ شوالا کے قبیلے کی تقریباً تمام آبادی اپنی سابق جگہ منتقل ہو گئی تھی۔ دونوں قبیلوں کے مابین اب روابط اور گہرے تھے۔ فزارو اور زارے عموماً ایک ساتھ نظر آتے تھے، میری حیثیت ایک سربراہ کی سی تھی۔ وہ دونوں مجھ سے مشورہ کرنے ضرور آتے تھے، انھیں اپنی جھوٹیاں سلیقے سے بنانے کا فن آ گیا تھا۔ وہ اس طرح گلیاں تعمیر کر رہے تھے۔ جیسی میرے علاقے میں تھیں۔ سرنگا سے ملاقات کا کوئی بہانہ نہیں ملتا تھا۔ شاید یہ میرے ذہن کی کوئی مجرمانہ آلودگی تھی کہ سرنگا کے ہاں جاتے ہوئے جھج محسوس ہوتی تھی۔ جتنے دن گزر رہے تھے اس سے بعض پیچیدہ اور اہم معاملوں پر گفتگو اہم ہوئی جاتی تھی، آخر میں نے اس کا ایک حل نکالا۔ میں نے شوالا کے قبیلے کی دوبارہ آباد کاری کے سلسلے میں جارا کا کا کی ایک مشترکہ عبادت کا اعلان کیا اور اس میں سرنگا کو مدعو کرنے کے لیے اس کے غار میں پہنچ گیا۔

تاریک برا عظم کے برگزیدہ لوگوں کو سرنگا کے پاس جانے کی اطلاع مل گئی ہوگی۔ کاش مجھے بالائی قوتوں کو اپنی بات چیت سے بے خبر رکھنے کا علم آتا جو سرنگا اور سمورال کو آتا تھا، میں نے یہ سحر سیکھنے کے لیے سمورال سے اشارتاً تذکرہ بھی کیا تھا مگر اس سے پہلے دوسرے فنون سکھانے کو

ترج دی بہر حال وہ کب تک یہ اسرار چھپائے رکھ سکتا تھا جنہیں سمجھنے کے لیے میرا عزم پختہ تر تھا۔ سرنگا اپنی مخصوص نشست میں دیوی کی مورتی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے مورتی اٹھا کر اس کے رخساروں کو بوسہ دیا۔ اور سرنگا کو اشاروں میں سمجھایا کہ میں آگیا ہوں۔ سب سے پہلے میں نے اسے جارا کا کاکی مشترکہ عبادت میں شرکت کی دعوت دی اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب میری اور اس کی گفتگو غار کے اندر گھٹ کر رہ جائے گی تو میں نے سمورال سے اپنی تربیت کے حالات کا خلاصہ اسے سنایا۔ میں اس سے بات چیت میں ایسا منہمک تھا کہ دیوی پر میری نظر نہیں پڑی۔ وہ غار کے دہانے کی طرف جانے والے راستے پر کھڑی تھی اسے دیکھ کر میں گم ہو گیا اور میں نے محبت اور عقیدت کی نظروں سے اسے سلام کیا۔ دیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انگریزوں سے واپسی کے بعد آج میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا، اس کی موجودگی تنہائی اور بے بسی کا احساس دور کر دیتی تھی۔

”سیدی جابر!“ سرنگا نے میری توجہ اپنی جانب مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کاہن اعظم سمورال کو اعتماد میں لے کر راستہ سمت میں قدم اٹھایا ہے۔ تاریک براعظم سے نجات کا بس ایک ہی راستہ ہے کہ تم یہاں کے ایک برگزیدہ شخص بن جاؤ۔“

”ہاں سرنگا! تمہاری نصیحتیں تجربوں سے لبریز تھیں! اپنی دیوی سے مری سفارش کرو کہ وہ میرے عزائم میں میرا ساتھ دے۔“ میں نے دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سنو سیدی جابر! میرے عزیز! ہم ایک بہت بڑے طلسم میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ شاید تم نے اپنی نوجوانی کے نشے میں بعض اہم باتوں پر اتنی توجہ نہیں دی۔ جتنی تمہیں دینی چاہیے تھی۔ تمہیں مواقع ملے، تم نے کھو دیے، تم زارشی سے شپالی لے کر چلے آئے۔ تم نے اسالا سے کچھ نہیں سیکھا اور جب تمہیں انگریزوں کے فاضل لوگوں سے صحبت کا موقع ملا تو بھی تم اپنے عاشقانہ جنون میں مبتلا رہے۔ میں تم سے کہتا رہا کہ جو کچھ تم ابھی دیکھ رہے ہو وہ کچھ نہیں ہے۔ قسمت نے ہمیں عجیب حالات سے دوچار کر دیا ہے مگر مجھے خوشی ہے کہ اب تم نے عقل سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔“ سرنگا نے آج اشاروں میں بات نہیں کی۔

”سرنگا! میرے عظیم دوست! میرے شفیق ساتھی! کیا تم نے اقبال کو غور سے نہیں دیکھا؟ شباب کے دنوں میں تم اسے دیکھ لیتے تو تمہاری حالت بھی مجھ سے مختلف نہ ہوتی اور میں نے یہاں کے پراسرار حالات کا تم سے زیادہ گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ سچ پوچھو تو نجات کا کوئی راستہ مجھے اب بھی نظر نہیں آتا۔ تاہم ہمیں اس کے لیے جدوجہد کرتے رہنا چاہیے۔ تم نے کیا سوچا ہے؟“

”سیدی! کسی ایک جگہ مت ٹھہرو۔ حرکت کرتے رہو۔ ابھی راستوں پر دھند چھائی ہوئی ہے۔ توری کی عورتوں کی آغوش میں تمہیں کوئی راستہ نہیں مل سکتا۔“

”اسی لیے سمورال کے پاس گیا تھا اور اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم اپنی عظیم دیوی کو مستعد رکھو۔ سرنگا! تمہارے میرے درمیان کوئی اجنبیت نہیں ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو شاید آج میں بھی نہ ہوتا۔ میرے لیے یہ خیال حوصلے کا سبب ہے کہ تم موجود ہو۔“

”فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ ان جذبات کے اظہار کا یہ موقع نہیں ہے۔ میں جارا کا کاکی مشترکہ عبادت میں شرکت کے لیے آؤں گا تم اقبال کی نظر میں سرخرو اور سر بلند ہونے کے لیے کارنامے انجام دیتے رہو۔“

میں جزیہ بیزار جانا چاہتا ہوں اور وہاں سے فلورا کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے فلورا کی بے وفائی کا واقعہ اسے سنایا۔

”صرف جزیہ بیزار؟ آہ میرے عزیز! تمہیں اب مسلسل سفر ہی کرتے رہنا ہے۔ صرف فلورا کے لیے تم جزیہ بیزار جانا چاہتے ہو؟ یہ میں کیساں رہا ہوں؟ تمہارے مقاصد اس سے بلند ہونے چاہیں۔“

”میں اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں نکالنا اور زبان کاٹنا چاہتا ہوں۔“ میں نے شدت جذبات میں کہا۔ ”تم نے ڈاکٹر جواد کو معاف کر کے مجھے دکھ پہنچایا۔“

”ڈاکٹر جواد سرتا اور فلورا کے بعد وہ تیسرا شخص ہے جس پر ہم سب سے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”فلورا کے بارے میں بھی تم ایسا کہہ رہے ہو۔“

”اس لیے کہ میری نسلوں میں خون تمہارے رفتار سے گردش نہیں کر رہا ہے۔“ سرنگا نے تلخی سے کہا۔ اب تم جاؤ میں اپنی دیوی کو زیادہ رحمت دینا نہیں چاہتا۔ میں کوئی پچھلا واقعہ سننا پسند نہیں کروں گا، مجھے تمہارے نئے کارناموں کا ذکر سن کر مسرت ہوگی۔ میں تمہارے فولادی بازو، ذہین آنکھیں اور اعلا دماغ صرف عورتوں کو متاثر کرنے کے طفلاً نہ کام میں ضائع ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔“

مجھے اپنے جسم میں گرمی سی محسوس ہوئی۔ میں نے کوئی اور بات نہیں کی۔ دیوی کو سلام کیا، وہ غار کے دہانے کے راستے سے ہٹ گئی اور میں اسے سلام کرتا ہوا جنگل میں آ گیا۔ میں نے ایک بڑے درخت کا تنہا چھو کر دیکھا اور اسے اپنے بازوؤں کی طاقت سے زمین پر گرادیا۔ قبیلے میں آ کر میں نے ان نوجوانوں کو شمار کیا، جن کی آنکھوں میں چمک تھی اور جن کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ان سب کو اکٹھا کر کے میں نے اپنے تصرف کی حسین لڑکیاں ان کے سپرد کر دیں اور غاروں میں بیٹھے ہوئے نوجوانوں کو بلا کر شکار پر لگا دیا۔ میں نے نئے عہدوں کا اعلان کیا اور انہی نوجوانوں میں تقسیم کر دیا۔ جزیہ توری کے دونوں قبیلوں میں، میں کوئی ایسا فرد دیکھنا نہیں چاہتا تھا جو کسی وقت جابر بن یوسف کے مقابلے پر آ سکے۔

جارا کا کاکی مشترکہ عبادت میں سرنگا بھی شریک ہوا۔ اس کے بعد میں پھر سمورال کے پاس گیا اور اس نے میرے اشتیاق، انہماک کے مطابق میری تربیت جاری رکھی۔ آئندہ دو ماہ تک عمدہ قسم کی غذاؤں، جسمانی مشقوں اور زیادہ سے زیادہ اسرار کی تعلیم و تربیت میں شب و روز صرف ہوتے رہے۔ اس عرصے میں ایک بار بھی مجھے اقبالانہ طلب نہیں کیا۔

کاہن اعظم سے تاریک براعظم کے اسرار کی سعی میں روز میرا وقت صرف ہو جاتا تھا، میں اس سے بچوں کی طرح حیران ہو کر متحس اور پُرشوق لگا ہوں سے پوچھتا تھا اور وہ نہایت شفقت کے انداز میں مجھے اہم اسرار کی باتیں نظر انداز کر کے ادھر ادھر کا جغرافیہ بتا دیا کرتا تھا، میں ان مختصر معلومات سے قیاس آرائیوں کا جال بنتا، اس بنیاد پر میرے ذہن میں سلطنت اقبال کا ایک نقشہ بن چکا تھا۔ ایک ایسا بھیا تک نقشہ جو انسانی عقل کے ادارک سے ماورا ہے۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ کاہن اعظم میری کامیابیوں اور کارناموں سے خوش ہوتا ہے، چنانچہ اس کی نظروں میں اپنا وجود قائم و دائم رکھنے کے لیے میں خود کو ہمیشہ سرگرم، جوشیلے اور طاقتور شخص کی شکل میں پیش کرتا تھا۔ تاریک براعظم میں بعض دور افتادہ جزیروں کا حال میں زارے اور فزارو سے پہلے سن چکا تھا۔ لیکن جب سمورال نے ان جزیروں کے بارے میں بتایا تو انھیں دیکھنے اور سر کرنے کا اشتیاق بڑھ

گیا۔ ان جزیروں میں اسرار ایک ایسا علاقہ تھا جہاں قصر اقبال کی نفیس اور حسین عورتوں کی حکمرانی تھی اور مرد و عورتوں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ اس جزیرے کی عورتوں کے جلال اور جمال کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں۔ میں اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ ایک کامل مرد بھی بعض اوقات یہ سوچتا ہوگا کہ وہ عورت ہوتا تو کیا ہوتا۔ جزیرہ اسرار میں عورتوں اور مردوں کی سماجی حیثیت بالکل مختلف تھی، سنا تھا وہاں عورتیں اپنے لیے مرد منتخب کرتی ہیں اور ان کے لیے لڑتی ہیں۔ میں بیزنار سے اپنے معرکوں کا آغاز کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے ایک دن سمورال سے کہہ دیا کہ میں اسرار جانا چاہتا ہوں۔ کاہن اعظم نے اپنی عبادت گاہ کے تمام روشن دان اور سوراخ بند کر کے میرے فیصلے پر خوشی ظاہر کی اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جلد سے جلد اقبال کی بارگاہ میں میری خواہش منتقل کر دے گا۔

جزیرہ توری کے دونوں قبیلوں میں عالمانہ مناظرے اور جسمانی مقابلے کر کے میں ان اشخاص کی شناخت کر رہا تھا، جن کا ذہن اور جسم عام لوگوں سے ممتاز تھا۔ ان مقابلوں میں اپنی توانائی اور برتری کا اظہار کرنے کے لیے میں قوی الجبہ اشخاص کو کھلونوں کی طرح اٹھالیا کرتا تھا اور اپنے نوادر کی قوت سے انھیں خوف زدہ رکھتا تھا۔ ممتاز اور منفرد لوگوں کو ختم کر کے اور مشروب حیات پی کر میں تاریک براعظم کا ایک ناقابل تخیل شخص بن سکتا تھا۔ جزیرہ اسرار روانگی کے سلسلے میں مجھے اقبال کے مثبت جواب کا انتظار تھا۔ میں نے نماز سے بھی اقبال کی بارگاہ میں رسائی کی درخواست کی تھی۔ ایک شام جب میں سریتا سے گفتگو تھا۔ نماز سریتا کو نظر نہیں آرہی تھی۔ سریتا میرے ہاتھوں کو جنبش اور ان کے درمیان کا خلا تک رہی تھی۔ وہ مجھ سے محتاط باتیں کرنے کی عادی تھی، سریتا کو اپنے فیصلوں اور اپنی حرکتوں سے اچنبھے میں مبتلا کرنے میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔

اور سریتا میرے ہاتھوں اور چہروں کے مختلف زاویوں پر پریشان تھی، اچانک مجھے زارے کی آمد سے مطلع کیا گیا۔ میں نے زارے کو اندر بلا لیا، اس نے مجھے ایک سنسنی خیز خبر سنائی کہ توری کے ساحل پر سفید فام اجنبیوں کا ایک قافلہ آکر اتر رہا ہے اور وہ توری کے لوگوں کے نیزوں کی زد پر ہے۔ میں نے زارے سے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ تیزی سے باہر آ کر میں ساحل کی طرف بھاگا۔ میرے پیچھے زارے بھاگ رہا تھا اور اس کے پیچھے سریتا اور سریتا کے ساتھ ساتھ ایک ہجوم۔ ساحل خاصا دور تھا اور میں عجیب خیالات لیے سرپٹ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ ساحل پر پہنچ کر مجھے اپنے لوگوں، اپنے سیاہ فام لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا، جو خوشی سے اچھل کود رہے تھے۔ فقارے بجارے تھے۔ بالکل وہی سماں تھا، جو ہماری آمد کے وقت تھا۔ مجھے دیکھ کر ہجوم نے راستہ چھوڑ دیا اور زمیں بوس ہو گئے۔ میں اس لئے پئے قافلے کے سامنے پہنچا تو مجھے اپنے آنکھوں پر یقین نہیں آیا، چار لاشیں زمین پر خون میں تر پڑی تھیں اور ان میں نیزے گڑے تھے اور مہذب دنیا کے باقی لوگ کاندھے اور سر جھکائے تماشا ئے عبرت بنے کھڑے تھے۔ وہ گیارہ تھے، ان کے کپڑے جگ جگ سے تار تار تھے۔ ان میں چار عورتیں تھیں، بھوک اُن کے چہروں پر لکھی ہوئی تھی۔ مرنے والوں میں ایک عورت تھی اور تین مرد تھے۔ انہوں نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہوگا، اسی لیے ان کے سینے میں توری کے باشندوں کے نیزے اتر گئے ہو گئے۔ انھیں دیکھ کر میں شدید الجھن اور انتشار کا شکار ہو گیا، مجھ میں کوئی فیصلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔

سمندروں کی لہروں نے ایک نوجوان لڑکی کی جلد ادھیڑ دی تھی۔ وہ مجھے بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ میرا دور ان خون تیز ہو گیا۔ میری سرد مہری اور خاموشی پر لڑکی پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ ایک نوجوان شخص نے آگے بڑھ کر اس کے رخساروں پر زوردار طمانچہ رسید کیا اور اسے خاموش رہنے

کا حکم دیا۔ لڑکی اس قدر حواس باختہ تھی کہ اس نے نوجوان کا شکستہ گریبان پکڑ کر پھاڑ دیا اور اس سے انگریزی میں اپنا گلا گھونٹنے پر اصرار کرنے لگی۔ میں وہاں سے ہٹ آیا۔ دُور جا کر میں نے زارے کو حکم دیا کہ ”انھیں فی الحال کسی جھوپڑی میں قید کر کے ان کے لیے کھانے کا انتظام کیا جائے۔ ہم مقدس اقبالہ کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے اپنی آنکھوں کے گوشوں میں نرمی محسوس ہوئی۔ سرتیبا بھی خاموش خاموش میرے ساتھ تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور راستے میں کچھ نہیں بولی۔

اپنے مکان میں آ کے میں دھڑام سے پیال کے بستر پر گر گیا۔ اسی وقت نماز میرے سر ہانے آئی اور اس نے اطلاع دی کہ مجھے بارگاہ اقبالہ میں طلب کیا گیا ہے۔

جب میں نے یہ سنا تو یہ سمجھا کہ شاید میں بے خوابی کا شکار ہوں۔ قصر اقبالہ کی ایک محترم کنیز شربدماں میرے سامنے کھڑی تھی، میں اچھل کر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین کر لینا چاہیے تھا کہ یہ میرے پریشان ذہن کی کوئی کرشمہ کاری نہیں ہے۔ ایک عرصے بعد اس ماہ جمال نے مجھے اپنی بارگاہ میں طلب کیا تھا۔ ایک عرصے بعد مجھے لذت گوش ملی تھی، لہذا اعتبار نہیں آتا تھا۔ اس نے جابر بن یوسف کو طلب کیا تھا؟ پہلے کی بات اور تھی، پہلے مجھے اپنی کوتاہ قاصتی اور اس کی شمشاد قاصتی کا انداز نہ نہیں تھا۔ پہلے میں نے زارشی کے لقمہ و دق صحرا کی خاک نہیں چھانی تھی اور باگمان کے اندھیروں میں ٹھوکر نہیں کھائی تھیں۔ پہلے میں نے انگریزوں میں جلاوطن عالموں کا جلال و کمال نہیں دیکھا تھا اور کاہن اعظم سمورال کی وہ فصیح تقریریں سنی تھیں، جو اس نے تاریک براعظم کی پراسرار سلطنت اور اس کی رفیع الشان ملکہ کے بارے میں میرے سامنے کی تھی۔ پہلے میں نے اتنے دن نہیں گزارے تھے کہ مجھے اس کی شان و شوکت، عظمت و سطوت کا عرفان ہوتا، مگر اب کچھ دھندلے دھندلے نقوش واضح ہو رہے تھے۔ میری آنکھیں روز کسی انکشاف، کسی غیر متوقع واقعے کے ظہور پر حیرت سے پھیل جاتی تھیں۔ پہلے میں ایک جاہل شخص تھا۔ پہلے میں ایک بڑا بچہ تھا، جس نے غیر معمولی طور پر اپنا جسم بڑھالیا تھا۔

”کیا تم جھوٹ بھی بولتی ہو؟“ میں نے بے چینی سے کہا۔

نماز نے وارفتگی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میرے سینے پر لٹکے ہوئے چوٹی اڑوہے پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ کیا کہہ رہے ہو؟ اس سرزمین پر، کوئی اس کے متعلق اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی جرأت کر سکتا ہے؟“

”آہ“ میں نے وفور مسرت سے چیخ کر کہا۔ ”اب میرے سینہ چیرنے کا وقت آیا۔ اس نے مجھے کب بلایا ہے۔“

”اسے اپنے حکم کی تعمیل میں تاخیر پسند نہیں ہے۔“

”اور تم اگر مجھے چند ساعت بھی مزید انتظار کے لیے کہتیں تو یقیناً میری روح مجھ سے جدا ہو گئی ہوتی۔ شاید اسے احساس ہے کہ اس سیم بر سے رفاقت کے دعوے دار اس کے انتظار کا حوصلہ نہیں رکھتے مگر صرف چند لمحے۔ مجھے اپنے جسم پر خوشبو میں تول لینے دو۔ کیا میں اس طرح اس کے سامنے جاؤں گا؟ نماز! میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انھیں درست کر دو اور ذرا مجھے یہ تحائف اپنے سینے پر سجالینے کی مہلت تو دو۔..... اور ہاں ہر بیکہ کی مقدس آنکھیں بھی تو گلے میں لٹکالینے دو۔“

اس مختصر وقت میں جنون کے کئی عالم گزر گئے۔ نماز نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور میں نے سلیقے سے اپنے نواور سینے پر

آراستہ کرنے شروع کر دیے، میں شوخی میں نماز کی چٹکیاں لیتا جاتا تھا۔ پھر میں نے ایک برتن میں رکھا ہوا خوشبودار تیل اپنے جسم پر لوٹ لیا۔ نماز نے اسے جلدی جلدی میرے جسم پر خشک کر دیا۔ میں پاؤں رکھتا کہیں تھا، پڑتے کہیں تھے۔ یہ وقت میں نے خود کو آراستہ کرنے میں لگا دیا، لیکن انہی لمحوں میں اداسیاں مجھ پر غالب آ گئیں۔ اقبال کی اس وقت طلبی کا کیا مقصد ہے؟ اپنی خوش خیالیاں اور خوش فہمیاں دور کر کے مجھے دوسرے معاملات پر غور کرنا چاہیے۔ میں اسے اپنی شدتوں کا شمر سمجھوں یا کچھ اور؟ گزشتہ دنوں سے میں اپنی نظر میں ایک مشکوک شخص تھا۔ کاہن اعظم سمورال سے میری بڑھتی ہوئی رفاقت اور ہوائیں بند کر کے اقبال کے بارے میں گفتگو سے کہیں، وہ آگاہ تو نہیں ہو گئی؟ ہم نے اس کے خلاف کوئی سازش نہیں کی تھی۔ مگر سرنگا؟ سرنگا کے غار میں یقیناً مہذب دنیا کی واپسی کے منصوبوں پر کھل کر گفتگو ہوئی تھی..... اگر کچھ چیزیں اسے معلوم بھی نہیں ہیں تو یہ کیا کم ہے کہ وہ میرے شب و روز کے بعض مشاغل سے لاعلم ہے۔ اسے میرے سرکش اطوار سے کسی قسم کی وضاحت کی ضرورت تو نہیں محسوس ہوئی؟ میرے ہاتھ سست پڑ گئے اور ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ ممکن ہے وہ میری موجودہ ذہنی افتاد پر مجھے سرکش کرے یا ہو سکتا ہے جزیرہ اسرار جانے کے ارادے پر اپنی رضامندی کی مہر ثبت کر دے؟ مبادا مہذب دنیا سے ایک قافلے کی آمد پر وہ میرا فیصلہ جاننا چاہتی ہو؟ کاش ان میں سے..... صرف ایک بات صحیح ہو کہ وہ اپنا دست شوق دراز کرے اور اپنے گلابی ہونٹ میرے سامنے کر دے اور مجھے میرے صدق کا انعام مل جائے۔ کوئی مرتبہ، کوئی اعزاز، اُس کی اس فیاضی کا بدلہ نہیں۔ میں شش و پنج کی حالت میں نماز کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نیم مایوسی اور نیم خوشی دلی سے کہا: ”نماز! یقیناً کسی شخص کو اس حلیے میں اسکی بارگاہ میں جانے کا تصور نہیں کرنا چاہیے مگر میرے پاس جو کچھ ہے، وہ میں نے اپنے ساتھ لے لیا ہے۔ ان نوادر کے سوا، جو تم میرے سینے پر دیکھ رہی ہو، میرے پاس اور بہت کچھ ہے جو کسی کو نظر نہیں آتا جس کی بنا پر میں خود کو ان نوادر سے زیادہ آسودہ سمجھتا ہوں۔ وہ کیا ہے؟ وہ ہے میرا باطن..... جس میں صرف اسی کا جلوہ، صرف اس کا نقش ہے، میرا دعویٰ ہے کہ یہ نقش کسی کے قلب پر اتنا گہرا نہیں ہے..... اُس کے خیال نے مجھے زندہ رکھا ہے۔ اس کا چہرہ مجھے تاریک برا عظم میں سرمستی پر اکساتا رہا ہے۔“

نماز نے میرا ہاتھ تھام لیا اور خوش ادائیگی سے کہنے لگی۔ تم اپنے بہترین لفظ یہاں کیوں ضائع کر رہے ہو؟ اپنے نطق سے کہو کہ وہ تمہارے قلب کے ساتھ تعاون کرے۔ اپنی آنکھوں سے کہو کہ وہ تمہارے باطن کی نمائندگی کریں۔ اب تمہیں ایک مرحلہ شوق درپیش ہے، آؤ۔ میں تمہیں وہاں لیے چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے۔ ہر طرف سفید دھواں پھیل گیا اور میرا مکان اس دھوئیں کی اوٹ میں کہیں چھپ گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے اپنی کشش کا وتیرہ چھوڑ دیا ہو اور آسمان نے زمین کی جگہ لے لی ہو، میں بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا یا بادلوں کے دوش پر تھا۔ مجھے نہیں معلوم یہ کیا ماجرا تھا؟ یہ کیا راز تھا؟ نماز کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور ہر طرف بادل تھے۔ میں نے کچھ سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کیونکہ اس کوشش میں مجھے اپنی ناکامی کا علم تھا۔ نماز سے پہلے زولین اور اشارا کی طرح مجھے قصر اقبال لے جا چکی تھیں، مگر اشارا اور زولین کے زمانے کی بات اور تھی اب آگہی کے عذاب سے گزرنے کے بعد میرے قلب و ذہن کی حالت متغیر تھی۔ میں نے پچشم خود انگریزوں، زارشی اور باگمان کے ظلم خانوں میں ایسے حیران کن مناظر کا مشاہدہ کیا تھا جن پر صرف اسی کی شخصیت کا سحر چھایا ہوا تھا۔ بادل میرے ارد گرد چھائے رہے اور میں ایک غنودہ سی حالت میں سفر کرتا رہا۔

قصر اقبال کے دلکش ماحول کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ وہ ایک پرستان تھا جس کا ذکر مہذب دنیا کی دیومالائی کہانیوں میں کیا جاتا ہے۔ دنیا کی حسین ترین دوشیزاؤں کا اتنا بڑا اجتماع کوئی دیکھ لے تو پاگل ہو جائے، میں ستونوں، ایوانوں، عجائب اور رنگوں کا حال بیان کر چکا ہوں۔ نماز نے میرا ہاتھ دبایا تو مجھے اپنے بوجھ کا احساس ہوا۔ میں زمین پر کھڑا تھا اور بادل چھٹ رہے تھے۔ ان کے پیچھے سفید پتھر کے ستون نظر آرہے تھے اور مریض فرش پر سفید اور سرخ جسموں کی دوشیزائیں رقص میں منہمک تھیں۔ ایک عجیب کیف آور موسیقی درود یوار سے اُبل رہی تھی۔ درمیان میں ایک بڑا ساحل تھا جس پر قد بلیں روشن تھیں۔ پہلے میں اس جگہ نہیں آیا تھا۔ قصر اقبال کے کون کون سے گوشے ابھی میری نظروں سے اوجھل ہوں گے۔ میں نے اس ماحول میں قدم رکھا، تو میرا دل چاہا میں بھی پتھر کے ان مجسموں میں شامل ہو جاؤں، جو جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں اور دوشیزائیں ان کے درمیان ایک ابدی رقص میں مصروف ہیں۔ نہ معلوم یہ رقص کب ختم ہو، وہ زمین کی حرکت اور وقت کی رفتار سے بے نیاز ناچ رہی ہیں۔ ان کے بدن لوچ کھا رہے ہیں اور وہ کبھی نہیں تھکتے، انہوں نے بس ایک سرخوشی سمجھی ہے کہ رقص کیا جائے۔ وہ ایک ایسی لازوال مسرت سے ہم کنار ہیں کہ اپنے گرد و پیش بھول گئی ہیں۔

ایک میں یہاں آیا ہوں اور میں بھی ابھی ادھر سے گزر جاؤں گا، میں ان کے سیما صفتی کی ایک جھلک دیکھ کر اس ایوان رقص سے آگے چلا آیا۔ نماز مجھے قصر اقبال کی نئی نئی راہداریوں اور جلوہ گاہوں سے گزرتی رہی۔ ہر طرف حسن و جمال کا بازار گرم تھا، جس کا ذہن شاعرانہ ہو، وہ بھی ایسے خواب تک نہیں دیکھ سکتا۔ میری نگاہیں جدھر رخ کرتی تھیں، رنگ و نور کی ایک محفل بھی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہاں آکر احساس ہوتا تھا کہ مہذب دنیا سے آکر ہم نے کسی زیاں کا سودا نہیں کیا ہے۔ میں جو چننا تھا، فریاد کرتا تھا۔ وہ کس قدر سچ تھا؟ میرا ہڈیاں بے سبب نہیں تھا۔ یہ اقبال کا قصر زریں تھا۔ جو مہذب دنیا کے تمام شہسنانوں کو شرماتا تھا۔ ہر سمت ایک جشن برپا معلوم ہوتا تھا، ظاہر ہے یہ بزم آرائی، آج اس وجہ سے نہیں تھی کہ سحر و افسوس کی سرزمین کا ایک ادنا سردار جابر بن یوسف ادھر آیا تھا۔ جابر بن یوسف شہنشاہ نہیں تھا، وہ ایک غلام تھا، اس کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا۔ وہ ایک مغلوب شخص تھا۔

قصر اقبال کے بارے میں میرے گزشتہ بیانیوں کی یاد تازہ کیجئے ممکن ہے اس وقت بیان کی کسی کوتاہی کا جرم مجھ سے سرزد ہو گیا ہو، مجھے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ میں نے جو کچھ دیکھا اسے بیان کیا جائے، تو وہ یقین و اعتبار کی اس حد سے تجاوز کر جاتا ہے جہاں تک انسانی ذہن کی رسائی ہے۔ یقیناً کوئی ایسی منزل ہوگی جہاں ذہن کی قبولیت ختم ہو جاتی ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں ذہن کی نفی کی منزل آتی ہے وہاں سے آغاز کیجئے۔ اس سے آگے کچھ بیان کرنا فضول ہے۔

ان گداز ایوانوں، رنگ و رنگ کے بادلوں، موسیقی کی لہروں اور اٹھلاتے ہوئے جسموں اور خوشبوؤں اور لطیف ترین احساسات سے گزر کر میں ایک ایسے ایوان میں پہنچا جہاں کی دیواروں پر طلائی کام کیا گیا تھا اور جس کی فضا اب تک کے تمام ایوانوں سے زیادہ رنگین اور خواب ناک تھی، مجھے اس جگہ ٹھہرا کر نماز رخصت ہو گئی۔ یہ ایک بڑا ایوان تھا، میں اس کی آرائش و زیبائش میں کھویا ہوا تھا اور آنے والے لمحوں کا منتظر تھا کہ ایک بار پھر نماز نمودار ہوئی اور اس کے پیچھے پری جمال لڑکیوں کے ہیولے تیرتے نظر آئے۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک ہوا تھی جو ادھر سے آئی

تھی، اُدھر کہیں گم ہو گئی۔ اس نسبتا سر دجگہ پر میں اپنی حیثیت کا کوئی تعین نہیں کر پایا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ایک طالب صادق کے بجائے ایک سردار ایک غلام کی حیثیت سے خود کو پیش کروں گا۔ مبادا کوئی جسارت اس کی طبع نازک پر گراں گزر جائے؟

میں اپنا ذہن یک سو کر کے تمام تر اشتیاق سے کھڑا ہو گیا۔ جابر بن یوسف نے اپنے پیروں میں ارتعاش سا محسوس کیا۔ میں نے خود کو ڈانٹا، ”کم بخت! تمام منزلیں سر کر لیں، اب اس مرحلہ شوق پر لڑنا ہے؟ تیرا اعتماد کیوں ختم ہو گیا؟“ میں نے خود کو سمجھایا۔ ”اے بد بخت شخص! کیا ہوگا؟ وہ سامنے آئے گی تو کیا ہوگا۔ کیا تو ان نوادر کے ساتھ دوں، ہمتی کا یہ مظاہرہ کرے گا۔ اپنا خنجر اٹھا اور اگر کتاب نظارہ نہیں ہے تو سینے میں اتار لے۔“ میں دو اشخاص میں تقسیم ہو گیا تھا بلکہ کئی اشخاص میں..... اور وہ سب اپنے شوق، اپنے جذبے، اپنے وسوسوں، اپنے اندیشوں کا اظہار کر رہے تھے۔ جواب دینے والا صرف ایک شخص تھا، جس نے آخر سب کو شکست دے دی اور ان تمام اشخاص کے ہجوم سے وہی شخص ابھرا جس کا نام جابر بن یوسف تھا۔ وہ باگمان کا سردار، زارشی کا فاتح، وہ توری کے دونوں قبیلوں کا سردار۔ وہ ایک مضبوط اور توانا شخص، جس کا لہجہ رسیلا اور جس کا انداز کٹھن تھا۔ چند لمحوں بعد مجھے ایک مشروب پیش کیا گیا۔ وہی اقبال کا مشروب خاص، جس کے پینے کے بعد آنکھ اپنے زاویے بدل دیتی ہے۔ میں نے نماز کو جام خالی کر کے واپس کر دیا اور میرا دل چاہا کہ اس وقت عرب کی کوئی دل نواز دھن چھیڑ دے میرے سوچنے کی دیر تھی کہ عربی موسیقی میرے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی..... پھر میں نے چاہا، وہ دیر سے آئے تاکہ اس ایوان میں میرے قیام کی مدت طویل ہو جائے لیکن اسی وقت سامنے کی دیوار موسیقی کے زیروم کے ساتھ شق ہوئی اور خلا میں رنگین روشنیاں جھلملانے لگیں۔ وہ روشنی کے جھماکے تھے۔ روشنیوں کا منبع کہاں تھا؟ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس ہالے میں ایک تخت آتا دکھائی دیا۔ وہ آ رہی تھی۔ وہ آ رہی تھی۔

کون آ رہا تھا؟ اقبال آ رہی تھی..... ہاں اقبال آ رہی ہے۔ کیا یہ سچ تھا؟ ہاں یہ سچ تھا۔ آنکھوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ اس کی سواری آ رہی ہے، حسن ایک زریں تخت پر جلوہ فگن ہے۔ وہ کاروان جمال آ رہا ہے، وہ رنگ و نکبت کا سیل اس طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کا تخت جگمگا رہا ہے۔ آج اس کی تمکنت کی کچھ اور شان ہے۔ میرے قدم زمین سے اکھڑنے لگے۔ میں نے انھیں اور مضبوطی سے جمالیا اور اپنا سینہ آگے کر لیا۔ تخت دیوار کے اس طرف آنے کے بعد ایک فاصلے پر رک گیا اور اقبال کے دائیں بائیں کھڑی ہوئی دو شیرازیں اتر کر فرش پر کھڑی ہو گئیں۔ ان میں نماز بھی تھی۔ میرے اور اقبال کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔ لیکن مجھے یہ فاصلہ صدیوں، سمندروں اور سیاروں کا معلوم ہوتا تھا۔ اقبال کا بدن پھولوں اور پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے دراز سرخ و سیاہ بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اسے کسی زیور کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ آج اس کے بدن پر پتوں اور پھولوں کا لباس نسبتہ مختصر ہے۔ یہ شاید میری نظر کا فریب ہو لیکن ان پھولوں اور پتوں کے درمیان اس کے بدن کا کوئی کوئی حصہ مجھے نظر آ جاتا تھا۔ اس کے آتے ہی میں تاریک براعظم کی روایت کے مطابق اظہار عقیدت کے طور پر زمین بوس ہو گیا۔ مجھے نماز نے اپنی انگلی کے اشارے سے اٹھایا۔ پھر میں نے کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ نظر ٹھہرتی ہی نہیں تھی تاہم میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی نگاہوں میں ایک دل آویز شوخی اور اس کے لبوں پر ایک نظر فریب تبسم ہے۔ ان دونوں اشارات سے میرے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ تنکھی نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی اور اس کی جھپتی نظریں میرے جسم کے پار ہو رہی تھیں اور مجھے ایک نئی لذت سے آشنا کر رہی تھیں۔ میں

نے اپنا تمام کرب، اپنے دنوں، اپنی راتوں کا کرب، اپنے چہرے پر سمیٹ لیا تھا۔ میں نے کلام میں پہل نہیں کی تھی لیکن میری آنکھیں میرے بند لب، میرا چہرہ مجھے منتقل کر رہا تھا۔ یکا یک روشنیوں میں ارتعاش سا ہوا اور اقبال نے اپنے دست بہار آفریں کو ایک خاص ادا سے جنبش دی، میں مہربہ لب کھڑا تھا۔ نماز نے نہایت شیریں لہجے میں ابتدا کی۔ جزیرہ توری اور باگمان کے سردار جابر بن یوسف الباقری مقدس اقبال تہاری کامیاب واپسی اور تہاری کامرانیاں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔“

میں نے اپنا سر جھکا دیا۔

”تمہارا آراستہ سینہ بلاشبہ تہاری برتری کی دلیل ہے۔“ نماز نے میرے کانوں میں شہد پکایا۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ صرف حسرت

بھری نگاہوں سے اقبال کی طرف تکتا رہا۔

”مقدس اقبال کو معلوم ہے کہ تم نے کہاں کہاں اس کا خیال تازہ رکھا اور کس کس جگہ شجاعت و ذہانت سے کام لیا۔ مقدس اقبال تہاری آئندہ فتوح دلچسپی کی نظر سے دیکھے گی۔“ نماز نے شوخی سے کہا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پہلی بار لب کھولے۔ ”مجھے کچھ کہنے کی اجازت عطا کی جائے۔“ میں نے تاثر انگیز آواز میں کہا۔

”گو وہ تمہارے جذبات اور احساسات سے آگاہ ہے، تاہم تمہیں اظہار کی اجازت ہے۔ تم سے توقع کی جاتی ہے کہ دوران کلام یہ احتیاط

ملاحظو خاطر رکھو گے کہ تم کہاں موجود ہو؟“ نماز نے باوقار لہجے میں کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے جذبات میں کہا۔ ”اے خوش اندام نماز! میں جانتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ سلطنت اقبال میں کوئی بھی جگہ

اس کی نظر فرحت اثر سے دور نہیں۔ میں اپنے شعور میں ہوں کہ میں کس حرم ناز کی جلوہ گاہ میں زمین پر ایستادہ ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ پہلے مجھ

سے سنگین گستاخیاں سرزد ہو گئیں تھیں۔ اس نے میرے لیے اپنی سرزمین کے مختلف طلسم خانوں کے مشاہدے کا اہتمام کر کے مجھے اپنی طاقت

و حشمت سے متنبہ کر دیا ہے۔ میں نے یہاں آنے کے سفر کے دوران میں سوچا تھا کہ میں کسی حیثیت سے جا رہا ہوں۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ

میں تین قبیلوں کے سردار کے سوا اور کیا حیثیت رکھتا ہوں؟ میں آسمان میں نہیں اڑ سکتا کیونکہ میرے جسم پر پر نہیں ہیں اور میں زمینوں پر انقلاب برپا

نہیں کر سکتا، کیونکہ میرے علم و فضل کا دائرہ بہت مختصر ہے۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ اس کی قربت کی طلب مجھے ایسے ناتواں شخص سے مناسبت نہیں

رکھتی۔ مجھے ابھی تنگی دیواریں شق کرنا اور اشارے سے درخت اکھاڑنا نہیں آتا اور مجھے پر میری قدیم روایتیں تسلط جمالیتی ہیں۔ وہ میرا محبوب تھی۔

میں نے اس میں اضافہ کر دیا۔ وہ میری محبوب ملکہ ہے۔ میں نے اپنی شوریدہ سرخوہشیں زخمی کر دیں تاکہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ میں نے اپنے آپ کو یہ

باور کرایا کہ مجھ سے باعظمت وہ تخت ہے جس پر وہ جلوہ فگن ہے۔ وہ جام ہیں جو اس کے لب چھوتے ہیں، وہ پھول ہیں جو اس کا بدن ڈھانپتے ہیں، وہ

پتے ہیں جو اس کے بدن کی چاندنی رو کے رہتے ہیں۔ میں نے جانتا تھا کہ مجھے اس کا غلام بنالیا جائے لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اس کی غلامی بھی کتنی بڑی

فضیلتوں کے بعد ممکن ہوتی ہے؟ میں نے اپنی طلب سے کنارہ کشی نہیں کی ہے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے سرکشی کی اجازت دی جائے۔ اگر

اسے طاقت کے تماشے پسند ہیں تو مجھے اپنی طاقتوں کی افزائش کے مظاہرے کی اجازت دی جائے اور میں اپنے طور پر یہ آرزو دل سے پیوستہ کر لیتا

ہوں کہ ایک دن وہ مجھے اپنے قریب جگہ دے گی۔“

میں نے جذبات سے لبریز پیرائے میں وہ تمام باتیں کہہ دیں جو میرے ذہن پر محیط تھیں۔ پھر میں نے اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے اس کے چہرے پر نگاہیں جمادیں۔ وہ پوری توجہ اور دلچسپی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں تجسس تھا اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار تھے۔ اس کا انتہاک دیکھ کر میں نے اپنے اظہار میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ میں بولتا رہا جب تک نماز نے مجھے روک نہ دیا۔

”آہ!“ اے جزیہ توری اور باگمان کے معزز سردار! تمہاری باتیں شریں اور تمہارا کلام پراثر ہے۔ اس سرزمین پر تمہیں نوازا گیا ہے۔ جارا کا کا کی مقدس روح تم پر سایہ گستر ہے اور مقدس اقبال تمہاری کامرانیوں کی نوید سے متاثر ہوتی ہے۔ تم نے اس سرزمین پر سر بلند و سرخ روافرا دیکھے ہیں۔ مقدس اقبال کے وسیع نظام سلطنت میں ان کے لوگوں کے نمایاں ہونے کی گنجائش موجود ہے جو نمایاں ہونا چاہتے ہیں۔“ نماز نے شگفتگی سے کہا۔

”اور مجھے یقین ہے کہ وہ کسی مقام پر کسی کی گرمی جذبات سے ضرور پگھل جائے گی۔ میں اس بلندی پر پہنچنے کا خواہاں ہوں جہاں سے اس کا چہرہ مجھے نظر آ سکے اور وہ مجھے براہ راست مخاطب کی سعادت بخشے۔۔۔۔۔۔ اسے اس کا احساس ہوگا کہ جابر بن یوسف کو عورتوں، غلاموں اور زمینوں پر حکمرانی میں لذت نہیں ملتی۔ اس کی انا ایسی طاقت و بلندی سے آسودہ نہیں ہوتی، جہاں اس کا جلوہ نظر نہ آتا ہو۔“

”ٹھہر و جابر بن یوسف!“ نماز نے حکمیہ انداز میں کہا۔ ”تم ایسی گفتگو کر رہے ہو جو قبل از وقت ہے۔ تمہارے لہجے سے شکوک اور عدم اعتماد کی بو آتی ہے۔ تم ابھی تک اپنے مشتعل جذبات کے توسط سے بول رہے ہو۔ آہ۔ تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے سامنے وضاحتیں کرے۔ یہ تمہاری کیسی نادانی ہے۔ تمہارا علم خام اور تمہارا شعور ناپختہ معلوم ہوتا ہے۔ تم نے اس کے جاہ جلال کا تخمینہ لگانے میں اب بھی کوتاہی کی ہے، بہتر ہے تم اسرار جاؤ اور وہاں اپنا نفس اتنا سیراب کر لو کہ پھر تمہاری طلب میں کوئی آلودگی نہ رہے اور تم اس سرزمین سحر و اسرار کے راز ہائے سر بستہ کے متعلق از خود نتیجہ اخذ کرنے کے قابل ہو جاؤ۔۔۔ تم شوالا اور کالارئی اسٹالا اور لوکا سا کے معیار کے ایک شخص ہو۔“

میں نے حیرت سے نماز اور اقبال کو دیکھا اور نماز سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے متعلق میں قطعی طور پر یہ سمجھوں کہ تم مقدس اقبال کی ترجمانی کے فرائض بہ کمال و تمام انجام دے رہی ہو؟“

”میری حیثیت ایک ترجمان کے سوا کچھ نہیں“ نماز نے جواب دیا۔

”میں اس کے بعد کوئی بات نہیں کروں گا۔۔۔۔۔۔ میں اپنی زبان پر زنجیر ڈالتا ہوں۔ اب جو کچھ ہوگا وہ عظیم دیوتاؤں کی منشا کے مطابق ہوگا۔“ میں نے اپنی افسردگی چھپانے کی کوشش کی۔ ”مقدس اقبال نے مجھے اپنے بارگاہ میں طلب کر کے میری عزت بڑھائی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کا بہترین جانور ثابت ہوں گا۔ میری درخواست ہے کہ مجھے تمام شکوک و شبہات سے بالاسمجھ کے اپنا راستہ بنانے کی اجازت دی جائے۔ میں اس کی نشست کے قریب آنے کے لیے اپنے باقی دن بھی صرف کردوں گا۔ میں مشروب حیات پینے کی لذت سے بہرہ ور ہوں گا اور تا ابد اس کے فراق میں جلنے اور تر پنے کی سعادت سے ہم کنار ہوں گا۔“ میں نے جو شیلے انداز میں کہا۔ ”میری رہنمائی کی جائے اور اس جانور کو جنگل میں تنہا نہ چھوڑا

جائے۔ مجھے بتایا جائے کہ سمندر پار سے ایک نئے قافلے کی آمد پر مجھے کس قسم کے فیصلے صادر کرنے چاہیں۔

”جابر بن یوسف!“ نماز حاکمانہ انداز میں بولی۔ ”تمہارے عزائم یقیناً سلطنت اقبال میں تمہارا درجہ اور رتبہ متعین کریں گے اور تمہاری طلب جو اس کے سلسلے میں ہے، وہی تمہارے عزائم کے لیے ہمیز کا کام دے گی اور آنے والے وقتوں کے بارے میں دیوتا جانتے ہیں، مقدس اقبال جانتی ہے جو جارا کا کا کی نمائندہ ہے، جس کی نظر ہر سمت ہے اور جو اپنے علاقے کے افراد اور درختوں اور زمینوں اور سمندروں کا تسلط رکھتی ہے۔ مقدس اقبال کی نوازشیں تمہارے کارناموں پر منحصر ہیں جزیرہ توری میں اجنبیوں کی آمد کے متعلق تم توری کے ایک سردار کی حیثیت سے جو بھی فیصلہ کرو گے وہ تمہاری ذہانت کے اوصاف میں شمار کیا جائے گا۔“ جابر بن یوسف الباقرا! پھر نماز شاید گفتگو کے اختتام کے ارادے سے بولی۔ ”تم اپنے لیے رعایتیں خود حاصل کرو گے اور اپنا سر بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے اُسے اپنے جسم پر مضبوطی سے جمائے رکھو گے۔ مقدس اقبال عظیم ہے۔“

”ہاں وہ عظیم ہے۔“ میں نے دہرایا اور اپنے برہم جذبات کی پردہ پوشی کی سعی کی لیکن میری کیفیتیں خود بخود منکشف ہونے لگیں۔ جب گفتگو ایسے مرحلے میں داخل ہو گئی۔ جہاں مجھے اپنے کسی سوال کے جواب کی امید نہیں رہی، تو میں نے دوبارہ اس کے حسن کا ذکر چھیڑ دیا اور اس کے سامنے اپنی وارفتگی و شغفگی کے دریا بہائے۔ میں اس غنیمت موقع پر کہ وہ میرے روبرو تھی۔ کوئی منفی تاثر قائم کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اتنے عرصے کی آرزوؤں کے بعد کہیں جا کر مجھے اس کے قصر میں اس کی تجلی دیکھنی نصیب ہوئی تھی۔ اس وقت جب میں نے اسے ایک حسین دہ شیزہ کے تصور میں دیکھا ہوگا تو میں کیا کہا ہوگا؟ میں نے کیا نہ کہا ہوگا؟ میں نے سوچا کاش یہ رنگین ماحول پتھروں میں اسی طرح منجمد ہو جائے میں انسانوں کو پتھروں میں منتقل کرنے کا عمل جانتا تھا۔ میں نے والہانہ انداز سے اسے دیکھا۔ آہ اور کچھ نہیں تو یہی بہت ہے کہ وہ میرے سامنے ہے اور اس کے بدن سے نکلتی ہوئی شعاعیں مجھے ٹھلسا رہی ہیں۔ یہ آگ کتنی فرحت بخش ہے۔ ایک لطیف خوشبو سارے ماحول میں رچی بسی ہے اور میرے اعصاب پر ایک لطیف نشہ طاری ہے، میں نے تمام ذکر چھوڑ دیے۔ صرف اس کے لازوال حسن کا مابرا بیان کیا۔ میں کہتا رہا، وہ سنتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے، پھر وہ یکا یک سخت اور سرد ہو جاتی ہیں۔ اس کی ذہین آنکھیں، اس کا تیز و طرار بدن کسمسا تا ہے اور فوراً سکت ہو جاتا ہے۔ اقبال کی نظروں میں وہ تابانی تھی، جو ہمیشہ مردوں کو فتوحات کرنے پر اکساتی ہے۔ میرا بیان ختم نہیں ہوا تھا، لفظ نہ جانے کہاں سے ادا ہو رہے تھے۔ وہ رنگ رنگ فضاء عطر بیز، موسیقی ریز۔ مگر میں مستقل طور پر یہاں اقامت گزیر نہیں ہوا تھا۔ کسی وقت بھی نماز واپسی کا حکم صادر کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اس سے درخواست کی کہ مجھے اس کے دست بوسی اور قدم بوسی کی اجازت دی جائے۔ میری درخواست ایک عجب شان بے نیازی سے قبول کر لی گئی، پھر میرے قدم زمین پر نہیں ٹکے۔ میں برق رفتاری سے آگے بڑھا اور فوراً شوق میں بے تحاشا، بے محابا اس کے مرمریں گداز، پیروں کو بوسہ دینے لگا۔

اس نے اپنا پاؤں آگے بڑھا دیا۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی لیکن میں نے اس کا پاؤں سینے سے لگایا اور اپنا کرب ناک چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ میں نے اُسے بہت نزدیک سے دیکھا۔ قریب تھا کہ میں اپنا دامن ہوش جلا بیٹھتا کہ میں بے حد درد انگیز لہجے میں کہا۔ ”مقدس اقبال، اپنے ہاتھ سے میرا گلا گھونٹ دے۔“

اس نے اپنا چہرہ متش چھت کی طرف کر لیا۔ میں نے اسکے پیروں پر آنکھیں رکھ دیں۔ ایسا سکون، ایسی نشاط، ایسی لذت الامان..... اس نے اچانک اپنی کلائی کو ایک دل ربا انداز سے جنبش دی۔ چشم زون میں نماز اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی دو شیرازیں منظر سے غائب ہو گئیں، پھر اچانک دیوار کا وہ خلا از سر تو تعمیر ہو گیا جو اس کی سواری کے وقت پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے ایوان کے چاروں طرف دیکھا، وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ بس رنگ تھے، روشنیاں تھیں اور موسیقی تھی اور ہم دونوں تھے۔ کئی خیال در آئے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ شاید اس نے میرے باطن کا حال پڑھ لیا ہے؟ شاید میرے بیان کا اعجاز ہے کہ مجھے یہ خلوت نصیب ہوئی۔ میں نے سوچا۔ زندگی کا اختتام کتنے خوبصورت طریقے سے ہو رہا ہے۔ اس وقت میں دنیا کا سب سے آسودہ آدمی تھا۔ میں نے اقبال کو دیکھا، اس کا چہرہ روشنیوں میں جذبات زدہ نظر آیا۔ پھر میں نے اس کا پاؤں پکڑ لیا اور اس کے ساتھ اپنا چہرہ وحشت سے رگڑتا رہا۔ وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر تاثر ڈھونڈنے کے لیے میں نے دوبارہ اپنا چہرہ بلند کیا، جو اس کی زلفوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ التفات پر آمادہ تھی۔ پھر پگھل رہا تھا۔ تاریک براعظم کی مقتدر ملکہ ایک عورت کے روپ میں جلوہ گر ہو رہی تھی۔ یہ میرا گمان تھا مگر کس قدر حسین گمان تھا۔ میں کچھ اور سوچنا نہیں چاہتا تھا میں اس اعزاز و کرم سے سیر ہونے کی ٹھان لی اور اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے پیروں کے اوپر کے پھول اور پتے وحشت میں نوچنے شروع کر دیے، مجھے اپنے حلق میں کانٹے جیسے محسوس ہوئے، میں تپ رہا تھا۔ اس کی پنڈلی وہ ساق سیمیں، پھولوں اور بتوں سے لدی پھندی وہ شاخ گداز۔ میں نے عالم سرمستی دے خودی میں اسکے پھول نوچ لیے اور اپنا چہرہ اس سے مس کر دیا۔ اقبال، مقدس اقبال۔ اپنے غلام جابر بن یوسف کو صرف ایک بار وحشتوں کا اظہار کرنے دو۔“ میں نے کہا۔ لیکن ابھی چند ہی پھول گرے ہوں گے کہ وہ تخت سے اٹھی۔ میں نے اس کی پنڈلی زور سے تھام لی۔ ”نہیں نہیں۔“ میں نے ہدیان بکا۔ ”نہیں نہیں۔“

ایوان کی موسیقی ایک شور میں تبدیل ہو گئی۔ چنگھاڑتی اور چیختی ناقابل فہم آوازوں کا شور..... میں نے اقبال کا قد دیکھا۔ اس کا ترشا اور ڈھلا ہوا بدن۔ میرا فریب ہے کہ میں نے اس کے مضطرب چہرہ دیکھا اور کوشش کی کہ اچک کر اس کے بدن کے سارے پھول نوچ لوں۔ اسکے بعد موت بھی نصیب ہوتی مگر ایک آسودہ موت۔ میں نے اجازت چاہی لیکن اقبال نے بے چینی سے اپنا پاؤں میری دسترس سے آزاد کر لیا اور آخر وقت میں۔ میں نے اتنا سنا کہ شور ناقابل برداشت ہو گیا ہے اور اڑتے ہوئے بادلوں کی گھڑ گھڑاٹھٹ نے ایوان کا سارا ماحول بدل دیا ہے۔ میں نے اپنے ارد گرد منڈلاتے ہوئے مرغوں کو دیکھے۔ ساری روشنیاں بند ہو گئیں اور ایوان تاریکی میں ڈوب گیا۔ میری نبض ڈوبنے لگیں میں لرزتے ہوئے درود یوار دیکھے، جیسے وہ سب مجھ پر گر رہے ہوں۔ اس کے بعد مجھے یاد رکھنے کا ہوش نہ رہا، میں فرش پر پھسل گیا اور میری سماعت و بصارت کچھ دیکھنے، کچھ سننے کی استطاعت کھو بیٹھی۔

☆=====☆

یہ سب کیا ہو گیا تھا۔

میرے سینے میں جلن ہو رہی تھی اور اعصاب پر تشنگ کی کیفیت طاری تھی۔ جب تاریکی کا طلسم ٹوٹا اور میرے ذہن کی صبح ہوئی، تو مجھے اپنے نیچے بدلی ہوئی زمین کا احساس ہوا۔ میں اپنے جھونپڑی نما مکان میں پیال کے بستر پر بے ترتیب حالت میں پڑا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے رنگ و

نور کا ایک سیل رواں تھا۔ اب نہ وہ منتش دیواریں تھیں، نہ وہ رنگ برنگے بادل میں اپنی تمام حراماں نصیبوں کے ساتھ توری کے سخت فرش پر موجود تھا۔ وہ منظر ایک خواب کی طرح گزر گیا لیکن میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ میرے ہاتھ میں گلاب کا ایک تازہ پھول تھا۔ ایک گلابی پھول جسے اقبال کے بدن کی زینت بننے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ میں نے کسی دیوانے کی مانند اسے آنکھوں سے لگایا۔ اس کی پتیاں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ میں انہیں جمع کرنے کے لیے فرش پر لوٹا رہا۔ ایک مدت کی جستجو اور طلب کا صلہ گلاب کی یہ پتیاں تھیں۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ آغا فانا وہ پری و ش اضطراب میں کھڑی ہوتی۔ ایوان کی روشنیاں معدوم ہوئیں اور بادلوں نے گرجنا شروع کر دیا۔ پھر سب کچھ بکھر گیا۔ وہ رنگین نقشہ پلٹ گیا۔ اس لمحے کون عقل و شعور کی پاس داری کر سکتا تھا۔ یقیناً میں نے اپنی حدوں کا خیال نہیں رکھا تھا۔ میری حدیں ایک سردار کی حیثیت سے متعین ہوتی تھیں۔ اس کا ہوش رُبا سراپا دیکھ کر کون صرف ایک سردار رہ سکتا تھا؟ میں نے تو اس کے جمال کو خراج پیش کرنے کے لیے اپنے جنون کی ابھی ابتدا ہی کی تھی۔

مگر اچانک یہ سب کیوں رونما ہو گیا؟ کیا تاریک براعظم کے برگزیدہ لوگوں کو یہ قربت شاق گزری؟ کیا انہیں خبر ہو گئی کہ اقبال ان سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ اور صرف تین زمینوں کے سردار کو غیر معمولی عنایات سے نوازی رہی ہے؟ کیا جارا کا کا کی مقدس روح اقبال کے صاف و شفاف بدن پر کوئی داغ دیکھنا پسند نہیں کرتی؟ آہ اگر میں اس کے لمس لطیف اور نظارہ جہاں سوز ہی پر قناعت کر لیتا اور انگریزوں اور باگمان کی طرح قصر اقبال میں بھی اپنا نفس مطیع رکھتا تو مجھے اس طرح واپس نہ کیا گیا ہوتا۔ اب سامنے خلائی خلا نظر آتا ہے۔ جتنا قریب جاییں، اُس بت طناز کا دامن اتنا ہی دُور ہو جاتا ہے۔ تاریک براعظم کے ایک سرفراز اجنبی کا انجام قریب تھا کیونکہ اس نے ہوش کھو دیا تھا۔ مجھے دوبارہ یہاں بھیج کر معلق کر دیا گیا تھا، میں نے اس کے حسن کی توصیف میں بیان کیے جانے والے لفظ ضائع کر دیے میرے کلام نے جواثر کیا تھا، میرے ہاتھوں نے اسے تباہ کر دیا۔ میرے عجز نے جو گنجائش پیدا کی تھی، میری وحشت نے اسے تاراج کر دیا۔ میرے بستر پر کانٹے بچھے ہوئے تھے اور ذہن سلگ رہا تھا۔ جابر بن یوسف یہ کیا ہو گیا؟ اب فیصلے کا انتظار کرو۔ تم اس کی مرضی کے بغیر مر بھی نہیں سکتے۔ تذبذب اور کشمکش دور کرنے کے لیے میں نے زور سے آنکھیں پھینچ لیں اور اپنا منہ بند کر لیا لیکن اس سے نزاع و فشار دور نہیں ہوا۔

اس وقت میری آپہں اور کرب ناک آوازیں سن کر دوسرے کمرے سے ہندی بوڑھے سرنگا کی لڑکی سریتا آئی۔ میرا بدن اینٹھا ہوا تھا اور میں بستر پر اضطراب میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ سریتا نے چیخ چیخ کر اپنی خادماؤں کو آوازیں دے دیں اور مجھے اپنے پہلو میں بیٹھا کر حلق میں کوئی مشروب انڈیلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مشروب کا ذائقہ بے مزہ نہیں تھا لیکن سریتا کا پہلو نرم و گداز تھا۔ مجھے کچھ سکون سا ملا۔ میں نے بے تابانہ اپنا سر اس کی آغوش میں دھر دیا۔ اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میں نے اس کی آغوش میں پناہیں ڈھونڈیں۔ سریتا میرا سر تھام کر ماتھا دبانے لگی۔ میں اس کے پہلو میں زار و قطار رونا چاہتا تھا لیکن میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا۔

”سیدی! تمہیں کیا ہو گیا؟“ وہ میرے شانے جھنجھوڑ کر بولی۔

”میں مر رہا ہوں۔“ میں نے اکھڑی سانسوں سے کہا۔

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُسے اپنے چہرے کے تاثرات کے اظہار میں مشاقی حاصل تھی۔ ”سیدی شاید تم حوصلہ کھو بیٹھے۔ تمہارے

ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے، جو تم اتنے دل شکستہ اور در ماندہ نظر آتے ہو؟ سیاہ رات ڈھل جائے گی۔ تمہارے لبوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔“

”سرتیلا! ہم یہاں ہمیشہ اجنبی رہیں گے کیونکہ طویل زمانوں کا علم ہمارے مختصر عمر میں ہم تک منتقل نہیں ہو سکتا۔ ہماری جہالت کسی دن ہمیں ایک بڑی تباہی سے دوچار کرے گی۔ ہم ہمیشہ اذیتوں میں زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ کیا تم میرا ایک کام کر دو گی؟“

”کہو سیدی!“ اس نے تشویش سے کہا۔ ”مجھے حکم کیوں نہیں دیتے۔“

”میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فرد کا زمانی و مکانی رشتہ اُس سے کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ شاید میری بات تمہاری عقل میں آ جائے۔ ہم کسی دوسرے عہد اور دوسری زمین میں آگئے ہیں۔ ممکن ہے ہم کسی قبرستان میں مقیم ہوں۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ میرے شعور سے میرا رشتہ منقطع کر دو۔ میرے ہاتھ خود یہ کام انجام نہیں دے سکتے۔“

”سیدی!“ سرتیلا نے حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور میری گردن سے لڑکا ہوا خنجر پکڑ لیا۔ ”سیدی جابر! تمہارے اعصاب آرام کے مقروض ہیں۔ غالباً تم شدید تنہائی محسوس کر رہے ہو۔ پھر وہ افسردگی سے بولی۔ ”مگر تم نے خود کو تنہا کیوں سمجھ رکھا؟ تمہارے بلند تر مقام سے کچھ اور زندگیاں بھی وابستہ ہیں۔ تم نے کبھی ان کی طرف بھی غور سے دیکھا ہے؟“

میں نے سرتیلا کی ٹھوڑی پکڑ لی۔ اس کے چہرے پر آنسو رقصاں تھے۔ سرتیلا نے اس سے پہلے ایسی گفتگو کبھی نہیں کی تھی۔ ”سرتیلا! تم اپنے باپ کی طرح ایثار پیشہ ہو۔ تم رورہی ہو؟“ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔ اقبال کے گلاب کی پتیاں پھر بکھر گئیں۔

”تم اس سیاہ خانے میں ایک کرن ہو۔ جب یہاں سے تمام مرد اٹھ جائیں گے تو میری پناہ گاہ غیر مہذب وحشیوں کی آغوش ہوگی، جس سے خود تم نے کئی بار مجھے بچایا ہے۔ سیدی جابر! تم اتنے خور غرض ہو کہ تنہا مرنا چاہتے ہو؟ تم کہتے ہو کہ ماضی سے تمہارا تعلق نہیں ٹوٹا مگر تمہاری غیرت کہاں گئی؟“

اس کم سخن نازک اندام لڑکی نے پہلی بار ایسے دلکش اور گداز پیرائے میں مجھے سے باتیں کیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اسے فراموش کرنے کا جرم کرتا رہا ہوں۔ میں نے زور سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور انھیں بوسہ دیا۔

ذہن سے قصر اقبال کے واقعے کا تاثر دور نہیں ہوا تھا لیکن سرتیلا نے ایک بکھرے ہوئے شخص کو سمیٹ دیا۔ وہ جابر بن یوسف میں دوبارہ زندگی کی حرارت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے مجھے بستر سے اٹھایا، میں نے گلاب کا پھول ایک پتے میں محفوظ کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ پھر توری کی حسین خادماؤں نے سرعت کے ساتھ میرا جسم معطر پانی سے دھویا۔ آج غسل کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میرے ساتھ کوئی سلوک کر رہی ہوں۔ سرتیلا نے میرے بال درست کیے۔ میں نے جارا کا کاکو پڑی ہاتھ میں لے کر توری کی دوشیزاؤں اور سرتیلا کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کیا اور اس سے رہنمائی کی درخواست کی۔ پھر میرے سامنے بھنا ہوا گوشت پیش کیا گیا۔ دل غذا کی طرف مائل نہیں تھا مگر میں سرتیلا کے ہاتھوں سے بھنے ہوئے گوشت کے لقمے حلق میں اتارنے پر مجبور تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طبیعت اعتدال کی طرف آرہی تھی۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نماز غائب تھی جو قصر اقبال کی طرف سے مجھے فرحت دیدہ راحت دل کے لیے عطیے کے طور پر سونپی گئی تھی۔ میں

نے اسے متعدد بار پکارا مگر میری آواز خلاؤں میں گم ہو گئی۔ ایک رات ایشوار بھی اسی طرح غائب ہو گئی تھی۔ شاید اقبال نے اپنا عطیہ واپس لے لیا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ اقبال اور کیا واپس لے گی؟ کاہن اعظم سمورال اور سرنگا کے پاس جا کر میں ان سے قصر اقبال میں پیش آنے والے واقعے کی توجیہ و تشریح کا خواہاں تھا لیکن اس مقصد کے لیے یہ مناسب موقع نہیں تھا۔ رات بھر سرتا اور خادما میں میری دل جوئی کرتی رہیں اور میرا غبار دور کرنے میں منہمک رہیں۔ وہ میرے قریب بیٹھی رہیں اور میں فیصلے سوچتا اور مستر دکر تار ہاتا اس کہ میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

صبح ہونے سے پہلے میں توری کے سبزہ زار کی طرح تروتازگی محسوس کر رہا تھا۔ ہاں ذہن کے کسی گوشے میں ایک اجنبی خوف چھایا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی، بے بس اور دل گرفتہ لوگوں کے لیے بڑی گراں ہوتی ہے۔ پنجرے میں دن کا اجالا بڑا نہیں لگتا۔ تاریک براعظم ایک بڑا پنجرہ تھا جو رات کو اور خوف ناک ہو جاتا تھا۔ صیاد سے گداز کی توقع عبث تھی۔ دن کی روشنی پھیلنے تو میں نے عزم کیا۔ جابر بن یوسف! باور کر کہ تو ایک درخت ہے، خود کو یہ تسلیم کرنے پر آمادہ کر کہ تو ایک بے پر پرندہ ہے۔ تیرے لیے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ تیرا ہر سہارا بے بنیاد ہوگا۔ زمین پکڑنے کے لیے اپنی شاخیں دور دور تک پھیلا۔ آسمان پر اڑنے کے لیے اپنے بازوؤں میں دوبارہ پر بڑھا اور وقت کا انتظار کر۔ وقت یوں نہ گنوا۔ دیوتاؤں کا جو بھی رد عمل ہوگا وہ تیری مضبوطی اور تیرے علم کی دیانت کی بنیاد پر ہوگا۔ سرنگا کی عظیم دیوی بھی اس سرزمین پر بے بسی محسوس کرتی ہے ورنہ اب تک وہ ہم تیرہ بختوں کو یہاں سے نکال لے جاتی۔ تیرے لیے اطمینان کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ تو خود کو ان سیاہیوں کا عادی بنا لے۔ آہ کیا تو نے پہلے غور نہیں کیا؟ کیا تو نے پہلے کچھ نہیں دیکھا؟ تو نے خود سے کہا کہ اس کا حصول مشکوک ہے لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے بہتر کسی امکان کی تلاش ہے۔ تیرا انتشار ارتقا میں تبدیل ہو کر پھر اپنی راہ کیوں بھٹک جاتا ہے؟ چل حرکت کر۔ چل کہ سوچتے سوچتے تیرا دماغ پھٹ جائے گا اور بیٹھے بیٹھے تیرے جسم پر زنگ لگ جائے گا۔ اٹھ اور آسمان کی طرف مت دیکھ۔

مجھے یاد آیا کہ میں ایک راست سمت میں چل رہا تھا کہ اقبال کی دید نے سارا سلسلہ درہم و برہم کر دیا۔ مجھے پھر وہیں سے ابتدا کرنی چاہیے۔ اقبال کی بارگاہ میں جانے سے پہلے میں نے جزیرہ توری میں ابھرنے والے خطروں کا سرچل دیا تھا۔ میں نے نوجوانوں کو ہاتھ پاؤں پھیلانے سے پہلے اپنے احکام کی زنجیروں میں باندھ لیا تھا۔ میں توری کا سب سے بڑا شخص تھا۔ اس زمرے سے وہ لوگ خارج کر دیے جائیں جو اقتدار میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور جنگلوں، غاروں میں آباد دیویوں سے دور دیوتاؤں کی خدمت میں مصروف ہیں۔ توری کا یہ سب سے بڑا شخص سب سے غم زدہ شخص تھا کیونکہ اسے غم کا عرفان حاصل تھا۔ اس کے احساسات نے اس ماحول میں پرورش نہیں پائی تھی۔ سارا قبیلہ سورا تھا۔ بے سدھ پڑھے ہوئے لوگ..... عورتیں اور مرد ایک دوسرے کے جسموں پر تنکیہ کیے ہوئے تھے۔ سکون اور اطمینان کی نیند..... انھیں دیکھ کر مجھے رشک آیا اور میں ان کے قدموں اور سروں سے بچتا ہوا گھنے جنگل میں پہنچ گیا۔ جنگل میں صبح کا منظر بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے۔ پرندوں کے چچوں اور درندوں کی گونج نے مجھے زندگی کا سبق سکھایا اور میں نے خود کو سمجھایا کہ میں یقیناً ان درندوں سے افضل ہوں۔ میں بول سکتا ہوں، سوچ سکتا ہوں لیکن یہی تو ایک نقص ہے، بولنے اور سوچنے کی وجہ سے انسان کائنات کی سب سے نجیف اور سب سے قوی مخلوق ہے۔ جنگل میں گزرتے وقت میں نے اب تک سیکھے ہوئے توری کے ظاہری و باطنی علوم سے اپنے لیے ایسا غار تلاش کرنا شروع کر دیا جسے میں سمورال کی طرح اپنی عبادت گاہ یا سحر خانہ بناؤں۔

سمورال کی تربیت سے مجھے مادرائی علوم پر دسترس حاصل ہو گئی تھی۔ میرے پاس نادر تحائف تھے۔ جارا کا کا کی کھوپڑی گرفت میں لے کر میں نے چوٹی اڑدھا متحرک کیا اور اسے زمین پر چھوڑ دیا۔ وہ زمین سوگھتا پھر رہا تھا۔ آخر میں نے اپنا موجودہ راستہ ترک کر کے اونچے درختوں کے درمیان چلنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ اڑدھا ٹھہر گیا۔ میں نے وہ دیوار جیسی اونچی زمین نرمی ختی کا اندازہ کرنے کے لیے ڈگنی کے سینگوں سے کریدی۔ اوپر کی مٹی ہٹی تو اندر پتھر کا ایک دیو قامت ٹکڑا نظر آیا۔ معلوم ہوتا تھا عرصے سے کسی نے اس غار کو نہیں چھیڑا ہے۔ جزیرہ توری میں ایسے غاروں کی کثرت تھی۔ ان میں ایک غار قسرا قابلا کو بھی جاتا تھا جہاں سب سے پہلے مجھے ڈولین ملی تھی اور جو لمبی سرنگ کے بعد ایک عظیم الشان زمیں دوزخ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ باگمان میں لوریمہا کے قصر تک پہنچنے کے لیے بھی مجھے ایک غار سے گزرنا پڑا تھا۔ میں نے پتھر کی جسامت ٹٹولنے کے لیے اپنے جسم کا سارا زور لگایا۔ میں اسے ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے اوپر مٹی کی دبیز تہ تھی۔ جس پر جھاڑ جھکاڑ تھے اور جسے چھوٹے درختوں نے اپنا مسکن بنالیا تھا، سب سے پہلے میں نے جھاڑ جھکاڑ صاف کیے۔ پھر زور جا کر پتھر پر شپالی کا نشانہ بنایا اور احتیاط کے طور پر جارا کا کا کا عمل دہرایا، جو مجھے سمورال نے سکھایا تھا۔ اندر روحوں کی موجودگی بھی ممکن تھی۔ جیسا کہ مجھے انکروما میں سابقہ پڑا تھا۔ شپالی کے زور اور جارا کا کا کا عمل سے پتھر ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا۔ میں نے اندر کی بھیانک روشنی میں جھانک کر دیکھا۔ بدبو کا ایک جھونکا میرے نتھنے زخمی کر گیا۔ میں ایک لمحے سوچتا رہا، پھر چوٹی اڑدھا آگے کر کے میں نے غار کے اندر قدم رکھا۔ شپالی کی روشنی میں غار کے اندر کا حصہ عریاں ہو گیا تھا، اندر کی فضا بڑی مسموم تھی۔ میں حفظ المقدم کے طور پر زارشی کے صحرا میں بوڑھے عبادت گزاروں کا عمل یاد کر رہا تھا، جسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ ابھی میں غار کے اندر زیادہ دور نہیں پہنچا ہوں گا کہ اڑدھا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔ میں نے جارا کا کا کی کھوپڑی زور سے پکڑ لی۔ غار کی دیواریں ہموار نہیں تھیں۔ کہیں وہ تنگ اور کہیں فراخ تھیں اور اندر درختوں کے تنے نظر آتے تھے۔ طرح طرح کے جالے اور گرد۔ ان چیزوں سے اس کی کھنگنی ثابت تھی۔

دفعۃً اندر سے خرخراہٹ سے مشابہہ کچھ ناقابل فہم آوازیں آنی شروع ہوئی۔ میں اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے ایک ہیولا اپنی طرف خاصا تیز بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ہیولے کے قریب آنے پر شپالی کی روشنی میں اس کا چہرہ میری نظر کے دائرے میں نمایاں ہو گیا۔ وہ آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ نظروں میں حیرانی مترشح تھی۔ شپالی کی چمک اس کی آنکھیں خیرہ کر رہی تھی۔ اس کے سارے جسم پر بال اُگے ہوئے تھے اور وہ اتنا نجیف و نزار تھا کہ اس کے زندہ رہنے پر شبہ ہوتا تھا مگر اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی رنق موجود تھی۔ کیونکہ وہ شپالی کی روشنی میں ہیرے کی مانند چمک رہی تھی۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک سیاہ منمنی گور یا لاکوئی سیاہ ریچھ تھا۔ میں نے تاریک براعظم میں ایسے حلیے اور قد و قامت کا شخص کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات اس کے چہرے اور غار کی شکستہ حالت سے صاف تھی کہ وہ عرصے سے باہر نہیں نکلا ہے اور اس اندھیرے غار میں لامحدود مدت سے مقیم ہے۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، میں فوراً کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ البتہ میں نے سوچا، اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ اس سرزمین کے ان عبادت گزاروں میں شامل ہے، جو اس طلسماتی دنیا کی روح ہیں، چنانچہ یہ ایک غیر معمولی ساحر بھی ہوگا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا لیکن یوں واپس ہونے کا اب کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے سکون استغراق اور ریاضت میں میرے غل ہونے پر اس کے مزاج کا برہم ہونا فطری امر تھا۔ میں نے متوازن رویہ اختیار کرنے میں پہل کی اور نہایت احترام اور عزت سے اسے ریچھ کو مخاطب کیا۔ ان حالات میں یہی کیا جاسکتا تھا؟ میں اس

کے آگے جھک گیا اور عجز و انکسار سے اپنا تعارف کراتے ہوئے میں نے اسے معذرت چاہی۔ وہ میرا انداز مخاطب حیرت سے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مجھے کوئی جواب دیے بغیر اشارہ کیا کہ میں اس کے پیچھے چلوں، انکار کا موقع نہیں تھا۔ میں اس کے پیچھے چلنے لگا لیکن اسی وقت سمورال کی مالا کے دانے مجھے اپنے سینے پر چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سمورال کی مالا پہلے بھی کئی خطرناک موقعوں پر مجھے اس قسم کی تنبیہ کر چکی تھی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس بوڑھے کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے شپالی تھیلی پر رکھ دی۔ دوراندر جا کر غار ایک چوکور کشادہ جگہ میں تبدیل ہو گیا۔ دیواریں میلی کچی اور سیاہ تھیں۔ کوئی قدیل روشن نہیں تھی۔ کوئی مشعل بھی نہیں تھی۔ ایسی خوف ناک تاریکی میں وہ شخص نہ جانے کب سے اس غار میں محبوس تھا۔

بڑے دائرے والی جگہ ٹھہر کر اس نے مجھے بڑے برتن سے ایک جام پیش کیا۔ میں نے شپالی اپنی مٹھی میں بند کر لی۔ غار میں پھر تاریکی چھا گئی۔ جام پینے کے بجائے میں نے اسے زمین پر لوٹ دیا تھا۔ دوبارہ شپالی کی روشنی میں، میں نے خالی جام اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایک ٹاپے بعد وہ میرے نزدیک آیا اور اس نے بالکل غیر متوقع طور پر ہاتھ بڑھا کر میرے گلے سے چوٹی اڑھا چھین لیا۔ سمورال کی مالا کے دانوں کے انتباہ سے میں پہلے ہی ہتھاط ہو گیا تھا۔ لہذا میں نے چوٹی اڑھا اس سے اسی طرح فوراً چھین لیا، جیسے اس نے چھینا تھا۔ میری اس جسارت پر اس کی آنکھیں قہر و غضب کی علامت بن کر دکھیں اور اس نے جھنجھلا کر وہیں کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ پشت کی طرف دراز کیا۔ دیوار دور تھی مگر اس کا چھوٹا سا ہاتھ وہاں پہنچ گیا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اچانک مجھے اپنے دائیں گال پر بیک وقت متعدد کیلیں سی جھتی محسوس ہوئیں۔ کیلوں کی نوکیں اتنی سخت اور شدید تھیں کہ میری چیخیں نکل گئیں اور میں شدت درد سے زمین پر پیر پٹنے لگا۔ مجھے بوڑھے شخص کا ہنستا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس بدبیت کے دانت اس کے حلیے کے تمسخر اور مضحکہ خیزی میں اضافہ کر رہے تھے اور وہ کوئی شیطان معلوم ہو رہا تھا۔ میرے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ بے شمار پیروں والا یہ زہریلا بچھو میرے گال میں پیوست ہو گیا تھا اور جیسے کوئی میری رُوح کھینچ رہا تھا۔

درد و کرب میں لڑھکتے پڑھکتے میں نے ایک بار پھر صحرائے زارشی کا عمل دُہرا کے شپالی اپنے جلتے ہوئے گال سے مس کی، جہاں کچھ پیوست تھا۔ بچھو نے اپنے پیر اچانک ڈھیلے چھوڑ دیے۔ دوبارہ جب اس نے میرے زخمی گال پر یہی عمل کیا تو میں افزیت سے بری طرح تڑپنے لگا۔ میں نے شپالی سمیت اپنا ہاتھ گال پر ٹمانے کے انداز میں مارا اور تمام طاقت یک جا کر کے اپنے گوشت سے بچھو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گوشت کا مچا، بچھو اور شپالی یہ تینوں چیزیں میں نے زمین پر پھینک دیں اور اس وقت مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ شپالی زمین پر گر تے ہی بوڑھا ساحر بندر کی طرح پھرتی سے زمین کی طرف لپکا۔ مجھے آنے والے خوف ناک لمحوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر اپنے تحائف پشت پر ڈال کر ساحر پر ایک زقہ لگائی اور اس کا نحیف و نزار جسم دبوچ کے شپالی سے دُور کر دیا۔ اس کے بکری جیسے جے میں شیر جیسی طاقت تھی۔ تاریک براعظم میں اس وقت میں نے موت کی پرواہ کیے اور کوئی توقف کے بغیر اس کا سر زمین سے مارنا شروع کر دیا۔ میں کوئی پاگل تھا یا کوئی بھوکا درندہ تھا۔ اس نے بڑی شدید مزاحمت کی اور مجھے اپنی ناگوں کے زور سے دیوار پر دھکیل دیا۔ وہ پھر شپالی کی طرف لپکا، مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ اپنا چوٹی اڑھا زمین پر ڈال دیتا۔ اس بار میں نے زور سے چیخ ماری، بوڑھے نے حیران نظروں سے پلٹ کر دیکھا، اس کا میری طرف متوجہ ہونا

تھا کہ میں نے اچک کر اسے دبوچ لیا اور اسے لیے زمین پر لوٹ گیا۔ اس مصروف اور مشکل مرحلے میں میں نے کسی طرح یہ لمحہ بھی حاصل کر لیا کہ میں اپنے محسن اژدہ کو اشارہ کر سکوں۔ وہ شپالی کے حصول کے لیے زمین پر پرینگے لگا۔ بوڑھا شخص میرے جسم کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور میں اس کا سر زمین سے پاش پاش کر رہا تھا۔ اب کی بار میں نے اس کی دہلی پتلی مگر مضبوط ٹانگیں دبائی ہوئی تھیں۔ اژدہ نے شپالی نگل لی تھی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد میں کھڑا ہوا اور میں یہ غلٹ تمام ڈنگی کے سینک گلے سے اتار کر بوڑھے ساحر کے سینے میں پیوست کر دیے۔ اژدہ میری ٹانگوں کے سہارے اوپر چڑھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا بوڑھا ساحر اب مشکل سے مزاحمت کرے گا لیکن میں نے اس گدھ کو کوئی موقع نہیں دیا اور شپالی اس کے جسم پر دے ماری، اس کی ہولناک چیخ سے سارا غار گونج گیا۔ وہ آخری چیخ تھی جس نے غار میں ایک گرج چمک سی پیدا کر دی تھی۔

اس کے بے دم ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا دم بھی نکل رہا ہے۔ میں نے غار سے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ لیکن میرے قدم ڈگمگانے لگے اور میں ایک مقام پر بے سدھ گر گیا۔ وہ صبح تھی یا شام یا کئی دن گزر گئے۔ مستقل تاریکی اور مستقل روشنی میں وقت گزرتا محسوس نہیں ہوتا، وقت تو روشنی اور تاریکی کے نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ جب میرے حواس خارجی اثر سے آزاد ہو گئے اور دوبارہ میرے جسم سے وابستہ ہوئے، تو میں نے دیکھا کہ میں غار کی نرم زمین پر پڑا کر رہا ہوں اور میرا رفق اژدہ میرا گال چاٹ رہا ہے۔ دفعۃً میرے ذہن میں سارا واقعہ کوند گیا، میں نے اپنے گال پر ہاتھ رکھ کے دیکھا۔ وہ حصہ زخمی ہو چکا تھا اور اژدہ کی رطوبت اور خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے اژدہ کو وہاں سے ہٹا کے اُسے ایک بوسہ دیا اور کراہتا ہوا اٹھا۔ نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے کسی نے سارے جسم کا رس نچوڑ لیا ہو، پھر غار سے باہر جانے کی بجائے میں اندر کی طرف بڑھا۔ چوکور دائرے کے قریب بوڑھے ساحر کی لاش جلی ہوئی پڑی تھی اور سارا غار شپالی کی وجہ سے منور ہو گیا تھا۔ میں نے ہر چیز کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ دیواروں پر لٹکے ہوئے نوادرمردہ جانوروں کی کھوپڑیاں اور طلسمی آلات دیکھ کر میری حیرت دوچند ہو گئی۔ دیواریں ٹھونک کے میں نے اندر کے راستے دیکھے، پتھر کی دیواریں میرے نوادری کی وجہ سے کھل گئیں اور میں کھوہ نما کمرے کے ایک سلسلے سے گزرا۔ یہ ایک بہت بڑی زمین دوز عمارت تھی۔ بہت بڑا طلسم خانہ۔ ہر کمرے میں نوادری کی ایک دنیا آباد تھی۔ عجب عجب شکل کی چیزیں۔ میں ان میں سے چند کا استعمال سیکھ چکا تھا اور ان کی اہمیت سے واقف تھا۔ میں مختلف کمرے کا جائزہ لیتا ہوا سرنگ پار کر کے غار سے باہر آ گیا۔ باہر بھی تاریکی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک سموچا دن یا کئی دن مجھے اس غار میں گزر گئے تھے۔ سرد ہوا کے جھونکے نے زخم کے زخم سے اور زیادہ میس پیدا کر دیں لیکن اتنا بڑا اثاثہ پا کر خوف اور مسرت کے طے جلے جذبات مجھ پر غالب آ گئے تھے۔ میں اپنا کندر بھول چکا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے غار کا دہانہ بند کرنا مشکل تھا کیونکہ بڑا پتھر پہلے ہی کتنے حصوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ دیر تک میں ادھر ادھر سے پتھر اور جھاڑ جھنکار جمع کر کے غار کے دہانے پر رکھتا رہا۔ میں اسے اس طرح تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ جب دہانہ عام آدمیوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے لائق ہو گیا تو میں اپنا زخمی گال سہلاتا ہوا کچھ فتح مندی، کچھ سرشاری، کچھ شک اور کچھ خوف کے احساسات کے ساتھ جنگل سے واپس چلا۔ جگہ کی شناخت میرے لیے مشکل نہیں تھی، اس لیے کہ پتھر اس ترتیب سے رکھے گئے تھے کہ میں اسے بڑی آسانی سے شناخت کر سکتا تھا۔ میں تھکا تھکا آبادی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

توری میں رات کا شباب نمایاں تھا۔ میں ان سے چھپتا چھپاتا اپنی جھونپڑی میں واپس آ گیا، سریتا میرا زخم دیکھ کر چیخ پڑی۔ مجھے گہری نیند

آ رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کون جھونپڑی میں آیا، فزارو، زارے، سرتیا قبیلے کے اور معمر لوگ۔ طیب جواد، میں گہری نیند سو گیا، اس لیے کہ یہ ایک محفوظ جگہ تھی۔ یہ میرا ٹھکانہ تھا۔

دوسرے دن صبح میرے مکان کے باہر قبیلے کے لوگوں کا اڑدھام تھا، جواپنے سردار کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ فزارو اور زارے ایک طرف مودب کھڑے تھے اور سرتیا خادماؤں کو احکام دے رہی تھی۔ باہر کے زبردست شور اور اندر کی سرگوشیوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ سرتیا کا اداس چہرہ کھل اٹھا۔ زارے نے باہر جا کر اعلان کیا کہ ان کا سردار خیریت سے ہے۔ میں رات بھر بے ہوش رہا تھا اور رات بھر توری کے اطبا میرے زخمی گال پر مشق ستم کرتے رہے تھے۔ زخم پر لپ لگا ہوا تھا اور ہلکی سوزش ہو رہی تھی۔ میرے جاگتے ہی سرتیا نے طرح طرح کے سوال شروع کر دیے اور ناراض ہونے لگی کہ میں خطروں میں دانستہ کود پڑتا ہوں اور اتنے بہت سے غلام ہونے کے باوجود تنہا جنگل میں سفر کرتا ہوں۔ میں نے سرتیا کی بات سنی ان سنی کر دی۔ میں اسی وقت اٹھ کر سمورال کے پاس جانا چاہتا تھا تا کہ اسے کل کی مہم کا حیرت انگیز واقعہ سناؤں اور وہ نوادر دکھاؤں جواب جزیرہ توری کی روایت کے مطابق میری ملکیت تھی۔ سمورال سے معلومات حاصل کیے بغیر میں ان نوادر کی اہمیت و افادیت سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر چند سمورال کو وہاں لے جانے میں پس و پیش بھی تھا مگر سمورال کو شریک راز کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سرنگا بھی اس غار کی دریافت و بازیافت پر غیر معمولی رد عمل کا اظہار کرے گا، پھر مجھے خیال آیا اس معاملے کے انکشاف میں کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے سمورال نے اپنے طلسمی کڑھاؤں میں خود میری کامیابی کا نظارہ دیکھ لیا ہو اور سرنگا کو بھی اپنی دیوی کی اعانت سے اس کی خبر ہو گئی ہو۔

اصل میں سب سے پہلا کام جزیرہ توری پر آئے ہوئے اجنبیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا جو ابھی تک قید میں تھے، دیوتاؤں اور اقبالوں کو لازماً اس امر سے دل چسپی ہوگی کہ مہذب دنیا کا ایک شخص اپنے لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرتا ہے؟ یہ ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا مگر یہاں مردم آزاری، دل آزاری جیسے روح فرساریوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ادھر مہذب دنیا کے لوگوں سے ملنے، باز پرس کرنے اور ان کی دردناک سرگزشت سننے کا اشتیاق دانا، اپنے آپ پر جبر کرنے کے برابر تھا۔ میں جلد از جلد ان کا فیصلہ کر کے اپنا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جتنی دیر ان کے فیصلے میں تاخیر ہوتی، میرے سینے پر ایک بوجھ رہتا۔ تنہا جانے کے بجائے میں نے فزارو اور زارے کو ساتھ لے لیا۔ مجھے بستر سے اٹھتے دیکھ کر انہوں نے روکنا چاہا لیکن میں نے انھیں دھتکار دیا اور ایک خادمہ کو راستے سے ہٹانے کے لیے ضرب لگائی، وہ تڑپ کر ایک طرف ڈھیر ہو گئی۔ فزارو، زارے اور سرتیا نے اس کے بعد کوئی لفظ ادا نہیں کیا۔ میرے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر جواد سمیت قبیلے کے سارے لوگ زمیں بوس ہو گئے۔ دور تک انسانوں کی پشتیں نظر آتی تھیں۔ پھر فزارو کے حکم پر وہ اٹھ گئے اور میں نے اپنے قریب کھڑا ہوا درخت ایک جھکے سے گرا دیا۔ مجمع میں نعرہ ہائے تحسین کا شور بلند ہوا، میں فزارو اور زارے کے ساتھ ان کے درمیان گزرتا ہوا اس سمت جانے لگا جہاں اجنبی لوگ سب سے الگ تھلگ قید رکھے گئے تھے۔ انھیں دوبارہ دیکھنے کے لیے میرے قدم خود بخود تیزی سے آگے بڑھنے لگے، پہلی بار میں نے انھیں سرسری طور پر دیکھا تھا لیکن اب میں ان سے آنکھیں ملا سکتا تھا کیونکہ میں یہاں کا سردار تھا اور مہذب دنیا سے میرا تعلق ختم ہو چکا تھا۔ فزارو اور زارے کے اشارے پر سارا مجمع منتشر ہو گیا۔ ڈاکٹر جواد نے میرے ساتھ آنا چاہا، میں نے اسے روک دیا۔ سرتیا بھاگ کر میرے پاس آ گئی، میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ میرے پہلو سے لگی چل رہی تھی۔

اجنبیوں کی چھوٹیڑیوں پر نیزے بردار وحشی تعینات تھے۔ اپنے سردار کے سامنے وہ سر بسجود ہو گئے۔ میں نے سریتا کو منع کیا کہ وہ اجنبیوں کے سامنے انکی زبان میں گفتگو نہ کرے بلکہ خاموش رہے۔ قیدیوں کو باہر نکالنے کا حکم دیا گیا۔ اندر سے بڑی شکستہ حالت میں قیدی یکے بعد دیگرے برآمد ہوئے۔ ان کے لباس تار تار تھے اور چہروں پر غم و اندوہ، امید و بیم کی کیفیتیں نمایاں تھیں۔ زارے نے پھنکار کر کہا۔ ”ہمارا سردار جابن بن یوسف!“

انہوں نے مضحک گردنیں اٹھائیں اور چونک کر میری طرف دیکھا، میں زارے، فزارو اور دو سے حبشیوں سے بہت مختلف تھا۔ سریتا کا چہرہ بھی توری کی لڑکیوں سے الگ تھا۔ وہ حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن میرا حلیہ اتنا مقامی اور انداز اتنا وحشی تھا کہ وہ میرے اور سریتا کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے تھے۔ میرے نام کی ساخت بھی ان کے لیے چونکا دینے والی بات تھی۔ ہم سب بے لباس تھے، ہمارے جسم رنگے ہوئے تھے اور گلے میں متعدد قسم کے کڑے کنٹھے اور کھوپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ قیدیوں میں سات مرد اور چار عورتیں تھیں۔ مردوں میں دونو جوان کے سوا سب ادھیڑ عمر کے تھے۔ عورتوں میں تین نو جوان لڑکیاں تھیں اور ایک کوئی تیس سالہ صحت مند بدن اور دلکش خدو خال کی عورت تھی۔ میں ان کی وحشت زدہ چہروں سے جھانکتی ہوئی قوتیں کس حد تک جان سکتا تھا۔ یونانی، ایتھنی، مصری، امریکی اور ایرانی تینوں نو جوان لڑکیاں نہایت حسین تھیں۔ ایرانی اور امریکی..... نقش و نگار کی لڑکیاں، ان میں سب سے زیادہ حسین تھیں۔ میرے بارے میں زارے کا تعارف سن کر وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔

ان میں کوئی شخص تاریک برا عظیم کی زبان سے واقف معلوم نہیں ہوتا تھا، وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ میرے خدو خال کے بارے میں ان کی رائے دلچسپ اور متضاد تھی۔ میں خاموشی سے ان کی گفتگو سننے لگا۔ ”یہ وحشی سردار تو اس سرزمین کا شخص نہیں لگتا۔“ ان میں سے ایک نے سرگوشی کی۔

”نہیں تمہارا خیال غلط ہے۔“ دوسرے نے رائے دی ”مہذب دنیا کا کوئی آدمی ایسا حلیہ اختیار نہیں کر سکتا۔“

”یہ تو بالکل وحشی ہے۔ حبشیوں کی کسی اعلان سے اس کا تعلق ہے۔ مگر اس کا نام؟“

”اور یہ لڑکی؟“ انہوں نے تنکھویوں سے سریتا کی طرف دیکھا۔

”یہ لڑکی؟“ ادھیڑ عمر کا ایتھنی کچھ سوچ کر بولا۔ ”اس کے نقش آریں ہیں مگر یہ تو برہنہ ہے۔ بہر حال بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔“

”ہمیں آزاد نہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ ان کے تیور اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ ممکن ہے یہ ہماری زبان سے واقف ہوں۔“

”پاگل، یہ کس طرح ممکن ہے؟ کیا تمہارے خیال میں یہ شخص کیمرج اور آکسفورڈ میں گیا ہوگا؟“

”خدا ہم پر رحم کرے۔ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں؟ پتہ نہیں یہ ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کریں؟“

”مجھے تو یہ زمین پر اسرار معلوم ہوتی ہے۔“ ایرانی لڑکی نے کہا۔ ”اور ہو سکتا ہے یہ لوگ مردم خور ہوں۔“

”ہش۔ ہمیں بہتر حالات کی توقع کرنی چاہیے۔ انہوں نے ہمارے چار ساتھی مار دیے ہیں۔ ہماری ذرا سی نفرت سے کچھ اور ساتھی بھی ہم سے جدا ہو سکتے ہیں۔“

”کاش ہم ان کی زبان جانتے۔“

”کاش وہ ہماری زبان جانتے۔“

”ہمیں ان سے رحم کی بھیک مانگنی چاہیے۔“

میں ان کی سرگوشیاں پورے انہماک اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔ میں نے زارمے کو مزید گفتگو کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ان کے خوف اور اندیشوں سے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا اور مجھے اپنے فیصلے میں ہچکچاہٹ ہونے لگی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ میں نے زارمے کو اشارہ کیا اور اس نے امریکی لڑکی کی لال قمیض بھاڑ دی پھر وہ اس کے سینہ پوش کی طرف بڑھا۔ امریکی لڑکی چیختی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ ”خدا ہم پر رحم کرے۔ ہم درندوں میں گھر گئے ہیں۔ آہ شاید میں اپنی بیمار ماں کو اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔“

”میرے بچے میرا انتظار کرتے رہیں گے۔“ اپنی نے کہا۔

”انہوں نے کبھی تمہیں کی روشنی نہیں دیکھی۔ وہ گھور کر ہمارے لباس دیکھ رہے ہیں۔ ان کی نظروں میں خون ہے۔“

”کیا تمہارا کوئی شخص مقدس زبان سے واقف ہے؟“ زارمے نے گرج دار آواز میں کہا۔ میں نے محسوس کیا اس کی نظریں سفید فام لڑکیوں کے بدن ٹٹول رہی ہیں۔

انہوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ایک تو مندو نو جوان آگے بڑھ کر آیا اور اس نے مودبانہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ایک ایک کر کہا۔ ”ہم بد نصیب لوگ تمہاری زبان نہیں جانتے۔“

”تم کہاں سے آئے ہو؟“ زارمے نے درستی سے پوچھا۔

”ہم ڈربن جا رہے تھے کہ ہمارا جہاز ڈوب گیا۔ ایک کشتی میں جان بچا کر ہم یہاں پہنچے ہیں۔ ہم بالکل بے ضرر لوگ ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔“ نو جوان نے آدھی انگریزی، آدھی مقامی زبان میں بہ مشکل یہ جملے ادا کیے۔

”جزیرہ توری مقدس اقبال کی قلم رو میں شامل ہے اور اقبال جا را کا کا کی مقدس روح کی نمائندہ ہے اور جزیرے کا سردار جابر بن یوسف ہے۔ جزیرہ توری کی روایت کے مطابق یہاں اجنبی منحوس مردود سمجھے جاتے ہیں۔ تمہارے سر جا را کا کا کی کھوپڑی کی نذر کر دیے جائیں گے اور تمہاری عورتیں ہمارے سردار کی خدمت کریں گی۔“ میں نے زارمے سے کہا۔ اس نے میرا حکم دہرایا اسی لمحے سرتانے میرا بازو کھینچ کر مجھے مشتعل نظروں سے گھور کر دیکھا۔

نو جوان نے انگریزی میں زارمے کا مطلب جس حد تک وہ سمجھ پایا تھا دوسروں کو سمجھایا۔ ان کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔ ”ہم یہاں آنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ یقیناً کوئی جہاز ادھر سے گزرے گا۔ ہماری کشتی خود بخود ادھر لگ گئی تھی۔“ نو جوان نے فریاد کے انداز میں کہا اور آہ زاری کرنے لگا۔ دوسرے قیدی بھی رقت میں اس کے شریک ہو گئے۔ زارمے نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش کیا۔

”ان کا سامان چھین لو اور ان کے کپڑے اتار دو۔“ میں نے حکم دیا۔ زارمے نے سب سے پہلے امریکی لڑکی کے سینہ پوش پر ہاتھ ڈال دیا

اور اسے کھینچ کر توڑ دیا۔ امریکی لڑکی زمین پر گردن جھکا کر بیٹھ گئی اور بین کرنے لگی۔ زارے سینہ پوش کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے سریتا کی طرف پھینک دیا۔ اس نے غصے سے سینہ پوش امریکی لڑکی کو واپس کر دیا۔

”سیدی جابر! کیا تم اتنی دور جا چکے ہو؟“ وہ مقامی زبان میں بولی۔ زارے نے اب ایک مرد کی قمیض پھاڑ دی اور اس کی پتلون کے تمام بیٹن توڑ دیے۔

”نہیں نہیں۔“ سریتا چیخنے لگی۔ ”ٹھہر زارے! ٹھہرو۔“ زارے میری وجہ سے سریتا کا احترام کرتا تھا اس لیے ٹھہر گیا۔

”یہ سردار بڑا ظالم اور وحشی ہے اس سے ہمدردی کی امید کرنا بے کار ہے۔“ امریکی لڑکی روتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ ”رحم اے معزز درندے رحم!“

میں نے اسے دھکا دے دیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی زمین پر دوڑتک چلی گئی۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ سریتا نے پھر زور سے میرا ہاتھ دبایا میرے اس وحشیانہ اقدام سے تمام اجنبی قیدی فریاد کرنے لگے۔ سریتا بھی ان میں شامل تھی۔

میں ایک مجسمے کے مانند بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ”تم نے اگر کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو اتنے شقی القلب نہ بنو۔“ سریتا نے نفرت سے کہا۔

”یہ لڑکی بڑی نیک اور رحم دل ہے۔ شاید وہ ہماری سفارش کر رہی ہے۔“ خوف زدہ عورت نے کہا۔ ”اور یہ شیطان اس سے متاثر بھی معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں لڑکی کے توسط سے دوبارہ رحم کی درخواست کرنی چاہیے۔“ تھوڑی دیر میں آہ زاری اور فریاد و فغاں کا ناقابل اختتام سلسلہ شروع ہو گیا۔ امریکی لڑکی کا بدن جاذب نظر تھا۔ میں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا اور اس کی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی اتار لی۔

”لے لو یہ تمہاری ہے۔“ وہ مسرت سے چلائی۔ ”مگر ہماری جان بخش دو۔“ اس کے ساتھ ہی ساتھ اٹھ مردانہ اور نسوانی گھڑیاں میرے قدموں میں ڈال دی گئیں جو سمندر کی طوفانی لہروں سے محفوظ رہ گئی تھیں۔ میں نے ایک مدت بعد گھڑی دیکھی تھی۔ زارے اور فرارو یہ عجوبہ دیکھ کر کھل کھلانے لگے اور ان کی توجہ تھوڑی دیر کے لیے اجنبیوں کی طرف سے ہٹ گئی۔

”معزز سردار یہ کیا ہے؟“ زارے نے اشتیاق سے کہا۔

”یہ تماشا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وقت کا تماشا۔“

”وقت؟“ زارے حیرت سے بولا۔ ”کیا یہ کوئی سحر کا رشتہ ہے؟ یہ بہت خوبصورت ہے۔“

”ہاں زارے یہ مہذب دنیا کا سحر ہے۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔ ”یہ جزیہ توری اور یہاں کے مکینوں اور یہاں کی عظیم الشان ملکہ سے زیادہ خوب صورت نہیں ہے۔“ میں نے گھڑی کی ساخت پر نظریں جمادیں۔ ”یہ ایک احساس ہے۔ صبح و شام کا احساس۔“ زارے نے اثبات میں گردن ہلائی۔ نوجوان بھی کچھ کچھ سمجھ رہا تھا، وہ اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ”بلاشبہ یہ شخص ان میں سب سے مختلف ہے۔ اس میں سنجیدگی، متانت اور فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ ساتھیو! یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ ہمیں صرف اس کے سامنے گڑگڑانا اور زندگی کی درخواست کرنا چاہیے۔“

”یہ بہت ظالم اور کمینہ شخص ہے۔ دیکھو اس کے چہرے پر کتنا بڑا زخم ہے۔ مگر اسے کوئی پروا نہیں۔“ ایرانی لڑکی نے کہا۔ میں نے سوچا وہ

یہ باتیں کس جوان رعنا کس طاقت ور شخص کے سامنے کہہ رہی ہے۔ کیا میں اتنا بد ہیئت ہو گیا ہوں؟ کیا میری جلد اتنی کھردری اور خدوخال اتنے سخت ہو گئے ہیں؟ مگر یہ سب رنگ کا کرشمہ ہے جو میرے جسم اور چہرے پر لپا ہوا ہے۔

”ان سے کہہ دو۔ تمہاری عورتیں ہمارے جسم کی راحت کے لیے ہیں۔ اور تمہارے مرد دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے قربان کر دیے جائیں گے۔ ان مردوں کا فیصلہ جزیرہ توری میں برپا ہونے والے ایک بڑے جشن میں کیا جائے گا اور انہیں بتا دو کہ اجنبیوں کے لیے یہ زمین تنگ ہے کیونکہ وہ نحوست اور برباری کی علامت ہیں۔ ان سے کہو کہ تاریک براعظم میں طاقت اور علم کو عظمت حاصل ہے چنانچہ فرار کی کوشش محض بے سود ہوگی۔“ زارے نے میرے احکام حرف بحرف دہرا دیے۔

پھر میں وہاں سے چلنے لگا۔ انہوں نے میری ٹانگیں پکڑ لیں اور رونے لڑنے لگے۔ میرے خصوصی محافظوں نے انہیں درندگی اور سفاکی کے ساتھ میرے جسم سے علیحدہ کیا اور روتی بین کرتی ہوئی عورتوں کو دھکے دے دے کے آگے بڑھانے لگے۔ میں نے اپنے مکان کے قریب ایک علیحدہ جھوپڑی میں عورتوں کے قیام کے انتظام کا حکم دیا اور ان کی آرائش اور حفاظت کے لیے توری کی خامدانیں تعینات کر دی گئیں۔ سریتا میرے رویے سے اتنی سخت ناراض تھی کہ مکان آ کر اس نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔

میرے ہاتھ میں کئی گھڑیاں تھیں صبح کے گیارہ بجے تھے۔ کیسا عجیب احساس تھا، میرے سامنے وقت گردش کر رہا تھا۔ گھڑیوں نے مجھے اپنی دنیا کے بہت سے مناظر یاد دلادیے وہ بڑی گھڑیاں جو بارونق اور جدید ترین شہروں کے چوکوں میں نصب تھیں۔ وہ سڑکیں، موٹریں، بھینز، دکانیں ریسٹوراں، کلب، بھاگتی ہوئی زندگی، مسکراتی ہوئی زندگی، گھڑی کی سوئی چل رہی تھی۔ ٹک ٹک اور میرے دل پر تھوڑے لگ رہے تھے۔ کبھی کبھی آدمی اپنے متعلق بھی اذیت ناک فیصلے کر لیتا ہے۔ آدمی اذیت پسند بھی تو ہوتا ہے۔ اجنبی لوگوں کے بارے میں اگر میں کوئی شدید رویہ اختیار نہ کرتا تو تاریک براعظم کے ناویدہ دیوتا یہ فیصلہ کر دیتے، جارا کا کا کی مقدس روح کر دیتی اور حبشیوں کے تیز نیزے کر دیتے، میں نے کیا کیا تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ تاریک براعظم کیا ہے؟ میں نے اس کا مزہ چکھا تھا اور میں ہی جانتا تھا کہ اس سرزمین کی کتنی آنکھیں ہیں؟ کیسے دانت ہیں؟ کیا مجھے ان کی جاں بخشی کر کے خود بھی ان کے ساتھ موت کا جام پی لینا چاہیے تھا؟ ایسی صورت میں یہ چار پانچ آدمی بھی ختم ہو جاتے جن کی زندگی مجھ سے وابستہ تھی اور تاریک براعظم کے شب و روز میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا۔ میں سرد ہو جاتا تو کسی تبدیلی، کسی سرگرمی کے سارے سوراخ بند ہو جاتے۔ میں کوئی دلیل نہیں دے رہا ہوں۔ میں کوئی جواز تلاش نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے اس موضوع پر بہت سوچا تھا اور میں وہ تلخ حقائق بیان کر رہا ہوں جن سے مجھے محسوس کرنے والے بھی کبھی دوچار ہو سکتے ہیں۔

اس دن بارہ بجے آہ، وقت پہ میری نگاہ تھی۔ وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ بارہ بجے میں نے اعلان کیا کہ دو روز بعد جزیرہ توری میں جارا کا کا کی مشترکہ عبادت کے جشن میں اجنبی لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جائے گا۔“

وقت گزر رہا تھا۔ میرے سامنے گزر رہا تھا۔ ٹک ٹک ٹک۔ یکساں رفتار سے۔ میں نے دیکھا سوئی نے ایک چکر کاٹ لیا ہے۔ پھر دوسرا چکر، تیسرا چکر۔ میں نے مشروب حیات نوش نہیں کیا تھا جو میں وقت کا یہ انتباہ پاؤں سے کچل دیتا۔ میں نے نظر ثانی کی اور سوراخ کی اقامت گاہ کی

طرف روانہ ہوا۔ میں اس کی خدمت میں یہ گھڑی پیش کرنا چاہتا تھا۔ جب میں اس کی عبادت گاہ میں داخل ہوا تو وہ میری جانب لپکا میں نے اسے اپنی آوازیں محصور کرنے کے لیے اشارہ کیا۔ سمورال نے بھڑکتی ہوئی آگ میں سیال مادہ جھونک دیا اور جب دھواں ہمارے چاروں طرف پھیل گیا تو میں نے اس کی خدمت میں مہذب دنیا کا تحفہ پیش کیا۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا میں نے اسے وقت کا گورکھ دھندا سمجھایا۔ سمورال کے چہرے پر اضطراب طاری تھا وہ کچھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا، اس نے گھڑی ایک طرف رکھ دی۔ میں نے قصر اقبال میں پیش آنے والے واقعے سے اسے آگاہ کیا۔ وہ حیرت میں پڑ گیا اور اس نے میرے قریب آ کر میری آنکھیں اس طرح دیکھنی شروع کیں۔ جیسے ان میں کوئی کنکر پڑ گیا ہو۔ پھر وہ میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگا اور ایک طرف بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ ”جابر بن یوسف! وہ غنودگی کے عالم میں بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں تمہارا اتالیق ہوں اور تمہیں میری تربیت اور تعلیم کی اشد ضروری ہے۔“

”میں اس حقیقت سے واقف ہوں اور اپنے محسن کا دل سے احترام کرتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میری بات سنو۔ تمہارا اتالیق ہونے کی حیثیت سے میں تم سے وفاداری اور اطاعت شعاری کا عہد لینا چاہتا ہوں۔“

”میں کئی بار اس کا اظہار کر چکا ہوں کہ میں اس سرزمین میں تم سے کتنا قریب ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ تم مجھے جہاں کی جگہ سمجھو۔ تمہاری بیٹی ترام کی شادی مجھ سے ہوئی تھی۔ سب سے پہلے تمہی نے مجھے اس جزیرے پر پناہ دی تھی۔ کیا میرے گزشتہ عہد کی تجدید کی پھر ضرورت پڑیگی؟“

”میں جارا کا کا کی مقدس روح کو درمیان میں لانا چاہتا ہوں۔ کیا تم آمادہ ہو؟“ اس نے زور دے کر کہا۔

”کیا کاہن اعظم کو مجھ پر کوئی شبہ ہے؟“ میں نے ناراضگی سے کہا۔ ”اے مقدس کاہن! مجھے حکم دے کر دیکھو۔“

”میں ایک رمی عہد چاہتا ہوں۔“ کاہن نے گھمیر لہجے میں کہا۔

”تم جس طرح چاہو اپنا اطمینان کر لو لیکن کیا یہ کام اس وقت ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں تم شاید کچھ اور سنانا چاہتے ہو۔“

”ہاں۔ شاید کاہن اعظم کے علم میں ہو یا شاید اس نے گزشتہ دن عبادت میں گزار دیا ہو۔ میں تمہیں بتاؤں۔“ میں نے نکل دریافت ہونے والے غار کی پوری روداد سے سنا دی۔ وہ بیٹھا ہوا تھا ایک کھڑا ہو گیا۔ اور کوئی رد عمل ظاہر کیے بغیر اس نے کہا۔ ”کیا تم وہ غار مجھے دکھا سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔ میرا خیال ہے مقدس کاہن اسے دیکھ کر خوش ہوگا۔“

کاہن اعظم کا تجسس ناقابل فہم تھا۔ ہم دونوں اسی وقت گھنے جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی دھوپ تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بج رہے تھے۔ رات ہونے میں صرف چند گھنٹے باقی تھے۔ میرے ذہن میں اس وقت اجنبی لڑکیاں تھیں۔ میں انہیں قریب بٹھا کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایرانی اور امریکی لڑکیاں میرے حواس پر چھائی ہوئی تھیں۔ بہت دنوں بعد ایک رات آئی تھی جس کا مجھے انتظار تھا۔ غار کی تلاش میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کاہن کی تجسس نگاہیں دہانے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں نے مل کر دہانہ صاف کیا اور اندر داخل ہو گئے میں نے شپالی سامنے کر لی۔ کاہن اعظم دیر تک غار کے ایک ایک کمرے اور نوادار کا جائزہ لیتا رہا اور پھر جب اس نے بوڑھے شخص کی لاش دیکھی تو وہ جھک گیا۔ پھر کاہن اعظم کسی ایسے

کمرے میں گھس گیا جو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔ غار اچھی طرح دیکھ کر ہم پھر باہر آ گئے اور میں اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تر دو صاف نظر آ رہا تھا۔

”تم نے اسے کیسے مارا؟“ اس نے سوال کیا۔

میں نے پھر پورا واقعہ ہر ادیا۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔ ”کیا میں نے کوئی غلطی کی؟ مگر میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔“

”یہ اس بزرگزیدہ شخص نے کیا کیا۔ وہ صحرائے زارشی جانے کے لیے تڑپتا رہا تھا؟ اسے انتظار کرنا چاہیے تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“ میرے سوال پر کاہن اعظم سنبھل گیا۔

”کچھ نہیں۔ جابر بن یوسف! ضروری نہیں کہ ہر سوال کا جواب دیا جائے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

میں سمجھ گیا۔ وہ کھلی فضا میں گفتگو سے گریز کر رہا ہے۔ ”کیا تم مجھے ان نواہر کی تربیت دو گے؟ کیا یہ چیزیں اب میری ملکیت ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے مختصر ا کہا اور جنگل کے کنارے مجھ سے جدا ہونے لگا۔ میں نے چلتے چلتے اس سے اجنبی لوگوں کے مستقبل کے بارے میں رائے پوچھی تو اس نے بھی وہی کہا جو اقبال نے کہا تھا۔ کاہن اعظم غار کے ملاحظے کے بعد کچھ حواس باختہ سا نظر آ رہا تھا اور مجھے اس کے حواس باختگی پر لطف آ رہا تھا۔

جنگل میں اسے چھوڑ کر میں اپنے ہندی دوست سرنگا کے پاس گیا۔ سرنگا میری آمد کا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے دہانے پر دیوی کا پہرا لگوا دیا اور مجھ سے کہا۔ ”تم چند خبریں لے کر آئے ہو مگر میں مختصر کلامی پسند کروں گا۔“ میں ایک طویل گفتگو کے لیے اس کے پاس آیا تھا لیکن سرنگا نے مجھے بحث و مباحثہ سے منع کیا۔ میں نے مختصر ا اسے قصر اقبال کی روداد سنائی۔ اس نے بھی سرزنش کی اور مشورہ دیا کہ مجھے توری کی وہ جڑی بوٹیاں استعمال کرنی چاہئیں جن سے جذبات کی آتش فشاں سرد کی جاسکتی ہے۔ اس نے ایک سردار۔ ایک مقتدر شخص کے اوصاف پیدا کرنے پر زور دیا اور کہا کہ مجھے اپنا اعتماد بحال کرنے کے لیے غیر معمولی قربانیاں پیش کرنی چاہئیں۔ میں نے اسے جزیرہ توری میں آنے والے لوگوں کے بارے میں رائے طلب کی تو وہ افسردگی اور اضمحلال سے بولا۔ ”جابر بن یوسف! تمہیں معلوم ہے میں نے ڈاکٹر جواد کی جاں بخشی کی منت کی تھی مگر تم نے جو سوچ رکھا ہے وہی ایک صحیح اور راست اقدام ہے۔“ اس نے ایک جھرجھری لی۔ ”میں ضرور اس خونیں تماشے میں شریک ہوں گا۔“

پھر میں نے غار کی دریافت کا واقعہ اس کے گوش گزار کیا۔ سوراہ کی طرح سرنگا نے بھی اس واقعے میں گہری دل چسپی لی اور اس نے مجھ اسی وقت اس غار میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں بہت تھکا ہوا تھا میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ایک گھڑی میں نے سرنگا کو دے دی۔ اس نے اسے ایک طرف ڈال دیا اور کہنے لگا۔ ”سیدی جابر! تم پر ایک بہت بڑی ذمہ داری آپڑی ہے۔ متمدن دنیا کے لوگوں سے نمٹ کر تمہیں اس غار کی طرف توجہ دینی ہے۔ تمہیں شاید اس کا اندازہ نہیں ہے کہ تم نے کتنی بڑی مہم سرانجام دی ہے۔ آہ اگر وہ بوڑھا رچھ اتنی کڑی ریاضت کے بعد ایک غلطی نہ کر بیٹھتا تو مجھے تمہاری صورت دوبارہ دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ کون جانے پھر کیا ہوتا۔“

”اس نے کیا غلطی کی؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”وہ تمہارے نواز، خصوصاً شاپالی دیکھ کر اپنا منصب بھول گیا ہوگا۔ اس نے حرص کی اور اپنے آپ کو کھود دیا۔“

سرنگا نے اپنی دیوی کو اشارہ کیا، غار کا دہانہ خالی ہو گیا۔ سرنگا حسب معمول اقبالہ کی تعریف و توصیف میں مصروف ہو گیا۔ میں بھی اقبالہ کے حسن و جمال اور اس کی نوازشوں کا ذکر کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا۔ توری کی آبادی میں داخل ہوتے ہی مجھے فزار و زار سے نے گھیر لیا۔ رات شروع ہو چکی تھی۔ رات کا ہنگامہ گرم ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے مکان جانے کے بجائے اس جھونپڑی کا رخ کیا۔ جہاں میرے حکم کے مطابق جزیرہ توری پر آنے والی لڑکیاں قید کی گئی تھیں۔ پہرے دار نے مجھے راستہ دیا اور میں اس کے ہاتھ سے مشعل لے کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ جھونپڑی عام جھونپڑیوں سے بڑی تھی۔ اس میں پہلے سے مشعلیں روشن تھیں۔ اندر میں نے ایک ہوش ربا نظارہ دیکھا۔ توری کی عورتیں ایک طرف ہٹ گئیں۔

ایرانی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے اس سے میں نے مقامی زبان میں نرمی سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے جان بوجھ کر ایسا لہجہ اختیار کیا کہ وہ نام پوچھنے کا مطلب سمجھ لے۔ اس نے کچھ سمجھنے نہ سمجھنے کے انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ میں نے سوال دہرایا۔ امریکی لڑکی نے کہا۔ ”شاید وہ نام پوچھ رہا ہے۔ اس وحشی کی سمجھ میں تمہارا نام آجائے گا؟“ اس نے طنز کیا۔ ”بتا دو میری مظلوم لڑکی بتا دو۔ ممکن ہے وہ یہی پوچھ رہا ہو۔“

”فروزیں۔“ ایرانی لڑکی نے سہم کر کہا۔

میں نے باری باری سب کی طرف اشارہ کیا۔

ایک عورت نے اپنا نام جولیا اس کے برابر بیٹھی ہوئی جرمن (غالبا) لڑکی نے اپنا نام مارشا بتایا۔

میں نے امریکی کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ ”جینا۔“ وہ نرمی سے بولی۔ فروزیں، جولیا، مارشا، جینا، میں نے دانستہ تلفظ بگاڑ دیا۔ ”اس نے نام کتنی جلدی یاد کر لیے۔“ جولیا نے کہا۔

میں نے توری کی لڑکیوں سے کہا کہ وہ ان کے لیے اعلیٰ غذاؤں کا اہتمام کریں۔ انہوں نے شکایت کی کہ ان لڑکیوں نے کپڑے اتارنے اور اپنے جسم کی مالش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ ان کے سامنے بھنا ہوا گوشت پیش کر دیا گیا۔ انہوں نے میری طرف تشکر اور حیرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ پہلی مرتبہ ممنونیت کے آنسو ان کے چہروں پر قفس کرنے لگے۔ میں ان کے حسن کا تذکرہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں، صبح کی ان لڑکیوں اور اس وقت کی لڑکیوں میں نمایاں فرق ہو گیا تھا۔ ان کے بدن چمک رہے تھے۔ ان کی جلد صاف تھی اور خدو خال بچیدار دکھائی دیتے تھے۔ میں فروزیں کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ ان کی سبھی ہوئی نگاہوں نے میرے اندر کے سوتے ہوئے آدمی کو متاثر کر دیا تھا۔ میں اس وقت وہاں سے چلا آیا اور میں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر قفس و سرود میں آدھی رات گزار دی۔ میں سرتیلا کے سونے کا انتظار کر رہا تھا۔

علی الصباح جب سرتیلا سو رہی تھی۔ میں اپنے مکان سے جنگل کی صبح کا نظارہ کرنے کے لیے چل پڑا۔ اصل میں میرا مقصد یہ تھا کہ سرتیلا

میرے سامنے اس وقت تک نہ آئے جب تک اجنبیوں کے سلسلے میں ہونے والا جشن ختم نہ ہو جائے..... توری قبیلہ سویا پڑا تھا..... میں آگے نکل گیا لیکن اس صبح مجھے جنگل کے پرندوں، درندوں کے ساتھ وقت گزاری کا دلچسپ مشغلہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ اس لیے کہ زارمے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مجھے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور اس نے یہ دلچسپ خبر سنائی کہ تھوڑی دیر پہلے گویا صبح کا ذب کے وقت اجنبیوں نے اپنے پہرے داروں پر حملہ کر دیا اور دو کو موقع پر ختم کر کے جنگل میں گم ہو گئے۔ ان میں پانچ آدمی دوبارہ گرفتار کر لیے گئے ہیں، باقی دو گھنے جنگل میں کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔ زارمے اپنے سردار کے سامنے بہت خفیف تھا۔ یہ خبر سن کر میرا قبیلہ نکل گیا۔ ”فرار.....“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”فرار.....“ تاریک براعظم کی سرزمین سے؟“

”ہاں معزز سردار، لیکن ہم انھیں جلد پکڑ لیں گے۔“

”نہیں وہ خود تمہارے پاس آجائیں گے اور اگر وہ کل تک نہ آئے تو ایک اور جشن برپا ہوگا۔ زارمے! تم اطمینان سے اپنے قبیلے میں جاؤ اور کل منعقد ہونے والے جشن کی تیاری کرو۔ یہ جشن قربانی اتنے ترک و احتشام سے منایا جائے کہ جارا کا کا کی مقدس روح نہال ہو جائے۔“

زارمے کے ساتھ میں بھی آبادی میں واپس آ گیا اور زارمے کی زمین کی طرف چل پڑا جو کبھی شوالا کے زیر نگین تھی۔ میں دن بھر وہاں رہا اور دن بھر زارمے کی عورتیں اور جوانان رعنا میری خدمت میں مستعد رہے۔ میں نے سمورال کو کل کے جشن میں شریک ہونے کے لیے ایک پیغام بھیجا۔ رات کو میں فراز کی زمین پر چلا آیا جہاں میرا مکان تھا۔ اجنبی اسیر ابھی تک مفرور تھے۔ میری حالت عجیب تھی..... میں خود فرار ہو رہا تھا..... ادھر ادھر، خالی خالی..... میں اپنے اندر مفرور تھا۔ مجھے کل کا انتظار تھا۔

☆=====☆=====☆

تساؤ کے آدم خور

تساؤ کے آدم خور..... شکاریات کے موضوع پر ایک مستند کتاب اور حقائق پر مبنی سچا واقعہ..... یوگنڈا (کینیا) کے دو خونخوار شیر جو آدم خور بن گئے تھے..... ایک سال کی قلیل مدت میں 140 انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے **تساؤ کے آدم خور**..... جنہوں نے یوگنڈا میں پچھنے والی ریلوے لائن کا کام کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ جو لومڑی سے زیادہ مکار تھے اور چھلاوہ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ اس سچے واقعے پر انگلش فلم **Ghost & The Darkness** بھی بنائی گئی۔ جون ہنری پیٹر سن (فوجی اور ریلوے لائن کام کا انچارج) کی کتاب **(The Man-Eaters of Tsavo)** کا اردو ترجمہ **کتاب گھر پر شکاریات سیکشن** میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اور کل آگئی۔ توری کے وسیع میدان میں ہنگامہ برپا تھا دونوں قبیلوں کی عورتیں اور مرد یک جاتے اور ان اسیروں کو دیکھ دیکھ کر شور مچا رہے تھے جو میدان کے درمیان درختوں کے تنوں سے بندھے بے بس کھڑے تھے۔ میری نشست کے لیے ایک اونچے پتھر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ توری کے دوسرے معززین نے آج اپنے جسم نئے انداز سے رنگے تھے۔ قربانی کی رسموں میں حصہ لینے والے جوانوں کی ٹولی بڑی چاق و چوبند نظر آرہی تھی۔ ان کے سیاہ جسم دھوپ میں چمک رہے تھے۔ انہوں نے اپنے نیزے بلند کر رکھے تھے اور دائرے کی صورت میں ناچ رہے تھے۔ میں مقررہ وقت پر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ سرنگ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ پھر کاہن اعظم سمورال کی آمد کا غلغلہ ہوا اور نجوم مودب کھڑا ہو گیا۔ سمورال نے بھی ایک اونچی نشست پر جگہ سنبھال لی۔ فزار اور زارے میرے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ سمورال کے بیٹھے ہی نقاروں کا زور بڑھ گیا۔ نگ دھڑنگ وحشی دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے گارہے تھے اور اپنی زمینوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ وہ میری بلند اقبالی اور سرفرازی کے لیے بار بار میرا نام لیتے تھے اور مجھے توری کے قوانین کی پیروی کے لیے تلقین کر رہے تھے۔

اور میرے سامنے وہ اسیر تھے جن کا جرم یہ تھا کہ وہ موت سے جدوجہد کرتے ہوئے سمندر کی آدم خور لہریں پھاڑ کر ادھر توری کی پر اسرار زمین پر زندگی کی تلاش میں آنکلتے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میں توری کا سردار تھا۔ میں ایک سردار تھا چنانچہ مجھے توری کی روایتوں کے مطابق ان کا خون دیوتاؤں کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ ہماری بات دوسری تھی۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو ہمارے بیشتر رفقا مارے گئے تھے۔ مردوں میں صرف ڈاکٹر جواد، میں اور سرنگ بچے تھے۔ سرنگ اپنے علم و فضل اور دیوی کی مدد سے میں اپنی شجاعت و ذہانت کے بل پر اور ڈاکٹر جواد نے طبیب ہونے کے باعث امان پائی تھی۔ اتنی مدت گزرنے کے بعد امان بھی نہیں تھی۔ میں نے صدق دل سے اس سرزمین میں سحر و اسرار سے مفاہمت کر لی تھی کیونکہ میں نے اسے دیکھ لیا تھا جس کے نظیر مہذب دنیا پیش نہیں کر سکتی۔

وحشیوں کے درمیان درختوں کے تنے سے بھینڑوں بکریوں کی طرح بندھے ہوئے یہ لوگ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتے وقت بڑے دل گیر اور اداس نظر آتے تھے۔ ان کی جلدیں چند دنوں کے اندر ہی اپنی چمک کھو چکی تھیں۔ سرتیا کی نظریں انھی پر جمی ہوئی تھیں۔ ہاں سمورال اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ سرتیا میری نشست سے کچھ فاصلے پر موجود تھی۔ میں نے دانستہ اس کی طرف نظر نہیں اٹھائی۔ سب سے پہلے میرے حکم پر قیدی لباس سے آزاد کیے گئے۔ مردوں نے کسی چون و چرا کے بغیر اپنے جسم پر ہنہ کر لیے۔ مخصوص دستے کے افراد نے انہیں اپنے نیزوں کے حلقے میں لے رکھا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر بلند آواز میں انھیں جرائم سے آگاہ کیا، پھر انھیں اپنے منتخب آدمیوں سے مقابلے کی دعوت دی لیکن وہ بری طرح خائف تھے۔ ان کے چہرے زرد تھے۔ وہ مقابلے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہاں ان میں کوئی جابر بن یوسف ہوتا تو ایسی موت ہرگز نہ مرتا۔ وہ بار بار رحم کے لیے ہاتھ اٹھاتے تھے لیکن ان میں سے ایک نوجوان ایسا بھی تھا جس نے اب تک بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو مقامی زبان میں کسی قدر رشدد بد رکھتا تھا۔ اس کے قوی مضبوط تھے، وجاہت اور صحت کے اعتبار سے بھی وہ دوسرے اسیروں سے برتر تھا۔ میں نے سمورال کی طرف دیکھا اور اچانک کھڑے ہو کر فزار کو حکم دیا کہ مردوں کے جسموں میں نیزوں سے سوراخ کر کے ان کا خون اکٹھا کیا جائے، پھر جارا کا کا کی مقدس کھوپڑیوں کو ان کے خون سے غسل دینے کی مقدس رسم ادا کی جائے۔

میرے حکم کی دیر تھی۔

قربانی کی رسم میں حصہ لینے والے لوگوں کی ٹولی پہلے ہی پوری طرح چاق و چوبند تھی ان کے سیاہ برہنہ جسم دھوپ میں چمک رہے تھے۔ نیزوں کی انیاں جھلملا رہی تھیں۔ وہ دائرے کی صورت میں ڈھول اور تاشوں کی تھاپ پر وحشیانہ رقص کرتے ہوئے مقدس قربانی کے مخصوص جملے ایک ساتھ ادا کر رہے تھے۔ جارا کا کام کی کھوپڑی ایک اونچے پتھر پر ایستادہ تھی جس کے نیچے ایک بڑا سا کڑھا جیسا برتن رکھا تھا۔ میں اونچی نشست پر ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ ان کی موت میرے ہاتھ کی جنبش کی منتظر تھی۔ میں نے ان پانچوں اسیروں کو دیکھا۔ مہذب دنیا کے یہ لوگ تصویر برت بنے کھڑے تھے۔ کاش میں ان کی نجات کا حکم دے سکتا مگر میں ایک با اختیار شخص ہونے کے باوجود بہت بے اختیار آدمی تھا۔

ان کی نجات میری ہلاکت تھی اور میری ہلاکت کے بعد بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ زندہ رہیں گے۔ انہیں مرنا ہی تھا کیونکہ وہ سحر و افسوس کی سر زمین پر آگئے تھے اور یہی اچھا بھی تھا کہ وہ مر جاتے۔ کیونکہ زندگی کے اس ہولناک تجربے سے گزرنے کے بعد ان کے پاس اسے بیان کرنے کا وقت بھی نہ رہتا۔ دراصل وہ اسی دن مر گئے تھے جب طوفانی موجوں نے ان کا جہاز اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا۔ اب تو ان کے جنازوں کی رسم ان کے سامنے ادا ہونی تھی۔ میں نے سمورال اور سرنگا کی طرف دیکھا پھر میری نظریں خود بخود آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور میں نے جابر بن یوسف کو مجبور کیا کہ وہ اپنا ہاتھ نیچے گرا دے۔ جابر بن یوسف نے مجبوراً ایسا ہی کیا اور میرے دل میں ایک لمحے کے لئے رحم کے جوفا سدخیالات آئے تھے میں نے ان سے کنارہ کشی کی اور اپنے برہنہ جسم اور اپنے گلے میں لٹکے ہوئے نوادری کی طرف نگاہ کی۔ میں جابر بن یوسف کے خول سے جزیہ توری کے سردار کی شکل میں جلد ہی واپس آ گیا میرے ہاتھ کی جنبش نے رقص میں اور زیادہ شدت پیدا کر دی اور توری کے مغلوب الغضب لوگوں کا دائرہ اجنبیوں کے گرد گنگ ہوتا گیا۔ اجنبی اسیروں نے لگے لگے قیدی، ایک نوجوان قیدی ابھی تک گنگ کھڑا تھا۔ اس نے کسی بزدلی اور کم ہمتی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ وہ حسرت اور حیرت سے مجھے دیکھے جارہا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ اب مجھ میں کھڑے ہونے کی تاب نہیں تھی میرے بیٹھے ہی لوگوں کی ایک ٹولی اپنے نیزے لہراتی ہوئی اسیروں پر ٹوٹ پڑی۔ انہیں گھسیٹ کر اس مقام پر لایا گیا جہاں جارا کا کام کی کھوپڑی اور ایک بڑا برتن رکھا ہوا تھا۔ ایک ادھیڑ عمری قیدی سب سے زیادہ شور مچا رہا تھا۔ سب سے پہلے اسے گھسیٹ کر برتن پر اس طرح اوندھا کر دیا گیا کہ اس کا سر برتن کے اندر ہو جائے۔ اس کے بعد جو شخص بھی رقص کرتا ہوا اس کے قریب سے گزرا، اس نے نیزے سے قیدی کا جسم چھیننا شروع کر دیا۔ چار اشخاص اسے پکڑے ہوئے تھے۔ زخمی شخص پچھاڑیں کھا رہا تھا لیکن اس کی ہر چیخ نیزے چھونے والے افراد کے غضب میں اور شدت پیدا کر دیتی۔ جب نیزوں سے اس کا جسم بالکل چھلنی ہو گیا تو نوجوانوں نے باری باری آگے بڑھ کر اس کی گردن پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ ہر وار پر قیدی کا جسم اس طرح تڑپ جاتا جیسے اسے بجلی کے جھٹکے دیئے جارہے ہوں پھر قیدی کی سانس ٹوٹنے سے پہلے اسے پیروں سے پکڑ کر برتن میں لوٹ دیا گیا تاکہ اس کا سارا خون برتن میں جمع ہو جائے۔ کچھ ہی دیر میں ادھیڑ عمر کے قیدی کا جسم خون سے خالی ہو گیا اور اسے زندگی سے بھی نجات مل گئی۔ پھر اس کا جسم میدان میں پھینک دیا گیا۔ برتن میں نہایت احترام سے جارا کا کام کی کھوپڑی ڈال دی گئی اور خون میں نہلانے کے بعد دوبارہ اونچے پتھر پر رکھ دی گئی۔

زارے اور فزار و تیزی سے ہجوم چیر کر برتن کے قریب پہنچے اور انہوں نے اپنے ہاتھ برتن میں ڈال کر چلوؤں سے خون چکھا اور پھر زمین

پر لوٹنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد میری اور سمورال اور سرنگا کی خدمت میں خون کا جام پیش کیا گیا۔ میں نے سرنگا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ سرنگا کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر ہجوان برپا تھا لیکن اس نے نہایت سکون کے ساتھ اپنا ہاتھ بلند کر کے جام اٹھایا اور آنکھیں بند کئے کیسے اسے ہونٹوں تک لے گیا۔ میں نے اور سمورال نے کسی جھجک کے بغیر ادھیڑ عمر مہذب اٹھنی کے تازہ خون کا جام نوش کیا پھر اس متبرک خون سے سارے ہجوم کو فیض یاب ہونے کا اشارہ کیا قبیلے کے تمام افراد ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ ہر شخص خون کا ایک قطرہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ برتن ہجوم کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ عورتیں اور مرد چیخ پکار کے ساتھ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں تھے۔ لوگ اس قدر زیادہ تھے کہ انہیں ایک ایک قطرہ نصیب ہونا بھی مشکل تھا، بہت سے لوگ برتن تک نہیں پہنچ سکے اور مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گئے کیونکہ برتن اب خشک ہو چکا تھا۔

جارا کا کا کی اس متبرک قربانی کے وقت خون کے قطرے تقسیم نہیں کیے جاتے تھے۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا جو بازی لے جاتا، وہ خون کے زائد قطرے حاصل کر لیتا، جس نے اپنا دہن اس مقدس سیال سے ترک کیا، اس نے جارا کا کا کی روح سے قربت حاصل کر لی۔ خون کے بڑے برتن کے گرد ابھی تک چھینا جھٹی ہو رہی تھی حالانکہ اس میں ایک قطرہ خون باقی نہیں رہا تھا۔ جو آگے تھے وہ جھک کر اپنی زبانوں سے چاٹ رہے تھے۔

پھر دوسرا قیدی لایا گیا، وہ یہ منظر دیکھ کر پہلے ہی نیم جاں ہو چکا تھا، اس کی آنکھیں دہشت سے باہر نکل آئی تھیں اور چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ اس کے سارے جسم پر لرزہ طاری تھا، وحشی مقامی نوجوان جو اولین قیدی کے خون سے مست ہو گئے تھے وہ اب اور زیادہ سرشوری کا اظہار کر رہے تھے۔ دوسرے قیدی کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے کا ہوا تھا۔ اس کے گرم خون میں بھی جارا کا کا کی کھوپڑی کو غسل دیا گیا۔ اور میری اور سمورال اور سرنگا کی خدمت میں اس کا لبالب جام پیش کیا گیا۔ پھر وہی طوفان اٹھا اور چشم زدن میں خون کا برتن پھر خالی ہو گیا۔ تیسرا شخص، چوتھا شخص، یکے بعد دیگرے چاروں اشخاص کے جسموں سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا گیا، ہر بار قبیلے کے لوگ برتن خالی ہو جانے کے بعد جارا کا کا کی روحانی عظمتوں کے متعلق توری کی زبان کے بہترین لفظ ادا کرتے، یہ شاعری نہیں تھی مگر لفظوں کا ایسا مرکب تھا جس میں آہنگ تھا، ترنم تھا اور گرج، چمک تھی۔ ساری شعری خوبیاں موجود تھیں، یہ دن توری میں جارا کا کا کی عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت کا دن تھا کیونکہ دیوتا نے خود اپنے لیے قربانی کا سامان فراہم کیا تھا۔ میری نظریں اس آخری قیدی پر مرکوز تھیں جو نہ کپیار ہا تھا، نہ فریاد کر رہا تھا۔ نوجوانوں کا گروہ وحشت ناک انداز میں رقص کرتا ہوا اس کی جانب بڑھا لیکن اس سے قبل کہ وہ اسے گھینٹے ہوئے مقتل تک لاتے وہ از خود دم بڑھاتا ہوا گڑھے کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ اس کی یہ جسارت میری نظریں چکا چونہ کر گئی۔ اس کی آنکھوں سے خوف و دہشت کے بجائے خون جھلک رہا تھا۔ اس کی دلیری دیکھ کر نوجوانوں کے گروہ کا رقص اور تیز ہو گیا۔ مقتل میری نگاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کا سینہ ابھرا ہوا تھا اور بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ رہی تھیں۔ وہ قد و جسامت اور رنگ کے اعتبار سے ایک دلکش اور قابل رشک صحت کا نوجوان تھا۔ اسے قتل کرنے سے پہلے پھر جارا کا کا کی عبادت کی رسمیں ادا کی گئیں لیکن وہ اپنی جگہ ثابت قدم کھڑا رہا۔ میں نے سمورال کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اندرونی جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا، سرنگا پہلو بدل رہا تھا اور اس آخری قیدی کو والہانہ انداز سے دیکھ رہا تھا، میں نے اشارہ کیا، چار افراد آگے بڑھ کر نوجوان کی جانب بڑھے تاکہ اسے پچھاڑ کر برتن میں اوندھا کر سکیں لیکن اس

لمحے نو جوان چیخ پڑا، خون کی تمازت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی جانب بڑھتے ہوئے آدمیوں کو حقارت سے دور رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید یہ بد قسمت نو جوان مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ یہ کھیل جارا کا کا کی مقدس روح کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوتا۔ قبیلے کے لوگ اور خون خوار ہو گئے، قریب تھا کہ ان کے نیزے نو جوان کے جسم کو نشانہ بنا دیتے مگر میں نے بلند آواز میں انہیں روکا اور اپنی نشست سے اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھنے لگا، نو جوان کی مضطرب آنکھیں میرے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے رحم کی درخواست کے بجائے نفرت کا اظہار نمایاں تھا، چہرہ ہلہو ہوتا تھا اور اس کا جسم پھڑک رہا تھا، میں اس کے قریب جا کر تھم گیا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“ میں نے اسے سرد آواز میں مخاطب کیا۔

”میں تم سے رحم کی درخواست نہیں کروں گا کیونکہ تم ایک ایسے جانور ہو جسے اتفاق سے بولنا آتا ہے۔“ اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں زہر خند سے جواب دیا۔ ”درندوں سے زندگی کی بھیک مانگنا فضول ہے۔ لاؤ مجھے اپنا خنجر دے دو۔“

”خوب! گویا تم مقابلے پر آمادہ ہو؟“ میں نے سرد مہری سے کہا۔ ”میرے قبیلے کے افراد اس کھیل سے لطف اندوز ہوں گے۔“

”آہ! میں جانتا ہوں کہ اگر میں مقابلہ جیت بھی گیا تو تم میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرو گے۔ میں غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”تمہارے لہجے سے گستاخی کی بو آتی ہے۔“ میں نے گرج کر کہا۔ ”اجنبی نو جوان! تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایک متبرک موت نصیب ہو رہی ہے۔ تم اس سر زمین میں جارا کا کا کی عظیم روح پر قربان ہو رہے ہو، جارا کا کا کی روح تمہاری اس قربانی سے خوش ہوگی اور تمہیں جلد ہی زندگی کی اذیتوں سے نجات مل جائے گی۔“

”میں اپنے آپ کو قربان کر رہا ہوں، اے سنگ دل سردار! تمہیں اپنے دیوتا کے لیے میرا خون درکار ہے نا! میں یہ خون اپنے ہاتھوں سے فراہم کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ مرتے وقت تم سیاہ فام درندوں کے غلیظ ہاتھ میرے جسم سے لگیں، کیا کوئی شخص خود اپنے آپ کو قربان نہیں کر سکتا؟“ اس نے جرات سے کہا۔

”یہاں تمہیں فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ فیصلہ کرنے کا حق، دیوتاؤں، مقدس اقبال اور سردار کو ہے، جس زمین پر تم کھڑے ہو، وہ تمہاری زمین سے مختلف ہے۔ البتہ اگر تمہاری خواہش کو درخواست کا درجہ دیا جائے تو اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔ تم قربانی کے لیے منتخب کر لیے گئے ہو۔ یہ فلاح اور عافیت کا راستہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں یہ فلاح اور عافیت کا راستہ ہے۔“ نو جوان نے طنزاً کہا۔ ”میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے وحشیوں کو اپنے نیزے آزمانے کا حکم دو، میری زبان بند رہے گی۔“

کاش اس نو جوان کو معلوم ہوتا کہ میں اس کے حق میں زندگی کا مژدہ سنانے کے لیے کس قدر مضطرب ہوں۔ اس کی دلیری نے مجھے متاثر کیا مگر میرے متاثر ہونے سے کیا ہو سکتا تھا؟ تاریک براعظم کے قانون کا احترام مجھ پر فرض تھا، میری زبان کی ایک معمولی سی لغزش مجھے مقدس اقبال کی نظروں میں گرا سکتی تھی۔ میرے قریب کھڑے ہوئے ننگ دھڑنگ وحشی درندے میرے اشارے کے منتظر تھے۔ قبیلے کے لوگوں کی آوازیں مدھم

پڑ چکی تھیں، انہیں بے چینی سے میرے فیصلے کا انتظار تھا۔ میں مہذب دنیا کے نوجوان کے سامنے ایک درندے کی حیثیت سے کھڑا تھا، درندوں کے فیصلوں میں کسی چلک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں چند ثانیوں تک سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔ ”تمہاری درخواست منظور کی جاتی ہے۔“

میں نے اپنا خنجر نکال کر اس کی جانب اچھال دیا۔ مشتعل گروہ میرا اشارہ پا کر پیچھے ہٹ گیا، انہیں میرے فیصلے سے مایوسی ہوئی تھی لیکن میری ہیبت انہیں خاموشی اور اطاعت پر مجبور کر رہی تھی۔

”میری روح تمہاریہ احسان یاد رکھے گی۔“ نوجوان نے مجھے مخاطب کر کے جواب دیا، پھر خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے آسمانوں کی سمت دیکھتے ہوئے پراعتماد لہجے میں بولا۔ ”اے مقدس جارا کا کا کی عظیم روح! میں تجھ سے نا آشنا ہوں اور تو میرے قلب سے آشنا ہے۔ تیرے عبادت گزار میرا خون طلب کر رہے ہیں۔ میں انہیں اپنا خون پیش کرتا ہوں۔ اگر مجھے زندگی دی جاتی تو میں یہاں کا سب سے بڑا عبادت گزار ہوتا لیکن تیری خوشنودی اگر میری قربانی میں پنہاں ہے تو یہی سہی۔ میں اپنی جان تیری مقدس روح کی نذر کرتا ہوں۔“ نوجوان کا لہجہ میرے لہجے کی طرح فصیح نہیں تھا اس لیے کہ وہ مقامی زبان سے بہت معمولی واقفیت رکھتا تھا لیکن اس نے جس جرات اور دلیری سے مرتے وقت یہ اعلان کیا۔ اس نے سب کو چونکا دیا۔ نوجوان کے اس جذباتی انداز اور مسکراتے ہوئے چہرے نے مجھے شش و پنج کی کیفیت سے دوچار کر دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ایک جھٹکے سے خنجر اپنے پیٹ میں اتار لیا۔ میری آنکھیں مچ گئیں لیکن اسی وقت فضا میں ایک شدید تڑا کا ہوا، میں نے گہرا کر آنکھیں کھول لیں۔ نوجوان کا ہاتھ اس کے پیٹ پر ٹکا ہوا تھا اور وہ سکتے کی حالت سے دوچار تھا۔ میرے قبیلے کے افراد اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئے۔ میں نے اطراف میں نظر ڈالی۔ یہی حال سمورال اور سرنگ کا تھا۔ اچانک میری نظر آسمان پر گئی اور میں تیزی سے پیچھے ہٹ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ کھلے آسمان سے سیاہ ذرات کا بھنور نیچے اتر رہا تھا، یہ جارا کا کا کی روح کی آمد کے آثار تھے۔ نوجوان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ پتھر کی طرح اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ سیاہ ذرات کا بھنور ہر لمحے اس کے قریب تر ہو رہا تھا، اس نے بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کی، اپنی جگہ جما کھڑا رہا، مجھے جھرجھری آگئی۔ میں سیاہ ذرات کی آندھی کا کرشمہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔ نوجوان کا جسم اس کی زد پر آ کے راکھ بن جاتا۔ میں نے سیاہ ذرات کا بھنور نوجوان کے سینے پر رکھتے دیکھا تو نگاہیں زمین پر جھکا لیں۔ میرے قبیلے کے تمام افراد زمین بوس تھے، ہر طرف ایک ہولناک سکوت طاری تھا، میں سر جھکائے زمین کی چھاتی سے چننا رہا۔ لہجوں میں کیا ہو جائے؟ یہ کسی کو خبر نہیں تھی۔ میں چند لمحوں تک نظریں جھکائے خاموش پڑا رہا۔ پھر جب فضا سے زروں کی بھن بھناہٹ کی مخصوص آواز دور ہونے لگی اور میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو میری آنکھوں پر دھند چھا گئی! مہذب نوجوان راکھ کے ڈھیر کی بجائے اپنی جگہ صحیح سلامت کھڑا تھا، اس کا خنجر دور پڑا تھا اور جس برتن میں مقدس کھوپڑی کو غسل دینے کی خاطر انسانی خون جمع کیا گیا تھا، اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا، ابھی میں اس اسرار پر ششدر رہی تھا کہ سمورال تیزی سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی مسلط تھی۔

”جزیرہ توری کے مقدس کاہن! اسرار کا پردہ چاک کر۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”کیا مجھ سے پھر کوئی لغزش سرزد ہوگئی؟“

”جابر بن یوسف! تمہارے اعتماد کو کیا ہو گیا؟ سنو اے مرد ناتواں! سمورال آنکھوں سے نوجوان کی سمت دیکھ کر بولا۔ ”مقدس جارا کا کا کی عظیم روح نے قربانیاں قبول کر لی ہیں، تم سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔“

”پھر یہ نوجوان قیدی؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”اسے زندگی بخش دی گئی ہے۔“ سمورال نے جواب دیا۔ ”کون جانتا ہے، کہ جارا کا کا کی روح کب اور کس پر مہربان ہو جائے۔ یقیناً

اس نوجوان نے جرات کا ثبوت دیا تھا، جرات جارا کا کا کو پسند ہے۔“

یقیناً اس کا فیصلہ سب سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔“ میں نے نیاز مندی سے کہا اور حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھا جو ابھی تک سر اسیمہ کھڑ

تھا۔ وہ میری اور سمورال کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میدان میں جھوم ابھی تک دم بخود تھا۔ قربانی کی رسم ادا کرنے والا گروہ اپنے نیزے

پہلے ہی پھینک چکا تھا۔ ”اے خوش بخت شخص!“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”مژدہ ہو کہ جارا کا کا کی مقدس روح نے تجھے زندگی کی نوید دی ہے اب تو

ہمارے لوگوں میں شامل ہے اور اس زمین پر تیرا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا ان عبادت گزاروں کا۔“ میں نے جھوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن یاد رکھ۔ جارا کا کا نے اس زمین پر ایک سردار مقرر کیا ہے جو مقدس اقبال کا غلام ہے۔ وہ سردار دیوتاؤں کے برگزیدہ لوگوں کے سوا سب پر فوقیت

رکھتا ہے۔ تیرے لیے لازم ہے کہ تو سردار کی اور تاریک براعظم کے مقدس رسم و رواج کی پابندی کرے، تو ایک جانور ہے، اگر تو نے اپنے ریوڑ سے

سرکشی کی تو ہمیشہ کے لئے ریوڑ سے علیحدہ ہو جائے گا اور تو نے سر جھکا کر چلنا سیکھا تو تجھے لذیذ شرا میں اور معطر عورتیں مہیا کی جائیں گی۔ قبیلے کے

سردار کا ہر حکم ہر سلسلے میں آخری ہوگا۔“

نوجوان نے احتراماً سر جھکا لیا اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے جواب دیا۔ ”میں نے نئی زندگی پائی ہے۔ لہذا میں مقدس جارا کا کا کی اطاعت

اور اس کی روح کی خوشنودی کے لئے ہمیشہ ایک وفادار اطاعت شعار شخص ثابت ہوں گا۔“

شخص کے بجائے کتا کہہ۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ اگر میں ہوتا تو یہی کہتا۔ ”یہ وحشی درندے اب تیرے عزیز ہیں۔“ میں طنزاً کہا۔

نوجوان نے کچھ کہنا چاہا مگر خاموش ہو گیا۔ وہ ایک ذہین صلح جو شخص نظر آتا تھا، اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بالوں میں سرخی شامل تھی۔ اس

کے زندہ رہنے پر مجھے خوشی تھی۔ میں نے اسے زارے کے حوالے کیا اور تاکید کی کہ وہ اسے اپنی رعایا میں شمار کرے۔ جشن ختم ہونے سے پہلے کا بہن

اعظم نے توری کے تمام افراد کو ایک جگہ کھڑا کر کے جارا کا کا سے الفت اور رفاقت کی دعائیں مانگیں پھر میدان رفتہ رفتہ خالی ہونے لگا۔ سرنگا نے

اپنے غار کی سمورال نے اپنی اقامت گاہ کی اور میں نے فزارو کے ساتھ اپنے مکان کی راہ لی۔ جارا کا کا کی روح نے عین موقع پر نمودار ہو کر نوجوان کو

زندگی کی جو نوید دی تھی وہ ایک غیر متوقع بات تھی۔ مہذب دنیا کا یہ قافلہ اپنے اپنے چار مردوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، دو افراد ابھی تک مفروز تھے۔

عورتیں میری تحویل میں تھیں۔ میں واپسی میں راستے بھر اپنے متعلق سوچتا رہا۔ گو نوجوان کی جاں بخشی سے قربانی کا تذکرہ کسی حد تک کم ہو گیا تھا لیکن یہ

کیسا عجیب نظارہ تھا؟ مہذب دنیا کے آدمیوں کا خون مجھے اپنے سینے پر جما ہوا معلوم ہوتا تھا، میں اسے اگل بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اسے ہضم کر لینا

چاہیے تھا۔ فزارو میرے ہمراہ تھا اور پیچھے ایک جھوم تھا۔ سرتیلاستی میں تنہا رہ گئی تھی۔ وہ مجھے بستی کے قریب ہی مل گئی۔ اس نے زہریلی مسکراہٹ، سے

مجھے دیکھا۔ میرا جی چاہا، اس کا گلا گھونٹ دوں۔

”کیا وہ سب ختم ہو گئے سیدی؟“ اس نے قریب آ کر پوچھا۔

”نہیں، ایک بخش دیا گیا ہے، دو مفروز ہیں۔ عورتیں سب کی سب زندہ ہیں۔“ میں نے جھپٹتے ہوئے جواب دیا۔

”گویا ایک بار پھر بزم آرائی ہوگی۔“

”ہاں۔ اور بار بار ہوگی۔“ میں نے زچ ہو کر کہا۔ ”انسانی خون کا ذائقہ بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ میرے منہ کو خون لگ گیا ہے۔“

”اب تم مکمل طور پر یہیں کے ایک فرد معلوم ہوتے ہو۔“

”اور تم اس وقت تک پریشان رہو گی، اپنے دن اپنی راتیں ضائع کرتی رہو گی۔ اور جوں بآس تم نے اپنی دانست میں اوڑھ رکھا ہے، وہ صرف تمہاری اندرونی بصارت تک محدود ہے جب تمہارے دن گزر جائیں گے وقت تمہیں بتائے گا کہ تم نے فریب خوردگی میں کیسی حسین ساعتیں گنوا دیں؟ اس جزیرے سے آگے سمندر ہے، راستے گم ہیں۔ ضمیر کیا ہے؟ یہ ضمیر تمہاری مخصوص روایات کا مرہون منت ہے۔ اس طلسم خانے میں ہی اگر اس کی پرورش ہوتی تو تمہیں یہ لباس نظر نہ آتا۔ میں جو کچھ دیکھ چکا ہوں، وہ تمہیں نظر نہیں آ سکتا۔ اب خون کی یہ تلخی ہی میرا ضمیر ہے جس سے میرے منہ کا مزا کڑوا ہوا رہا ہے مگر میں نے اسے اپنے حلق میں اتار لیا ہے۔ تم تو ری کی حسین لڑکیوں سے اپنے بدن پر مالش کرتی رہو اور شکار کے عمدہ گوشت کی لذتوں سے بہرہ ور ہوتی رہو۔ توری کی جڑی بوٹیاں تمہارا بدن ایک عرصے تک محفوظ رکھیں گی، یہاں شباب کی عمر طویل ہوتی ہے پھر ایک دن تم بھی اس نتیجے پر پہنچو گی جس پر میں تم سب سے پہلے پہنچ گیا ہوں۔ بھولی لڑکی! کیا تم ہواؤں میں اڑ رہی ہو؟ ذرا اپنے قدموں کی طرف دیکھو کہ وہ کس زمین پر جھے ہوئے ہیں۔“

سرتیانے میرا طویل بیان غور سے سنا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”سیدی!“ وہ کہہ سکتے ہوئے بولی۔ ”شاید مجھے زمینی زمین کا نقش بہت گہرا ہے۔ میرا ضمیر ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے اور تم بھی صحیح کہتے ہو کہ ضمیر تو زمین سے وابستہ ہوتا ہے۔ زمین بدل گئی تو ضمیر بھی بدلنا چاہیے۔ آہ، میں خود فریبی میں مبتلا ہوں مگر یہی تو میرے جینے کا جواز ہے۔“

”تم بعض اوقات کتنی اچھی باتیں کرتی ہو۔ سرتیا، میرے محسن سرنگ کی لڑکی سرتیا۔ جب تم ناراض ہوتی ہو تو مجھے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ تم میرے بیان پر یقین کرو، میں ابھی تک یہاں کا ایک مثالی آدمی نہیں ہوں۔ ابھی مجھے بہت سے سحر و اسرار نہیں آتے، مجھے رحم آنے لگتا ہے کبھی کبھی ایک خلش سی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایک درد سا سینے کے اندر اٹھتا ہے۔ مجھے عورتوں کو روندتے ہوئے اب بھی جھجک ہوتی ہے۔ میں اب بھی انتہا پسندانہ فیصلے کرتے ہوئے گھبراتا ہوں لیکن یہ سب کوتاہیاں ہیں۔ دعا کرو کہ یہ کوتاہیاں سرزد نہ ہوا کریں، یہ خامیاں مجھ سے دور ہو جائیں اور میں مقدس اقبال کا ایک بہترین غلام بن جاؤں۔“ سرتیانے لاشعوری طور پر معنی خیز انداز میں میرا ہاتھ دبایا۔ ہم جلد ہی مکان پر پہنچ گئے۔ میں نے اس ادھیر عثر شخص کی گھڑی دیکھی جس کا خون ابھی ابھی پیا تھا۔ سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ اجنبیوں نے اپنی گھڑیوں کی سوئیاں توری کے وقت کے مطابق کر دی تھیں۔ میں اپنے بستر پر ڈھیر ہو گیا اور خاماؤں کو حکم دیا کہ وہ کمرے میں اطلاع کے بغیر نہ آئیں، بستر پر لیٹنے ہی پھر وہی کٹافتنیں، مجھ پر حاوی ہو گئیں جو جشن سے پہلے تھیں اور جو اس وقت سے تھیں جب اقبال کی بارگاہ سے میں ناقابل فہم انداز میں یہاں پھینک دیا گیا تھا۔ جشن نے کچھ دیر کے لیے ذہن مصروف رکھا۔ مہذب دنیا کے قافلے کا فیصلہ کر کے میں نے خود کو دیوتاؤں کی نظر میں سرخ رو کر لیا تھا، یقیناً مہذب

دنیا کی عورتوں نے بھی اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھا ہوگا اور انہیں احساس ہوگا، انہوں نے اپنا کتنا وقت کرب میں گزار دیا۔ انہیں اپنی مخالف جنس سے مختلف ہونے کی جو رعایت ملی تھی یعنی زندگی، وہ کچھ کم نہیں تھی، شاید زندگی سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ آدمی ہر حال میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ موت کے جذبے ہوا کے جھونکے کی طرح آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ ان عورتوں کو جارا کا کا کی بڑی عبادت میں لے جایا گیا ہوگا کیونکہ جارا کا کا کی عبادت میں شرکت قبیلے کے ہر فرد کے لیے لازم تھی۔ صرف سرتیا یہاں اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ جشن میں شرکت کے لیے ضرور گئی تھی مگر جب اس نے خون خوار چہرے اور موت کا رقص دیکھا ہوگا، وہ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی ہوگی۔ میں اپنے فرائض میں اتنا منہمک تھا کہ بہت سے لوگوں کے چہرے میری نظروں سے اوجھل رہے۔ دونوں قبیلوں کی ساری آبادی وہاں موجود تھی، جارا کا کا کی عبادت کے درمیان میں اٹھ کر چلا آنا ایک ناروا بات تھی، سرتیا یہ جرات کر سکتی تھی کیونکہ وہ سرنگ کی عظیم دیوی کی امان میں تھی اور سرنگا جیسے صاحب اسرار شخص کی بیٹھی تھی۔

میں نے اس ماحول کے حوالے سے اس کے تیکے اور طنز بھرے رویے سر کر دیئے تھے۔ میں نے لفظوں کی شعبہ گری دکھائی تھی لیکن خود میرا کیا حال تھا؟ لفظ میرے ذہن میں بھی ابھرتے ہیں۔ میری ذہنی کیفیتیں لفظوں کے قالب میں ڈھل کر اواہور ہی ہیں مگر ماہ و سال کا عذاب کون رقم کر سکتا ہے یا بیان کر سکتا ہے۔ میرا حال کیا تھا؟ میں ایک ایسا تنور تھا جو کبھی سرد پڑ جاتا ہے، کبھی سرخ ہو جاتا ہے۔ جشن کی مصروفیت بھی گزر گئی۔ یہ میرے شباب کی عمر تھی اور سیرابی کے لیے توری کی دو شیرازوں کے چشے بہتے تھے، باہر طرف ہریالی تھی، زندگی کے اتنے بکھیرے نہیں تھے جو مہذب دنیا میں ہوتے ہیں، نہ ٹریفک کا شور تھا، نہ فضا میں آلودگی۔ پھر بھی یہ مکان خمس معلوم ہوتا تھا۔ سرتیا دوسرے کمرے میں ہوتے ہوئے بھی دور تھی۔ سرنگا غار میں فرار کے منصوبے بنا رہا تھا۔ فلورایز نار کے سرکشوں کے قبضے میں تھی۔ ہر طرف شک اور ابہام کی دیواریں تھیں۔ ایک تنہائی تھی اور ایک ہی خیال تھا۔ ہاں اس کا خیال۔ اس زہرہ جمال کا خیال جس کا نام اقبال ہے۔ اور کیا تھا؟ وہی تو تھی جس نے ویرانی میرے شب و روز کے لیے تقویض کر دی تھی مگر اس کا ذکر چھوڑیے۔ یہ ذکر وحشت میں مبتلا کرتا ہے اور سکون غارت کرتا ہے، وہ غارت گر تمکین و ہوش ہے مگر اس کا خیال تحریک کا سبب ہے وہ ایک ایسی چیز، معلق چیز ہے جسے چھونے کے لیے جتنا دوڑے، جتنا اچھلیے وہ دور ہو جاتی ہے اور آدمی تھک کر ہمت کھو بیٹھتا ہے، تاریک براعظم کے نہ جانے کتنے لوگوں نے حوصلہ کھو دیا تھا اور انہیں دور تک بھاگنے کا یہ صلہ ملا تھا کہ وہ جہاں تھے، وہیں رک گئے تھے۔ میں سرداری پر ٹھہر گیا، اس کا خیال آیا تو میں نے اپنے آپ کو چھیڑا کہ اے جابر بن یوسف! ابھی تیرا سفر شروع ہوا ہے۔ تیری منزل ابھی دور ہے، وحشتیں جھٹک کر جہاں تک بھاگ سکتا ہے، بھاگ۔ جشن سے پہلے میں نے ایک عہد کیا تھا۔ توری کے ایک جلیل القدر شخص کو سخر کر کے میں نے اس کے جس غار پر قبضہ کیا تھا، وہاں سے میں اپنی نئی منزل کا آغاز کر سکتا ہوں۔ اس غار میں بیش بہا نواور تھے جن میں سے بیشتر کے متعلق میرا علم ناپختہ اور خام تھا اور مجھے اس میں سمورال کی اعانت درکار تھی۔

انہی خیالوں میں رات ہو گئی اور بستی میں رات اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ آئی۔ آج بستی کے لوگ بہت خوش تھے۔ انھوں نے جارا کا کا کی مقدس روح کا دیدار کیا تھا اور اس نے نمودار ہو کر ان کی قربانی کی قبولیت کی سند دی تھی۔ میں نے سوچا، مجھے مہذب دنیا کی عورتوں کے پاس جانا چاہیے اور رات ان کے بدن کی خوشبو سے مہر کافی چاہیے، لیکن میں سرنگا کے غار کی طرف چلا گیا اور میں نے چند رسمی جملوں کے بعد اسے غار سے

باہر نکلنے پر آمادہ کر لیا۔ سرنگا اپنی دیوی کی مورتی جیب میں رکھ کر اور اپنے غار پر انگلیوں سے چند نشانات بنا کر میرے ساتھ اندھیرے جنگل میں چلتا رہا۔ ہم جلد ہی ہی اس غار تک پہنچ گئے جو میں نے جشن سے پہلے دریافت کیا تھا، میرے ہاتھ میں روشن شپالی تھی۔ غار کا دہانہ صاف کر کے ہم سرنگ نما راستے سے اندر داخل ہوئے۔ بوڑھے شخص کی لاش حیرت انگیز طور پر سوکھ گئی تھی۔ میں نے اسے ہٹایا، میں سرنگا کے چہرے کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا۔ شپالی کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے کسی قدر فخر کا احساس ہوا، وہ بہت اٹھاک اور حیرت سے پہلے کمرے کے نوادر دیکھ رہا تھا۔ میں اسے دوسرے اور تیسرے کمرے میں لے گیا پھر میں نے اسے پورے غار کا معائنہ کرا دیا۔ سرنگا اس درمیان میں کچھ نہیں بولا۔ وہ صرف ہوں ہاں کرتا رہا اور میں اسے بتاتا رہا۔ ”ابھی میں نے اور کا ہن اعظم سمورال نے صرف یہی کمرے دریافت کیے ہیں۔ ممکن ہے اندر کوئی اور دنیا بھی ہو۔“

اس نے تارک الدنیا بوڑھے کی خافتہ دیکھی جہاں جا رہا تھا، سرنگا نے سمورال سے زیادہ وقت لیا، غار کی سب سے حیرت انگیز خوبی یہ تھی کہ اندر گھٹن اور جس کا گمان تک نہیں گزرتا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹنگی ہوئی کسی جانور کی کھال زمین پر بچھائی اور اس پر ایک مخصوص انداز میں بیٹھ گیا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے ایک جانب اشارہ کیا، میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کسی جانور کے کٹے ہوئے سر کی آنکھیں روشن ہو گئی ہیں، یہ سراسی کھال سے متعلق معلوم ہوتا تھا جس پر سرنگا بیٹھا تھا۔ جانور کی روشن آنکھوں کے ساتھ اس کی زبان بھی باہر نکل آئی تھی۔ سرنگا نے چند لمحے اس عمل میں گزار دیئے۔ مجھے نہ جانے کیا خیال آیا کہ میں نے منور شپالی دیوار پر لٹکے ہوئے ہیبت ناک جانور کی طرف کر دی۔ جانور کی آنکھیں بچھ گئیں اور اس کی باہر نکلنے والی زبان اندر دھنس گئی اور سرنگا جانور کی کھال پر کسمانے لگا، وہ جلد ہی اٹھ گیا، جانور کی کھال کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا۔ غار کے تفصیلی معائنے کے بعد میں نے سرنگا سے پوچھا۔ ”کیا ہم واپس چلیں؟“

”ہا۔ آں۔ چلیں۔ چلیں۔“ سرنگا نے چونک کر کہا۔

”کیا رائے ہے محترم سرنگا!“ میں نے غار کے اطراف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری خاموشی گراں گزر رہی ہے۔“

”میں تم سے کہتا کہ تم کچھ دن کے لیے یہ غار میرے حوالے کر دو۔“ سرنگا نے خوابیدہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں تم سے نہیں کہوں گا۔“

”بخوشی۔ تم چاہو تو یہیں قیام کرو۔“

”نہیں۔ یہ غار تم نے حاصل کیا ہے اور اصل میں تمہی ان نوادر کے مالک ہو۔ سیدی جابر! یہ غار تمہارا منتظر ہے۔ مقدس کا ہن اعظم کو مجبور کرو کہ وہ تمہارے ساتھ یہاں آئے۔“

”اس نے ہامی بھری ہے اور میں عنقریب یہاں بیٹھنے والا ہوں۔ سنا ہے ان غاروں میں درازی عمر کا کوئی افسوس موجود ہے؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ ”نہ معلوم یہاں کے اسرار سمجھنے میں کتنی دیر لگے؟“

”جتنا بھی وقت صرف ہو۔ یہ غار تمہاری سرفرازی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے عزیزم جابر!“ سرنگا نے راز دارانہ لہجے میں کہا۔ ”میں ادھر اپنے غار میں مصروف ہوں۔ ادھر تم تکمیل علم کرو۔ کیا تمہیں میری پہلی باتیں یاد ہیں۔ میں یہاں ان کی تکرار مناسب نہیں سمجھتا۔“

”کون سی باتیں؟“ میں نے اچانک پوچھا، پھر مجھے خیال آ گیا کہ سرنگا کے ذہن میں کیا ہے۔ ”ہاں۔“ میں نے بجھے ہوئے انداز میں

کہا۔ ”اگر وہ نہ سہی تو زندگی میں خود سے کوئی شکوہ تو نہیں رہے گا۔ بہر حال محترم سرنگا! ممکن ہے تمہارا قیاس درست ہو۔ تم اپنے غار میں جو وقت صرف کر رہے ہو، وہ میرے دل پر شاق گزرتا ہے لیکن میں تمہیں منع نہیں کر سکتا۔ میں تمہاری غیر معمولی خوبیوں کا قائل ہوں اور تمہارے ساتھ جو لوگ ہیں، انہیں بھی میں دیکھ چکا ہوں۔“

”سیدی! تمہاری آنکھیں شمال جنوب غرب و شرق کی جانب کھلی رہتی چاہئیں، اپنی سانس کی طہارت کا تعین کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھایا کرو۔ ہر شخص مقدس اقبال کا غلام ہے اور ہر شخص اس کی قربت کا خواہاں ہو سکتا ہے، میں بھی اس کی قربت کا متمنی ہوں لیکن تمہارے اور تاریک براعظم کے بیشمار لوگوں کے، اور میرے جذبات میں فرق ہے۔ تم سمجھ رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میں تو بڑی صاف گفتگو کر رہا ہوں۔“

”میں سمجھ رہا ہوں اور تم جانتے ہو کہ مقدس اقبال نے اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ کون اس کی طلب میں ذہنی و جسمانی مظاہرے کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ میں نے خود کو شناخت کرانے کے لیے عملی اقدام کیے ہیں۔“

”لیکن کسی وقت کوئی اور بھی کہیں سے نمودار ہو سکتا ہے۔“

”کون! کیا تم کچھ سوچ رہے ہو؟“

”میں تمہاری قوت شامہ تیز دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں ہمیشہ تمہارے مشوروں اور رہبری کا طالب رہا ہوں۔ آہ تم نہ ہوتے تو.....“ میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سرنگا نے روک دیا۔

”وہ نوجوان کیسا ہے؟“

”کون؟“

”وہی۔ وہی۔“ سرنگا نے الجھتے ہوئے کہا۔ ”جس نے امان پائی ہے۔“

”وہ۔ وہ۔“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”وہ مہذب نوجوان؟“

”ہاں ہاں، وہی، وہ ایک ذہین اور صحت مند شخص ہے۔“

”تم۔ تم۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

سرنگا نے بیزار سے پہلو بدلا۔ ”اوہ سیدی جابر! عزیزم، تم نے اس سے کوئی بات کی؟“

”نہیں۔“ میں نے تشویش سے کہا۔ نہیں، اس کا موقع نہیں ملا۔“

”آؤ چلتے ہیں۔“ سرنگا نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”بلاشبہ تم نے یہ غار دکھا کے مجھے خاصا متاثر کیا ہے۔“

”مگر تم کوئی اور بات کر رہے تھے۔“ میں نے برہمی سے کہا۔

”میں کوئی خاص بات نہیں کر رہا تھا۔ یہاں لفظ اتنے ہی بولنے چاہئیں جتنی اجازت دی گئی ہے۔“ سرنگا نے مجھے خشمگین نظروں سے دیکھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ واپس ہونے لگا۔ سرنگا وضاحت سے گریز کر رہا تھا لیکن وہ یقیناً کسی اہم بات کی نشاندہی کر رہا تھا جو اس نوجوان سے

متعلق تھی۔ سرنگانے غار میں کوئی ایسا حصار قائم نہیں کیا تھا جس سے ہماری گفتگو ہم ہی تک محفوظ رہتی۔ واپس ہوتے وقت وہ مجھے کسی بچے کی طرح تاکید کرنے لگا کہ مجھے کاہن اعظم سمورال سے اس غار کے اسرار سمجھنے میں مدد لینی چاہیے۔ وہ مجھے تاریک براعظم کے روشن پہلو دکھاتا رہا اور یہاں کے دیوتاؤں کی شان میں قصیدے پڑھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا، وہ اس قدر فیاضی سے کیوں کام لے رہا ہے؟ سرنگا ایک بہت زیرک اور ہوش مند شخص تھا۔ ہوش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ میں اپنی تشویش کے باوجود صرف اس کے جوابات پر قناعت کروں چاہے، وہ کتنے ہی مبہم اور علامتی کیوں نہ ہوں، تاریک براعظم علامتوں کی دنیا تھی، ایک تجربی

دنیا۔ یوں تجربہ مند دنیا میں بھی موجود ہے لیکن انسانوں نے صدیوں کی تگ و دو سے وہاں کے خدوخال تراش لیے ہیں، وہ صاف، سیاہ اور چکنی سرکیں۔ وہ بلند و بالا عمارتیں اور رفتار کا جادو۔ ان سب خیرگیوں کے باوجود مہذب دنیا میں سوچے تو ہر قدم پر تجربہ ہے۔ میں بھٹک گیا۔ یہ وقت فلسفیانہ موٹو گافیوں کا نہیں ہے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ جنگل میں ایک خاص موڑ پر جا کر میں اور سرنگا علیحدہ ہو گئے۔ میں ہستی کی طرف چل دیا اور سرنگا اپنے تنگ و تاریک غار کی طرف۔ میں زندگی کی طرف لوٹ آیا، وہ زندگی کے حصول کی جدوجہد میں چلا گیا۔ قبیلے کے لوگ اونگھنے لگے تھے، ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر جواد تین چار عورتوں کے درمیان سرمست پڑا سو رہا ہے۔ راستے میں مہذب دنیا کی قیدی لڑکیوں کی جھونپڑی بھی نظر آئی جہاں نیزہ بردار مستعدی سے پہرا دے رہے تھے۔ میرے قدم ہلکنے لگے۔ نیزہ بردار مجھے راستہ دینے کیلئے زمین پر لیٹ گئے لیکن میں اندر سے ان کی ایک جھلک دیکھ کر چلا آیا۔ وہ سبھی ہوئی ایک دوسرے سے لپٹ کر سو رہی تھیں۔ اس سکوت میں گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز آرہی تھی جو مجھے بری معلوم ہو رہی تھی۔ وقت کی یہ بار بار تنبیہ زندگی کے زیاں کا احساس دلاتی تھی۔ میں نے گھڑی ایک دیوار سے ٹانگ دی، توری کی خادما میں میرے سامنے صف میں کھڑی ہو گئیں میں نے ان سے ایک قدر مشروب طلب کیا، نیند آنے کی ایک یہی صورت تھی، نیند پھر بھی نہیں آئی۔ میں نے ایک قدر اور خلق میں اتار لیا۔ پھر وہ مجھے اس وقت تک پلاتی رہیں جب تک میری آنکھیں بوجھل نہ ہو گئیں اور انہوں نے میری کھلی پلکیں ڈھک نہ دیں۔

اب جزیرہ توری کی زمین مجھے تنگ لگتی تھی اور یہاں کے تمام باشندے بونے معلوم ہوتے تھے، جتنے وسائل موجود تھے، ان کے مطابق گلیاں، پختہ جھونپڑیاں، نت نئے سانچوں کے برتن اور پہیوں کی گاڑیاں بنادی گئی تھیں۔ ہر رات سرمستی کرنے کا اعلان کر دیا گیا تھا، جو لڑکیاں جوان نہیں ہوئی تھیں، ان کا انتظار بے سود تھا، شوالا اور کالا ری کے قبیلوں کی منتخب عورتیں یکساں نظر آتی تھیں، مجھے کہنا چاہیے کہ مہذب دنیا اور جاہل دنیا میں صرف اشیاء کی کثرت اور کمی کا فرق ہے، اشیاء کا زیادہ سے زیادہ علم مہذب ہونے کی علامت ہے اور اشیاء کا کم سے کم علم غیر مہذب ہونے کی نشانی، درندگی و سفاکی ارد گرد زیادہ اشیاء کے ہجوم سے کم ہو جاتی ہے جیسے جیسے اشیاء بڑھتی جاتی ہیں، فرد کا ذہن بھی اسی نسبت سے بدلتا رہتا ہے، اگر یہ بات میں نے پہلے نہیں کہی ہے تو اس کا سبب یہ تھا کہ میرا مشاہدہ نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا، میں اسرار و کمالات، بحر و طلسم کے ان تذکروں میں یہ کیسا ذکر لے بیٹھا ہوں؟ میرا خیال ہے، میں اپنے موجودہ حلیے اور ماحول کا جواز پیش کرنے کے لئے منطق اور استدلال کا سہارا ڈھونڈ رہا ہوں، شاید میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فرد میں ذہنی طور پر کوئی ارتقا نہیں ہوا، جو ہوا ہے وہ اضافی ہے اور وہ اسی مخصوص ماحول کے سبب سے ہے جس میں انسانوں کے مختلف گروہ آنکھیں کھولتے اور سانس لیتے ہیں مگر نہیں یہ تو مابعد الطبعی ماحول تھا۔ انسانوں کے رویے وہی تھے جو مہذب دنیا میں نظر

آتے ہیں لیکن یہ ایک ایسے تار و پود میں جکڑے ہوئے تھے جن کا سرا کہیں نہیں ملتا تھا، ایسی دنیا کبھی موجود ہی ہوں۔ میری نظروں کے سامنے یہ لہلہاتا سبزہ تھا۔ پانی تھا اور مٹی تھی اور چلتے پھرتے لوگ تھے مگر یہ ماحول اپنی بعض صفات کے اعتبار سے معلومہ تاریخ سے پہلے کے کسی زمانے سے تعلق رکھتا تھا، میں پھر نیچے آتا ہوں اور نتیجہ اخذ کرنے کا کام لوگوں پر چھوڑتا ہوں، میں اس ماحول کا اسیر تھا اور میری حیثیت ایک سیاح ایک سائنس دان کی نہیں تھی، میں کسی سماجی مطالعے کے لئے بھی یہاں نہیں آیا تھا۔ سرنگا کا اطمینان ظاہر کرتا تھا کہ وہ ان پیچ در پیچ گتھیوں میں دلچسپی لیتا ہے۔

دوسرے دن صبح زارے نے مجھے اطلاع دی کہ جزیرہ توری کے کسی ظاہر حصے پر دونوں مفرد آدمیوں کا وجود نہیں، ممکن ہے وہ کسی برگزیدہ شخص کے ہاں پناہ گزین ہو گئے ہوں۔ اس صورت میں جب تک وہ خود واپس نہیں آ جاتے، انھیں تلاش کرنا مشکل ہے، وہ فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر وہ کسی غار میں کیسے چلے گئے؟ یہ ایک تشویش ناک بات تھی۔ میں بھی پناہ لینے کی غرض سے کاہن اعظم کے غار میں چلا گیا تھا۔ غار تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا، اس خبر سے یہ مراد تو نہیں کہ کسی عالم شخص نے ان کی حالت پر ترس کھا کر یا اپنے کسی مفاد کی خاطر انھیں بطور چارہ استعمال کرنے کے لیے پناہ میں لے لیا ہو؟ ادھر ان دونوں کی گم شدگی ادھر مہذب نوجوان کے متعلق سرنگا کا ناقابل وضاحت رویہ میرے دماغ پر ہلکی ہلکی ضرب لگا رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ بوڑھے عالم کے دریافت شدہ غار میں ریاضت کرنے اور علوم سیکھنے سے پہلے مجھے بعض امور طے کر لینے چاہئیں اور سرنگا کے ادا کیے ہوئے مبہم جملوں کی صراحت کر لینی چاہیے۔ چنانچہ میں سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد زارے کے قبیلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں جہاں جہاں سے گزرتا رہاں، توری کے باشندے میرے آگے پیچھے رہے اور لکڑی، پتھر کے عجیب و غریب باجوں کے ذریعے میری آمد کی اطلاع دور دور پھیلتی رہی۔ ”سردار آ رہا ہے۔ سردار کے لیے جھک جاؤ۔ اپنے کام چھوڑ دو اور اس سے عقیدت کا اظہار کرو۔“ یہ طریقہ زارے نے حال ہی میں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے میں سردار کی منتقلی کی اطلاع پہنچانے کے لیے ایجاد کیا تھا۔

زارے کے مکان پر پہنچ کر میں نے خلوت کی خواہش کی۔ زارے نے اپنی بیویاں میری خدمت اور خاطر داری کے لیے پیش کر دیں۔ میں نے ان سب کو رخصت کر دیا اور مہذب نوجوان کی طلبی کا حکم دیا۔ زارے نے کچھ دیر بعد اسے میرے سامنے حاضر کر دیا۔ نوجوان کے چہرے پر نیازمندی مرقوم تھی۔ وہ بہت خوش تو نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن زندہ رہنے کی ایک طمانیت اس کی آنکھوں سے مترشح تھی۔ میں نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا اور زارے کو وہاں سے جانے کا حکم دیا۔ جب ہم دونوں تنہا رہ گئے تو میں نے اس سے بیٹھ جانے کو کہا، وہ کسی قدر جھجک کے ساتھ اسٹول نما پتھر پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پھر مقامی زبان میں گفتگو کی ابتدا کی۔ ”مقدس اقبال اعظم ہے۔ کہو کہ وہ ہماری رہبر اور ہماری عقلوں کی کلید ہے۔“ نوجوان نے کچھ سمجھنے کے انداز میں میری طرف دیکھا اور شکستہ لہجے میں دہرایا۔ ”وہ عظیم ہے، بلاشبہ وہ ہماری رہبر اور ہماری عقلوں کی کلید ہے۔“ ”اور یہ کہ تاریک براعظم میں اسی کی سلطنت، اسی کی برتری ہے۔“ میں نے نہایت احترام سے کہا۔ نوجوان نے پھرتی سے یہ جملے بھی دہرا دیئے۔

”نوجوان! میں نے اس جزیرے کے رسم و رواج کے متعلق پہلے ہی تمہیں بتا دیا ہے۔ تم نے جان لیا ہوگا کہ یہاں کی آب و ہوا تمہارے شہروں اور ان کی روشنیوں سے مختلف ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

نوجوان کے چہرے پر حیرت چھا گئی وہ آنکھیں بند کرتا اور کھولتا رہا پھر بولا۔ ”میں نے اطاعت کا عہد کیا ہے۔“

”تمہارا عہد مجھے یاد ہے۔ تم ایک ذہین اور بہادر نوجوان معلوم ہوتے ہو لیکن کیا عجب کہ یہی خوبیاں اس سرزمین پر تمہارے لیے اذیتیں بودیں۔ تمہارے خیال میں ہم سیاہ فام، جن کے جسم بے لباس، بدن رنگے ہوئے اور مکان کچے ہیں، عقل و فہم کے اعتبار سے بھی اتنے ہی پست ہوں گے لیکن یہاں ایسے عالموں کی کمی نہیں جو مادے کو حرکت میں لا سکتے ہیں اور شکلیں بدل سکتے ہیں اور قلب کے اندر گھس کر بیٹھ سکتے ہیں۔ تاریک براعظم کا یہ حصہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے تو کیوں ہے؟ کیا تم نے اس پر غور کیا؟“ میں نے باوقار انداز میں کہا۔

”میری آنکھیں کھل رہی ہیں لیکن ابھی میں نے شاید بہت کم دیکھا ہے۔ امید ہے کہ مجھے کچھ سمجھنے کے لیے مہلت ضرور دی جائے گی۔“

نوجوان نے مختاط لہجے میں جواب دیا۔

میں نے اپنا چوٹی اڑدیا متحرک کر کے کمرے میں چھوڑ دیا۔ نوجوان کی آنکھوں میں اضطراب پیدا ہو، وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”یہ کمرہ تو خوب ہے۔“ اس نے ادب سے مجھے داد دیتے ہوئے کہا۔

مجھے اس کے برجستہ جوابات اور رد عمل سے اس کی طبیعت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ بلا کا تیز، حاضر جواب، معاملہ فہم، نگاہ شناس اور باعزم شخص تھا، اس کا مظاہرہ وہ پہلے ہی کر چکا تھا لیکن مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس کا اشارہ سرنگانے کیا تھا، میں نے سوچا ممکن ہے، سرنگانے ازراہ احتیاط کسی خدشے کا اظہار کر دیا ہو۔ اس نے بہت مبہم بات کی تھی۔ میں نے کئی منزلیں سر کی ہیں۔ یہ نوجوان تو ابھی تازہ وارد ہے، اگر اس نے رخنہ اندازی کی غلطی کی تو اسے باز رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ میں اسے توری کے دوسرے نوجوانوں کی طرح کسی عہدے پر فائز کر سکتا ہوں اور آزمائشوں میں ڈال سکتا تھا لیکن مجھے اس کی گفتگو بھاری تھی اور انداز پسند آ رہا تھا۔ وہ میرا بہترین مقرب ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اپنے حلق سے ایک مخصوص قسم کی آواز نکالی، زارمے آ کر میرے سامنے موؤب کھڑا ہو گیا۔ زارمے کے احترام میں نوجوان بھی اپنی نشست سے اٹھ گیا۔ زارمے میرے اشارے سمجھتا تھا۔ چند لمحوں میں متعدد حسین لڑکیوں کی خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔ میں نے زارمے سے کہا۔ ”ان کے ہاتھ خالی ہیں۔“

توری کے نفیس ترین مشروبات ہمارے سامنے پیش کر دیئے گئے۔ زارمے پھر چلا گیا اور میں نے نوجوان سے کہا۔ ”تمہیں زندگی مل گئی۔“

مگر تمہارا زندگی کیا ہوتی ہے۔ بتاؤ تمہیں ان عورتوں میں کون سی پسند ہے؟“

نوجوان ہچکچاہٹ لگا، وہ شرمانے کے انداز میں مسکرایا۔ ”معزز سردار!“ وہ جھک کر بولا۔ ”میں تمہارے انتخاب کو ترجیح دوں گا۔“

”میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ میں نے اچانک غصے سے کہا۔ ”فیصلہ کرو۔“

”اچھا اچھا۔“ وہ گھبرا کر بولا۔ ”وہ۔“

اس نے متوازن بدن کی ایک نوخیز لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا، لڑکی اس کے پہلو سے چپک کر بیٹھ گئی۔ اس نے اسے ایک جام پیش کیا جسے نوجوان نے میری طرف دیکھ کر حلق میں انڈیل لیا، اس کی آنکھوں میں سرخی تیر گئی۔ جام کا نشہ تیز تھا۔ اس نے لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ”میں اس عنایت کو کیا سمجھوں؟ میں ایک ستم رسیدہ آدمی ہوں۔“

میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ ”تم امریکی ہو؟“

وہ اچھل گیا اور اسے اپنے مختاط لہجے پر قابو نہیں رہا۔ ”امریکی! کیا تم باہر کی دنیا کے متعلق جانتے ہو۔ کیا کوئی امریکی پہلے بھی ادھر آیا ہے؟“

میں مسکرانے لگا، ایک مقتدر مسکراہٹ، جو اعتماد ہی سے ممکن ہو سکتی ہے وہ مجھ سے جواب کے لیے اصرار نہیں کر سکتا تھا، میری خاموشی سے

اس کا چہرہ رنگ بدلنے لگا۔ ”میں سمجھتا ہوں، میں چند لمحوں میں حیران کن اور ناقابل یقین باتیں سن سکتا ہوں۔“

”یہاں ہر قدم ہر پل پر ایک حیرانی ہے اور صرف یہ ہے کہ مقدس اقبال عظیم ہے۔“ میں نے عقیدت جتاتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ عظیم ہے۔“ کسی بازگشت کی طرح نے اس دہرایا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سٹراڈ۔“ اس نے تجسس لہجے میں جواب دیا۔

”سٹراڈ؟ مگر یہ امریکی نام تو نہیں ہے۔“

اس کی آنکھیں یکا یک روشن ہو گئیں اور پھر فوراً بجھ گئیں۔ ”یقیناً تم ان سب سے بہتر ہو۔“ اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم کیسے

جانتے ہو؟ یہاں ضرور امریکی آئے ہوں گے اور تم نے ان کے ساتھ کئی سال گزارے ہوں گے اور۔“ وہ جذباتی ہو کر بولا۔ ”اور وہ سب جا راکا کا کی

مقدس روح پر قربان ہو گئے ہوں گے۔“

”اگر ایسا کبھی ہوا ہے تو ان سب کی روحوں نے ابدیت کی جانب سکون سے پرواز کی ہوگی۔“ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

نوجوان کا ہاتھ پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے بدن پر پھیلا ہوا تھا، اس نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا۔ وہ تذبذب میں تھا کہ مجھ سے کہاں سے گفتگو

کرے۔ میں اسے ٹول رہا تھا۔ اس کے لہجے میں کرب سمٹ آیا اور وہ رقت انگیز آواز میں بولا۔ ”کئی دن تک ہم سمندری موجوں سے سینہ سپر رہے

پھر یہاں پناہ ملی تو محسوس ہوا کہ زندگی تو کھو گئی ہے۔ یہ تو کوئی اور چیز ہے۔“

”ہاں!“ میں اس کی باتوں سے متاثر ہو گیا۔ ”بہر حال تم اب یہیں کے ایک شخص ہو۔ اگر تم نے اچھی اطاعت کا اظہار کیا اور محنت کی تو

زندگی یہاں ایسی کوئی بے کیف شے نہیں ہے۔“

”تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو، میں تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ تم سے مجھے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔“

”تم نے مقامی زبان کس طرح سیکھی؟“ میں نے پوچھا۔

وہ مجھے سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ”میں امریکہ کا شہری ہوں لیکن میرے باپ امریکی وزارت خارجہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے دنیا

کے مختلف ملکوں میں رہے ہیں، میں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا وہاں افریقہ کی مختلف زبانوں کے طالب علم موجود ہیں۔ ان میں ایک لڑکی تھی

جس نے مجھے تھوڑی بہت زبان سکھائی۔“

”تم آکسفورڈ میں پڑھتے تھے؟“ اچانک میرے منہ سے نکل گیا۔

”کیا؟ کیا تم آکسفورڈ سے واقف ہو؟“ وہ میرے قریب آگیا۔ ”تمہاری شخصیت بڑی پراسرار ہے۔“

آکسفورڈ کے ذکر پر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”پروفیسر چرڈ کیسے ہیں؟“ وہ امریکی گدھ ڈاکٹر برائن کیسا ہے؟“

”بخدا۔ معزز سردار، کیا یہ کوئی ساحرانہ گفتگو ہے؟“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم مہذب دنیا کے آدمی ہو۔ مگر۔ مگر نہیں، تم کیسے ہو سکتے ہو۔“

میں نے جا راکا کا کی قربانی کے موقع پر تمہیں دیکھا ہے۔“ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہاری درندگی دیکھی ہے؟ وہ مضطرب ہو گیا اور اس نے بے اختیار میرے

ہاتھ پکڑے لیے۔ ”بتاؤ تم کون ہو؟ تمہارے خط و خال اس علاقے جیسے نہیں ہیں۔ تم مجھ سے انگریزی میں بات کرو۔“

میں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ ”مقدس اقبال اعظم ہے تم ایک سردار سے مخاطب ہونو جوان شراڈ!“

شراڈ نے اپنی غلت محسوس کی اور مجھ سے کسی قدر فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور انگریزی میں کہنے لگا۔ ”شاید میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”نہیں۔“ پہلی بار میں نے انگریزی میں کہا۔ ”زبان قابو میں رکھو۔ تمہارا کوئی بھی آوارہ جملہ تمہارے لیے تباہیاں لا سکتا ہے۔ اطمینان

سے بیٹھ جاؤ۔“

میری فصیح انگریزی اور آکسفورڈ کے لہجے سے اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بیتاب ہو گیا۔ اس اجنبی سرزمین پر آکسفورڈ کا

ایک طالب علم، انگریزی، اور یہ حلیہ اور اس کے گلے میں یہ عجیب و غریب قسم کی چیزیں؟ ”میرے معزز سردار! میں کچھ سمجھ رہا ہوں۔ اعتماد کرو کہ

میں تمہارے باب میں ہمیشہ محتاط رہوں گا۔“ وہ جذبات زدہ انداز میں بولا۔ ”یہ سب کیا ہے؟ تم کون ہو؟ مجھے بتاؤ تم کون ہو؟ اف یہ کتنا بڑا انکشاف

ہے۔ کیسا سنسن ہے تم مجھے اپنا ساتھی، اپنا دوست، اپنا بھائی سمجھو۔“

”میں کسی کا دوست، ساتھی اور بھائی نہیں ہوں۔ تم جزیرہ توری کے ایک عام شہری ہو اور میں تمہارا سردار ہوں۔ میں نے وہ آئینہ توڑ دیا

ہے جو مجھے ماضی کا عکس دکھاتا تھا۔ تم بھی اس سے کنارہ کش ہو جاؤ اور دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرو۔“

”درست ہے۔“ وہ ایک دم اداس ہو گیا۔ ”مگر تمہاری داستان میرے لیے باعث عبرت ہوگی۔ جب تم باہر نہ جاسکے تو میں کس طرح جا

سکتا ہوں؟ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں مجھے پہلی ہی مرتبہ شک ہوا تھا کہ تم ان میں سے نہیں ہو اور میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا بھی تھا۔ میں تم پر کوئی طنز

اور لعن طعن کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا مگر آکسفورڈ کا کوئی طالب علم اتنا سنگ دل نہیں ہو سکتا۔ تم حالات سے مجبور ہو گئے ہو۔“

اس کی باتوں میں لطف آ رہا تھا۔ وہ بار بار آکسفورڈ کے حوالے دے کر مجھے متاثر کرتا رہا۔ میں نے اس کے شدید اصرار پر اپنے بارے

میں چند جملوں میں اسے مختصر بتایا اور اقبال کا ذکر احترام سے کیا اور اسے تاکید کی کہ اس بات چیت کے بعد میری اور اس کی درمیانی خلیج کا فاصلہ کم

نہیں ہوا اور وہ مہذب دنیا سے متعلق ہونے کے سبب سے میری سفارش اور کسی خصوصی کرم کا بھی مستحق نہیں ہوا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے یقین دلایا

اور مجھ سے اجازت لے کر بے تحاشا مشروب پینے لگا۔ پھر اس نے توری کی حسین لڑکی کو سر پر اٹھالیا۔ وہ ناپنے لگا اور میرے پاس آ کر کہنے لگا۔

”معزز سردار! مجھے شک سے بالآخر سمجھو! میں واقعات کی تہہ تک پہنچ چکا ہوں۔“

”واقعات کی تہہ؟“ میں نے قہقہہ لگایا۔

”سیاہ رات کی آندھی جسے تم جارا کا کا کی مقدس روح کہتے ہو، اس نے دوبارہ مجھے امان دی ہے۔ بے فکر رہو، میں دیوتاؤں کو ہمیشہ راضی رکھوں گا۔“

”دوبارہ؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔ ایک بار جہاز پر۔“

”جہاز پر؟ گویا تمہارے ساتھ واقعات مختلف انداز میں پیش نہیں آئے؟“

”ہاں، مگر معزز سردار کیا جارا کا کوئی عورت ہے؟“

”عورت۔ وہ تو ایک نیولا دیوتا ہے۔“

”نیولا۔ مقدس نیولا۔“ وہ ہنسا۔ ”مگر میں نے کل ان سیاہ ذرات میں ایک انتہائی حسین و جمیل عورت کی شبیہ دیکھی ہے ایسی عورت کی شبیہ جو میں نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھی۔“

”کیسی عورت؟“ میں نے بیتابی سے پوچھا۔

”اس کے خدو خال اور اس کا حسن لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ شاید کوئی پری، کوئی حور تھی۔ اس کا بدن پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔“

اس نے ایک ایسی نگاہ سے مجھے دیکھا کہ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کا سرخ و سفید رنگ میری آنکھوں میں تجلیاں بھر رہا تھا۔

میں اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ ”تم مجھے اس عورت کے بارے میں اور کچھ بتاؤ۔“ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

”تم اسے جانتے ہو؟ معزز جابر بن یوسف! میں اس کی ایک نگاہ پر دنیا کا خطرناک سے خطرناک عزم کرنے کو تیار ہوں۔ اے کاش میں دوبارہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں اور سیاہ ذرات کی آندھی میں وہ روشن جمال نمودار ہو۔ جابر بن یوسف! ممکن ہے تمہارے ذہن میں ماضی کی لطافتیں کسی قدر محفوظ رہ گئی ہوں، میں بتاؤں کہ وہ سب بر لطف، سرتاپا نازکت تھی۔“

شراذ بڑی روانی اور فصاحت سے انگریزی بول رہا تھا اور میں سن رہا تھا مجھے سرنگ کی بات شدت سے یاد آئی اور ایک سلسلہ سا خود بخود

میرے دماغ میں وضع ہوتا گیا۔ میرے سامنے امریکی نوجوان شراڈ کھڑا تھا۔

اس کی بہت سی باتیں مجھ سے مشابہ تھیں۔ اسے ابھی کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ اپنی اعلیٰ صفات کی وجہ سے سب کچھ جاننے پر قادر ہو سکتا تھا،

میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ اسے امان ملی تھی۔ جارا کا کا کی روح کے ساتھ اقبال بھی موجود تھی جس کا جلوہ بڑا مہنگا تھا، وہ ایک مہذب نوجوان کے لیے آئی تھی۔ میں اس نوجوان کو توری کے عام نوجوانوں کی طرح نہیں برت سکتا تھا۔ مجھے دیکھ کر شراڈ نے بے تکلفی سے ایک بات کی۔ ”معزز جابر بن یوسف! کیا میں ایک درخواست کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟“

”کہو۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”کیا میں چند لمحوں کے لیے جینا سے مل سکتا ہوں؟“

”مقصد بیان کرو۔“ میں جھنجلا کر کہا۔

”وہ میری سنگیتر ہے معزز جابر! ہم دونوں افریقہ کے سفر پر ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے آئے تھے۔“

”مہذب دنیا کے رشتے بھول جاؤ شراڈ۔“ اس کے اس انکشاف سے مجھے کچھ مسرت سی ہوئی۔ ”جینا اور اس کی ساتھی لڑکیاں اب توری کے سردار کے قریب آنے کا اعزاز حاصل کریں گی۔ توری کا سردار اسی وقت اسے تمہارے حوالے کر سکتا ہے جب وہ اپنے تصرف سے دستبردار ہو جائے۔“

”تم اتنا ظلم کرو گے؟ وہ مر جائے گی مگر یہ کبھی گوارا نہیں کرے گی۔“

”تم ایک سردار سے گفتگو کر رہے ہو۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”مگر کیا یہ بات تمہارے اختیار میں نہیں ہے؟“ وہ جھنجلا کر بولا۔

”میرے اختیارات کے بارے میں تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم بے تکلفی اور گستاخی سے کام لے رہے ہو۔ سردار سب سے افضل ہے، اس کی خواہش سب سے مقدم ہے۔ اب تم یہاں سے جاؤ۔“ یہ کہہ کر میں نے زارے کو اندر بلایا اور نو جوان شراڈ کو باہر بھجوا دیا۔ وہ مڑ کر میری صورت دیکھتا رہا اور میں نے توری کی ایک لڑکی کو ہاتھوں پر اٹھا کر شراب کے بڑے برتن میں لوٹا دیا۔ شراڈ نے رک کر یہ مظاہرہ دیکھنا چاہا مگر زارے اسے باہر لے گیا اور میرا جسم ایک صحرا بن گیا۔ ایک صحرا جہاں کوئی آندھی آئی ہوئی ہو۔

☆=====☆=====☆

تاش کے پتے

جرم کی بساط پر کھیلی جانے والی خونی بازی..... ایک جنونی قاتل کا قصہ جو دنیا کے عظیم ترین قاتلوں کے درمیان اپنا نام سرفہرست رکھنا چاہتا تھا۔ تاش کے باون پتے اس کے مرکز نظر تھے۔ فی قتل ایک پتے کے حساب سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ قانون کے محافظ معمولی سے سراغ کو بھی فراموش نہ کرتے ہوئے قاتل تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر قاتل کی احتیاط پسندی اور فنکاری محافظوں کی راہ میں حائل تھی۔

سطر سترسنی اور سترسنس پھیلانے والے اس ناول کی دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ قاتل آپ کے سامنے ہونے کے باوجود بھی ساتھ پردوں میں پوشیدہ ہے۔

تاش کے پتے ایک سنسنی خیز اور دلچسپ ترین ایڈونچر سے بھرپور ناول ہے جسے کتاب گھر کے ایکشن ایڈونچر جاسوسی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

جزیرے کے دوسرے حصے کی طرف واپس ہوتے وقت بھی میرے لیے تپاک کا وہی حال تھا جو جاتے وقت تھا لیکن مجھے یہ سب کچھ مصنوعی معلوم ہو رہا تھا۔ قبیلے کے لوگ رشک اور فخر کی نظر سے میری جانب دیکھتے تھے مگر میں خود اپنی نظر میں گر گیا تھا مجھے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ کبھی سیاہی، کبھی سفیدی، کبھی روشنی، کبھی تاریکی، کبھی زندگی، کبھی موت، وہی زمین کھسک رہی تھی جس پر میں نے بد وقت قدم جمائے تھے، وہی درخت سر پر آ رہا تھا جس کی چھاؤں میں میں نے سکون کا ایک سانس لینا چاہا تھا۔ میں ایک پُر خیال شخص تھا۔ میری نظریں آنے والے وقت کے گردانا بانانے کی قوت رکھتی تھیں، میں نے واپس چلتے ہوئے راستے میں اپنے گرد آگ کی پٹیں محسوس کیں۔ مجھے فقاہت کے عالم میں سرنگا یاد آیا۔ شام کے قریب میں اپنے مکان پہنچ چکا تھا۔ میں نے سرتیا سے گلاب کا وہ پھول مانگا جو ایک پتے میں اس کے پاس محفوظ کر دیا گیا تھا۔ گلاب کی پتیوں مر جھا چکی تھیں لیکن ان کی خوشبو باقی تھی۔ میں نے انھیں آنکھوں سے لگا لیا اور میری نظروں میں اقبال کا سراپا گھوم گیا۔ یہ اقبال کی ساق سیمیں سے حاصل کیا ہوا گل تھا۔ یہ پھول میری ملکیت تھا۔ اس کے مر جھائے ہوئے پتے دیکھ کر مجھے ہر طرف خزاں سی محسوس ہونے لگی۔ میں بھی مر جھانے لگا۔ اسی وقت مجھے اطلاع دی گئی کہ باہر فرار و میرا منتظر ہے۔ میں باہر آیا تو مکان کے سامنے قبیلے کے بہت سے افراد جمع تھے۔ انھی میں ایک مفروہ مذہب شخص بھی تھا اسے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور اس کے گلے میں متعدد پھل لٹکے ہوئے تھے۔ جلد کی رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ جسم پر جابجا خراشیں تھیں۔ غالباً وہ اس غار سے بھی فرار ہو گیا تھا جہاں اسے پناہ ملی تھی۔

”معزز سردار!“ فرار کی غضب ناک آواز گونجی۔ ”ہم نے اسے ساحلی جنگلوں سے پکڑا ہے، یہ اپنے دوسرے ساتھی کے بارے میں کوئی نشان دہی نہیں کر رہا ہے، کہتا ہے کہ فرار ہوتے وقت ہم جنگل میں پھنچ گئے تھے۔ اس نے ایک غار میں پناہ لی تھی جہاں ایک بوڑھا شخص رہتا ہے، لیکن یہ بند غار سے بھی فرار ہو گیا۔ اب یہ ایک اذیت ناک موت کا مستحق ہے۔“

مفروہ قیدی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کی عمر 40 سے اوپر ہوگی۔ اسے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ قبیلے کے افراد میرے فیصلے کے منتظر تھے۔ فرار نے میری خاموشی محسوس کرتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ”معزز سردار! حکم ہو تو اسے آدم خور چیونٹیوں کے حوالے کر دیا جائے۔“

”رحم رحم۔“ اس نے فریاد و فغاں سے آسمان سر پر اٹھالیا اور اپنے آپ کو چھڑا کر میرے قدموں سے لپٹ لیا۔ اس کے کھر درے چہرے کی کھال میرے پیر پر لگی اور میں نے اسے ایک حقیر کتے کی طرح اپنے پیر چاٹتے دیکھا۔ میں نے اس کے منہ پر ٹھوک مار دی۔ وہ بلبلا تا ہوا ایک طرف لڑھک گیا۔ پھر میری دوسری ٹھوک اتنی شدت سے پڑی کہ اس کے منہ سے خون کا فوارہ پھوٹا۔ اس کا خون دیکھ کر مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر فرار کے ہاتھ سے وہ عصا لے لیا جو جنگلی جانوروں کو تابع بنانے کے لیے مخصوص تھا۔ قیدی کرب ناک انداز میں چیخنے لگا۔ اس کی خوف زدہ آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ میں نے پوری شدت سے عصا کی مٹھ اس کے جسم پر برسائی شروع کر دی۔ اس کی ہر فریاد پر، رحم کی ہر چیخ پر میرا ہاتھ تیز ہو جاتا۔ شاید میری سماعت مفلوج ہو چکی تھی۔ اس کی آہ و بکا میرے کانوں میں نہیں پہنچ رہی تھی۔ شاید میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے اس کے خون آلود جسم کے زخم دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس کی کھال جگہ جگہ سے اکھڑ گئی تھی۔ میری وحشت شباب پر تھی۔ قبیلے کے بہت سے افراد خوف زدہ ہو کر واپس چلے گئے۔ فرار ابھی کچھ نہیں بولا۔ مفروہ قیدی کے جسم نے مزاحمت چھوڑ دی تھی۔ میں اس کی ساری کھال جسم سے علیحدہ کر دیتا مگر

فزارو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ “معزز سردار! دیوتاؤں کی نوازشیں تم پر سایہ فگن رہیں۔ بس کرو۔ اب اس کا جسم سزا پا چکا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ اب اسے سمندر کی گرم ریت پر پھٹکوا دو تا کہ توری پر اڑنے والے پرندے اس کے گوشت سے لذت یاب ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے نفرت سے اس کے ادھر دے ہوئے جسم کی طرف دیکھا جو خون میں رنگ گیا تھا اور جس کی روح نکل چکی تھی، اور اگر اس کی روح اب تک اس کے ساتھ تھی تو وہ اس شکستہ جسم کا کب تک ساتھ دے سکتی تھی؟ جب جنگلی پرندے اس پر یلغار کریں گے تو اس کی روح کو اپنا یہ قالب خالی کرنا پڑے گا۔

قبیلے کے چند لوگ جب اس کا بکھرا ہوا جسم اٹھانے لگے تو میں فزارو کو واپس کر کے اپنے مکان میں چلا آیا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے مسامات سے شعلے پھوٹ رہے ہوں۔ سر تیانے مجھے دیکھا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆=====☆=====☆

سرتیارات کا کھانا لے کر میرے پاس آئی تو خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے گوشت کے چند پارچے حلق میں اتار لیے اور مکان سے باہر آ گیا۔ باہر رات بیدار ہو رہی تھی اور گلیوں کے دونوں طرف مشعلیں ایستادہ تھیں۔ جھونپڑیوں کے باہر بنے ہوئے چبوتروں پر لوگ رات منارہے تھے۔ ڈاکٹر جواد بھی ان میں موجود تھا۔ اس کی جھونپڑی کے باہر بڑے سلیقے سے شراب کے برتن رکھے ہوئے تھے اور ایک طرف گوشت سینکا جا رہا تھا اور دوسری طرف سے عورتوں کے تھقبے سنائی دے رہے تھے۔

”آج رات ہمیں میزبانی کا شرف بخشو، معزز جابر!“ ڈاکٹر جواد نے دور سے ہانک لگائی۔
 ”شکریہ جواد!“ میں نے نرمی سے جواب دیا۔ ”ان سرمستیوں میں خود کو فراموش مت کر دینا اور دوبارہ کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا۔“
 ”معزز جابر! دنیا میں اس سے زیادہ اچھی زندگی کون سی ہوگی؟ میں اب تک پاک و صاف شخص ہوں اور مجھے تم سے محبت ہے۔“
 میری طبیعت ڈاکٹر جواد کی دلچسپ باتوں سے لطف لینے پر مائل نہیں تھی۔ چلتے چلتے جب میں مہذب لڑکیوں کے زندان تک پہنچا تو میری رگیں تن گئیں۔ آج صبح شراڈ نے اپنی امریکی مگتیر جینا کا ذکر کیا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا، توری کی عورتیں احترام سے ایک جانب کھڑی ہو گئیں۔ مہذب عورتوں نے بھی ان کے سردار کو تعظیم دینے کے لئے ان کی تقلید کی۔ کل صبح انہوں نے جارا کا کا کی عبادت کا ہولناک منظر دیکھا تھا۔ اس لیے آج ان کے انداز سے خوف نمایاں تھا۔ جرمن عورت مارشانے ایرانی لڑکی فروزین کو ٹھوکا مار کر کہا۔ ”اسے کسی دن بالا راہ ہمارے پاس آنا تھا۔ مزاحمت بے کار ہے خاموشی سے اس کی آغوش میں جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

”میں اس درندے کو ضرور مزہ چکھاؤں گی، میں اپنے تیز دانتوں سے اس کی بوٹی بوٹی نوج لوں گی چاہے بعد میں کچھ بھی ہو۔ اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔“ امریکی لڑکی نے سرگوشی میں کہا۔

”آج اس سے رحم کی توقع فضول ہے۔“ جولیہ نے کہا۔
 ”لڑکیو! میرا کہا مانو۔ خود کو خندہ پیشانی سے اس کے سپرد کر دو۔“ تیس سالہ عورت مارشانے کہا۔

میں ان کے خوف اور اندیشے سن رہا تھا، امریکی لڑکی خوف زدہ ہونے کے باوجود تیز لہجے میں بات کر رہی تھی، میں نے اسے توجہ سے دیکھا، اس کے نقش و نگار بے حد پُرکشش اور متکھ تھے، وہ ایک تیز و طرار اور چست و چالاک لڑکی تھی۔ لانا بقدر، رخساروں پر سرخی، ہونٹوں کے ساتھ بال بھی تراشیدہ، ستواں ناک، اس کی آنکھیں ہرن کی آنکھوں جیسی تھیں اور وہ ہرن کی طرح چوڑی بھرتی تھی کیونکہ اس کا بدن ہلکا تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ بین الاقوامی مقابلہ حسن میں منتخب ہونے والی تین لڑکیوں میں سے ایک ہے۔ میں یہاں اس کے قریب کھڑی ہوئی ایرانی لڑکی کے حسن کا ذکر نہیں کروں گا کیونکہ میری نظریں صرف امریکی لڑکی کے بدن کا احاطہ کر رہی تھیں۔
”وہ صرف مجھے دیکھ رہا ہے۔“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

”میری پیاری دوست: ہمت سے کام لو۔ اس کا دل جیتنے کی کوشش کرو۔“
میں نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”ادھر آؤ۔“
میرے بلا نے پر اس کی ساری تیزی و طراری رخصت ہو گئی، مارشانے اسے آگے بڑھنے پر اکسایا، وہ سبھی سبھی اپنی جگہ سے ہلی اور میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اتنے قریب کہ میں اس کی سانس تک سن سکتا تھا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ میں نے اشارہ کیا۔
”نہیں نہیں مجھ پر رحم کرو۔“ وہ ہڈیانی انداز میں چیخی۔
”چلو۔“ میں نے گرج کر کہا۔ وہ ہم گئی۔

”چلی جاؤ جینا۔ بدنصیب جاؤ۔ ہم تمہاری سلامتی کے ساتھ واپسی کے لیے دعا کریں گے۔“ مارشانے عاجزی سے کہا۔
جینا نے گردن ڈال دی۔ جھونپڑی سے باہر آ کر میں آگے آگے چلنے لگا میرے پیچھے جینا اور اس کے پیچھے ایک نیزہ بردار محافظ تھا، میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں بستی کے آخری کنارے کی ایک جھونپڑی کے پاس جا کے بیٹھ گیا اس حصے کے تمام لوگ میرے احترام کے لیے گلی میں آ گئے۔ میں ایک جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے پیچھے جینا بھی اندر آ گئی۔ نرم پتوں کے ڈھیر لحوں میں فرش پر بکھیر دیئے گئے اور مشعلیں زمین میں گاڑ دی گئیں اور مشروبات کے مٹکے سجادیئے گئے اور گوشت پھلوں کے تھال جھونپڑی میں ایک کونے میں رکھ دیئے گئے۔ میں نے شپالی چھوڑ کر اپنے تمام نوادر گلے سے اتار دیئے اور چوٹی اٹھو ہاتھ کر کے ان کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا۔ اٹھو ہاتھ جھونپڑی میں دیکھ کر مہذب امریکی دوشیزہ جینا کی چیخ نکل گئی تھوڑی دیر بعد میرے حکم پر جھونپڑی خادماؤں سے خالی ہو گئی۔ میں نرم پتوں پر دراز ہو گیا ان نرم پتوں کے مقابلے میں گداز سے گداز قالین بچ تھے۔ جینا کھڑی رہی اور لرزتی رہی۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ میں نے مقامی زبان ہی میں کہا۔

وہ کھڑی رہی مجھے خیال آیا کہ اس سے مقامی زبان میں گفتگو نہیں ہو سکے گی چنانچہ میں نے انگریزی میں کہا۔ ”سنو لڑکی!“ میں نے ابھی کہنا شروع کیا تھا کہ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ”تم نے سردار کا درجہ اور فضیلت دیکھ لی ہے۔ اپنا ذہن صاف کر لو۔ یہاں ایک ایسی سوسائٹی قائم ہے جہاں عورتیں، سردار اور چند برگزیدہ لوگوں کے سوا کسی کی ملکیت نہیں ہوتیں۔ اپنے ماضی کے تمام سلسلے محو کر دو اور وہ ڈور کاٹ دو جو تمہارا رابطہ سمندر پار سے قائم کیے ہوئے ہے، تم نہ امریکی ہو، نہ برطانوی، نہ ایشیائی ہو، نہ یورپی۔ تم صرف ایک دوشیزہ ہو جس کا کام توری کے باشندوں اور اس کے سردار

کو خوش کرنا ہے، اسی میں تمہاری خوشی مضمر ہے، مہذب دنیا کی اقدار مصنوعی ہیں، وہ انسانوں پر ساج کا ایک غیر فطری جبر ہے۔ آؤ! میرے قریب آ جاؤ اور سرداری رفاقت سے عزت و مرتبہ حاصل کرو۔“

اسے جیسے سکتہ ہو گیا تھا، وہ حیرانی سے میری فصیح و بلیغ انگریزی سنتی رہی۔ ”میرے خدا!“ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”تم کون ہو؟“

”میں نے تمہیں جو حکم دیا ہے، اس پر عمل کرو۔“

وہ تیزی کے ساتھ پلٹ کر منگے سے مشروب انڈیل لائی اور جب میرے قریب آئی تو میں نے اس کا ہاتھ کھینچ لیا۔ مجھے انگریزی میں مخاطب دیکھ کر اسے کچھ ڈھارس سی ہو گئی تھی۔ اب وہ بہتر انداز میں مجھ سے رحم کی بھیک مانگ سکتی تھی، گڑ گڑا سکتی تھی۔

”رحم۔ کس بات پر رحم؟ میں تمہیں زندہ تو نہیں جلا رہا ہوں۔“

”میں اپنی عصمت کی بھیک مانگتی ہوں۔“ وہ عاجزی سے بولی۔

”عصمت؟ امریکی لڑکی کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ یہاں عصمت کا کوئی تصور نہیں ہے، تم تاریک براعظم میں ہو۔“

”میں اس نوجوان سے منسوب ہوں جسے زندگی بخش دی گئی ہے۔ وہ میرا منگیترا ہے۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”اس کے اعصاب پر ایک اور عورت سوار ہے۔“

”تم جھوٹ کہتے ہو۔“ وہ تیزی سے بولی پھر ایک دم نرم پڑ گئی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ ہم نے لاعلمی میں تمہارے خلاف نہ جانے کیا کیا

گستاخیاں کی ہیں۔ میں معذرت خواہ ہوں۔“

”میں ایک درندہ ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”مجھے افسوس ہے۔“

”اور تم ایک خوبصورت ہر نی ہو۔ تم میرا شکار ہو۔“ میں نے اس کے ہاتھوں کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

میرے اس اقدام سے وہ برہم ہو گئی اور مچلنے لگی۔ ”میں اس کی منگیترا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔“

”منگیترا۔ اے آہو چشم۔ آہو بدن۔ یہاں کوئی کسی سے وابستہ نہیں ہے۔ مجھے دیکھ۔ کیا میں اپنے چہرے کا رنگ چھڑاؤں اور اپنی جلد کی

اصل رنگت دکھاؤں کہ میں کون ہوں اور کیا ہو گیا ہوں؟ نرمی سے بات کرو اور گداز پیدا کرو۔ میں ایک سردار ہوں اور اس درجے پر کسی برتری ہی کے

سبب پہنچا ہوں۔ میں تم سے آخری بار کہتا ہوں کہ سردار جابر بن یوسف الباقرا کا احترام کرنے کی عادت ڈالو اور شگفتگی سے گفتگو کرو۔“

امریکی لڑکی خاصی ذہین نکلی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش ترک کر دی۔ شاید اسے میرے عزم کا یقین ہو گیا تھا۔ اس نے مشروب

میرے ہاتھ سے چھین کر غناٹ پل لیا۔ اور بولی۔ ”تم نے میری زبان میں گفتگو کر کے مجھے کچھ جرات کرنے کی ترغیب دی ہے۔ میں تمہارے شکنجے

میں ہوں اور تم سے کسی رعایت کی توقع بے کار ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہمارے ساتھ اتنا سلوک بھی کیوں کیا گیا؟ یقیناً وہ تمہاری وجہ

سے ہوا ہوگا ورنہ یہ درندے پہلے ہی دن ہماری بونیاں نوچ لیتے۔“

”میں نے تمہارے ساتھ کوئی سلوک نہیں کیا۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”یہ تمہارا خیال ہے۔ بہر حال اب تم نے خود ہی سپر ڈال دی ہے تو میں تمہیں کچھ دل نشین باتیں کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔ آؤ میری آغوش میں آ جاؤ۔ اب شراڈ سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ طاقت سب سے بڑا رشتہ ہے لیکن اگر تم مجھے ایک پسندیدہ آدمی کی نظر سے دیکھنا چاہو تو تمہیں نقصان کا کوئی احساس نہیں ہوگا۔ میں نے شہزادوں کی سی زندگی بسر کی ہے۔ میں بیروت جیسے بڑے شہر کے کلبوں کا ایک مقبول شخص تھا۔ میں نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی ہے۔ میں شخصیت، علم اور وجاہت میں سب سے یکتا تھا۔ ایک برطانوی لڑکی فلورا میری محبوبہ تھی۔ جب میں بالکل تمہاری طرح یہاں آیا تھا تو اسے توری کے ایک سردار نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ اور اس نے مجھے ٹھکرایا تھا کیونکہ میں ایک کمزور شخص تھا، رفتہ رفتہ میں نے طاقت حاصل کی اور میں نے توری کے دونوں قبیلوں کی سرداری حاصل کر لی۔ فلورا آج کل جزیرہ بیزنار کے سردار کے پاس ہے۔ ہم پانچ آدمی زندہ رہ گئے تھے اور وہ بھی اس وجہ سے کہ ہم نے کسی اکراہ کے بغیر یہاں کی زندگی جوں کی توں قبول کر لی تھی۔ یہاں آنے کے راستے بہت سے ہیں، جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ سمجھیں نازک دوشیزہ؟“ میں یہ باتیں اس سے کہنا چاہتا تھا حالانکہ مجھے ان کے کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ میں شراڈ کے مقابلے میں اسے محبت سے جیتنا چاہتا تھا۔ میری اداس گفتگو نے اس پر گہرا اثر کیا۔ وہ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتی رہی اور میں ایسے جوابات دیتا رہا جو جزیرہ توری میں رہ کر دیئے جاسکتے تھے۔

”تم خوب زندہ رہے۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”تم میری قدرت میں ہو۔“ میں نے کہا۔ ”شراڈ کو بھول جاؤ۔“

”تمہاری روداد نے مجھے متاثر کیا ہے۔“ وہ غنودہ لہجے میں بولی۔ ”شراڈ تو اب ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔“

”اس نے اپنے لیے توری کی ایک دوشیزہ پسند کر لی ہے۔ میں اس سے صبح ملا تھا۔“

”کیسا ہے وہ؟“

”وہ تم سے زیادہ ذہین ہے۔ اس نے بہت جلد ماحول سے مفاہمت کر لی۔“

”کیا وہ میرا ذکر کر رہا تھا؟“

”ہاں۔ اس نے تمہیں مانگا تھا۔“

”اچھا۔ پھر تم نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے ڈانٹ دیا۔“

”کیوں؟ تم مجھے اس کے حوالے کر سکتے تھے۔ یہ کوئی غلط بات نہ ہوتی۔ تمہیں اس کا اختیار تھا۔“ وہ میری آغوش سے نکل گئی۔ پھر اس نے اپنا چہرہ میرے سامنے کر لیا۔

”میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا مجھے معلوم تھا کہ میرے نائین زارے اور فرزارو میں سے کوئی بھی تمہیں اس سے کسی وقت بھی مانگ سکتا ہے۔“

اسے ہر حال میں تمہیں عاریتاً مستقل طور پر دینا پڑتا۔ میں سوچا کہ میں خود ہی تمہارے شباب سے حظ کیوں نہ اٹھاؤں اور بہتر ہے کہ تم تقسیم ہونے

کے بجائے صرف ایک مرد کے تعارف میں رہو کیونکہ تمہیں حاصل کرنے کے لئے کسی کو مجھ سے مقابلہ نہیں کرنا پڑے گا۔ دور و نزدیک ایسا کوئی فرد نہیں ہے جو جابر بن یوسف کا ہم سر ہو سکے۔“ میں نے جواز تلاش کر لیا تھا جو بڑا کارگر ثابت ہوا، وہ موم کی طرح نرم ہو گئی۔

”کیا یہ ضروری ہے کہ ہم آج ہی ایک دوسرے سے ذہنی و جسمانی طور پر وابستہ ہو جائیں؟“ اس نے خلاف توقع سوال کیا۔
”نہیں۔ تم اس کے بعد بھی اپنا ذہن آمادہ کر سکتی ہو۔“

وہ جھونپڑی کے فرش پر لوٹی رہی۔ مجھے اس کا یہ انداز اچھا لگا، اگر وہ میرے حکم پر فوراً مجھ میں تحلیل ہو جاتی تو مجھے آسودگی کا شکوہ رہتا۔ وہ مچل رہی تھی اور میں اسے اپنے شکبے میں جکڑ رہا تھا۔ میں نے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ وہ نفرت و اذیت سے چیخیں مارے، رحم کی درخواست کرے لیکن وہ نفرت و اذیت کو بھول گئی۔ شاید اس سبب سے کہ اسے جابر بن یوسف جیسے شیع شخص کا قرب نصیب ہوا تھا۔

وہ ابھی سوئی ہوئی تھی کہ میں اپنے نوادر گلے میں ڈال کر چلا آیا۔ وہ گہری نیند میں تھی اس لیے اسے خبر نہ ہو سکتی۔ میرا خیال ہے۔ بہت دنوں بعد اسے ایک مطمئن نیند ملی۔ اس مبارک وقت کی نیند جب فیصلے ہو جائیں اور ذہن کشمکش سے نجات حاصل کر لے۔ یوں تو جزیرہ توری میں عورتوں کا حصول اور نشاط و صل کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ قصر اقبال کی منتخب لڑکیاں، اشار اور نرماز میری شدتوں کے سپرد کر دی گئی تھیں اور انگریز و مابین نیشا، کیشا سے رابطہ رہ چکا تھا مگر جینا کی بات ہی اور تھی۔ مجھے فتح کا احساس ہوا، ہاں جینا کے گلزار بدن میں ذہن و دل کی فرحت کے تمام سامان موجود تھے۔

اسے آداب آتے تھے۔ مجھے رات بھر فلور یا د آتی رہی۔ بے وفا فلور! علی الصباح میں اپنے مکان میں پہنچ گیا اور احساس ہوا کہ خلش ابھی ختم کہاں ہوئی ہے؟ کوئی چیز ابھی تک چھ رہی ہے۔ میں نے فزار کو طلب کر کے حکم دیا کہ وہ شرڈ کو شکار کی ٹولی کے ساتھ جنگل میں لے جایا کرے۔ فزار دوسرے جھکا کے جانے لگا۔ مجھے اچانک ایک خیال آیا، میں نے اسے روکا اور اپنا پہلا حکم منسوخ کر کے کہا۔ ”نہیں، جنگل میں نہ جانے دینا۔ زار سے کہا جائے کہ وہ اسے توری کی حسین لڑکیاں فراہم کرنے میں بخل سے کام نہ لے اور ہر وقت اس کی خدمت میں شراب پیش کی جائے اور توری کی نفیس غذا اسے فراہم کی جائیں۔ خدمت گار اس کی جھونپڑی پر متعین کیے جائیں اور اس سے کوئی کام نہ لیا جائے۔“ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے جھنجھلا کے فزار سے کہا۔ ”کچھ نہیں۔ شرڈ کی نقل و حرکت پر نگرانی رکھی جائے اور اسے شراب کشید کرنے کے کام پر لگا دیا جائے۔“

کئی دن یوں ہی گزر گئے۔ میں سمورال کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن تین روز زار سے کے قبیلے میں جاتا رہا اور شرڈ کو غلیظ ترین تالاب پر کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ سخت جان اس کام سے بہت خوش تھا۔ اس نے کئی بار مجھ سے بات کرنی چاہی۔ میں نے رسمی طور پر اس سے کلام کیا اور اسے ساحل سمندر پر مچھلیاں پکڑنے والے گروہ میں شامل کر دیا۔ پھر میرا رخ سمندر کی طرف ہو گیا اور میں نے دیکھا، اس نے جلد ہی مچھلیوں میں مقبولیت حاصل کر لی ہے اور ایک طرح سے ان کا سربراہ بن گیا ہے۔ میں نے توری میں بننے والی مزید گلیوں اور جھونپڑیوں کی تعمیر کے کام پر اسے لگا دیا، وہ خندہ پیشانی سے پتھر ڈھونڈتا اور تعمیر کرتا رہا۔ اس نے تعمیر آسان کر دی اور مختلف قسم کی گاڑی بنا کر توری کے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا اور آخر میں، مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ میں نے زار سے کو حکم دیا کہ اس سے کوئی کام نہ لیا جائے، عورتیں اور مشروبات اس کی خدمت میں پیش کیے جائیں۔ وہ دن بھر سرمست رہنے لگا اور اتنے دنوں کی ٹکان کے بعد اس نے خوب پی۔ اسے توری کی اعلیٰ درجے کی لڑکیاں پیش کی جانے

لگیں، اس کی جھونپڑی پر عورتوں کا جھوم رہے لگا۔ اس نے باہر ٹھکانا کم کر دیا اور اپنی جھونپڑی میں ہی عیش و نشاط میں گم رہنے لگا۔ میں اس کی طرف سے کسی قدر مطمئن ہو گیا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ اور زیادہ صحت مند ہو گیا ہے اور اس کے گالوں پر سرخی دوڑنے لگی ہے کبھی کبھی میرا اور اس کا سامنا ہو جاتا تو وہ جینا کے بارے میں پوچھتا اور میری فیاضیوں کے سلسلے میں ممنونیت کا اظہار کرتا، وہ ہر بار کوئی خدمت تفویض کرنے کے لیے اصرار کرتا اور میں کہتا، ”ابھی تمہاری عمر خوشہ چینی کی ہے، جھوم جانے کی ہے، تھرکنے کی ہے، سرشار ہونے کی ہے۔ کام کا وقت آئے گا تو میں کام بھی سونپا جائے گا۔“

شراڈ کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی مگر کوئی ایسی بات دیکھنے میں نہیں آئی جو مجھے تشویش میں مبتلا رکھتی۔ میں اب سکون سے سمورال کے پاس جا سکتا تھا، اس عرصے میں اقبال کی طرف سے کوئی سلسلہ جنہاں نہ ہوا۔ نماز بھی واپس نہیں آئی۔ میں مہذب دنیا کی لڑکیوں کے پاس دوبارہ نہیں گیا۔ تیس روز گزر گئے تھے اور ایک پل ایک صدی معلوم ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے بے قرار ذہن کو قرار آنے لگا اور میں نے اپنے وہموں اور وسوسوں سے بڑی حد تک چھٹکارا حاصل کر لیا۔ میں نے خود کو باور کرایا، یہ تو طلب صادق کی بات ہے۔ وہ اگر کسی اور جانب مائل ہے تو یہ محض وہم ہے۔ انگریزوں کے فاضل اسے حاصل نہیں کر سکتے، تاریک براعظم میں سمورال کے بقول کون کون کہاں کہاں اس کی قربت کا دعوے دار ہے۔ اس کا حصول سب سے مشکل کام ہے، اسے مجھ سے ربط خاص ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے ساتھ خصوصی نوازشیں کیوں جاری رہتیں۔ میرے عزائم کہاں گئے؟ ابھی تو میں ایک بہت کوتاہ قد شخص ہوں۔ میں نے توجہ کی لگام ہر طرف سے کھینچ کر سمورال کی قیام گاہ کی طرف موڑ دی۔

☆=====☆

(اقبالا کی داستان ابھی جاری ہے، اس دلچسپ اور پراسرار کہانی کا حصہ سوئم آئندہ ہفتے پیش کیا جائے گا)

مقید خاک

ساحر جمیل سید کا ایک اور شاہکار ناول..... مقید خاک..... سرزمین فراغت کی آغوش سے جنم لینے والی ایک تحیر خیز داستان۔

ڈاکٹر شکیل ظفر:- ایک ہارٹ اسپیشلسٹ، جو مردہ صدیوں کی دھڑکنیں ٹٹولنے نکلتا تھا..... یوسف بے:- وہ ساڑھے چار ہزار سال سے مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار ہوا تھا..... بیوسا:- ایک حرماں نصیب ماں، جسکی بیٹی کو زندہ ہی حنوط کر دیا گیا..... مریاس:- اسکی روح صدیوں سے اس کے جسدِ خاک میں مقید تھی..... شیلندر رائے ہریجن:- ایک پرائیویٹ ڈسٹریکٹر، اسے صدیوں پرانی ممی کی تلاش تھی..... مہرجی:- پرکالہ آفت، انسانی قالب میں ڈھلی ایک آسمانی بجلی..... ایکشن، سسپنس اور تھرلر کا ایک نہ رکنے والا طوفان.....

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آرہا ہے، جسے ایکشن ایڈوینچر مہم جوئی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔